قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

فروری 2016، قیمت -/15₹

ماہنامہ اُردو دُنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

کونسل کے ادبی کیلنڈر کا اجرا

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ

مرتب: پروفیسر عبدالستار دلوی
صفحات: 474
قیمت: 216 روپے

تاریخ شاہجہاں

مصنف: بنارسی پرشاد سکسینہ
صفحات: 466
قیمت: 197 روپے

نورتن کی کہانیاں

انتخاب: شمیم احمد
صفحات: 155
قیمت: -/37 روپے

تذکرۂ شورش

مصنف: غلام حسین شورش
مرتب: ڈاکٹر محمود الٰہی
مترجم: محمد عاصم اعظمی
صفحات: 450، قیمت: 198 روپے

اردو کی کہانی

مصنف: سید احتشام حسین
صفحات: 104
قیمت: 125 روپے

عصری عالمی ادب کے ستون: احوال و افکار

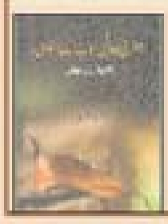

مصنف: زبیر رضوی
صفحات: 216
قیمت: 111 روپے

مشاہدات و تاثرات

مصنف: ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ
ترتیب و تہذیب: اطہر صدیقی
صفحات: 412
قیمت: 185 روپے

تاریخ علم الادویہ

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی
صفحات: 498
قیمت: 220 روپے

تعلیمی نفسیات

مصنف: ڈاکٹر طلعت عزیز
صفحات: 242
قیمت: -/100 روپے

مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال

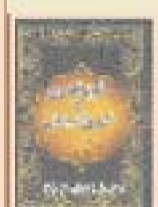

مصنف: آر پی ترپاٹھی
مترجم: ریاض احمد خاں شروانی
صفحات: 543
قیمت: 242 روپے

ہمارا طرزِ زندگی اور بیماریاں

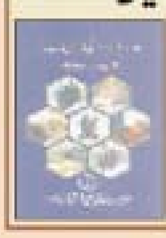

مصنف: ڈاکٹر جاوید احمد سعیدی کاسٹوی
صفحات: 69
قیمت: -/42 روپے

معالجات (جلد اول، دوم، سوم چہارم)

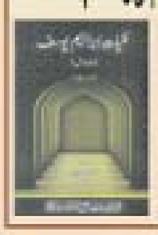

مصنف: وسیم احمد اعظمی
صفحات: 2273 (مکمل سیٹ)
قیمت: 613 روپے (مکمل سیٹ)

انیس کے سلام

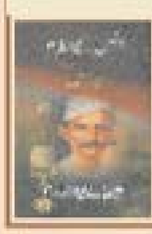

مرتب: علی جواد زیدی
صفحات: 307
قیمت: 113 روپے

ہند کی مایۂ ناز ہستیاں و دیگر مضامین

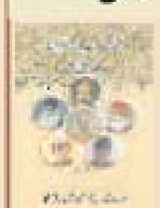

مصنف: بی شیخ علی
صفحات: 176
قیمت: -/35 روپے

شرارِ جستجو

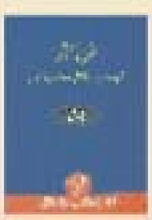

مصنف: قیصر ضحٰی عالم
صفحات: 125
قیمت: -/80 روپے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر
مرتب: ڈاکٹر وہاب اشرفی
صفحات: 740
قیمت: 305 روپے

فضائی آلودگی

مصنف: ڈاکٹر رفیع الدین ناصر
صفحات: 179
قیمت: -/108 روپے

پیسے کی کہانی

مصنف: غلام حیدر
صفحات: 80
قیمت: -/22 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:18، شمارہ:02، فروری 2016

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرم

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- زرتعاون NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in, ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:22-7-110، چھتہ بازار، نزد سالار جنگ میوزیم
بلاک نمبر 1-5، حیدرآباد-500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

بچوں کے لیے لکھنا
بہت مشکل ہے: بانو سرتاج — شگفتہ کمال 8

جائزہ

2015 کے فکشن کا منظرنامہ — اسلم جمشید پوری 12

علاقائی منظرنامہ

مشرقی پنجاب کے اردو افسانے پر
تقسیم کے اثرات — معین الدین عثمانی 18
پنجاب اور اردو افسانہ: تقسیم سے پہلے — ندیم احمد ندیم 22
مالیر کوٹلہ کا افسانوی سفر — سالک جمیل براڑ 25

سلسلۂ صحافت

گوپال متل اور ماہنامہ 'تحریک' — افسر کاظمی 28
دہلی کی اردو صحافت کا نقش اول: اکمل الاخبار — رئیس فاطمہ 31

ادبی مباحث

اردو طنزیہ و مزاحیہ شاعری پر طائرانہ نظر — فضل حسین 33
عوض سعید: خاکے کے
پیکر میں فکشن کی جمالیات — اکرم پرویز 36

وہاب دانش کی غزلوں میں
'لب' کے استعاراتی پہلو — محمد ظفر ندوی 39
اردو قصائد پر فارسی قصائد کے اثرات — غلام اختر 42
عصمت کا منتخب افسانہ 'لحاف' — جاوید احمد مغل 44
اردو غزل اور ماحولیاتی سائنس — انجینئر محمد عادل 46
برج بانو کا عاشق کنہیا لال کپور — شمر جہاں 50

تہذیب و ثقافت

سہسوان رام پور گھرانہ
اور استاد مشتاق حسین خان — حضور سہسوانی 53
سنت کبیر اور دادو دیال — علی عباس 57

صحت

موسمی اثرات اور طب یونانی — طیبہ عائشہ فاطمہ 61

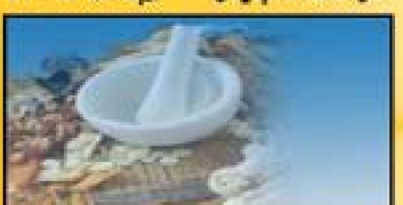

کوئز

ادبی کوئز — طلعت جمال 65

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف 67

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ — ادارہ 79

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 80

ہماری بات

فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کا ایک مشہور شعر ہے:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

جس دور میں داغ نے یہ شعر کہا ہے اردو کا دائرہ شاید صرف ہندوستان تک ہی محدود رہا ہوگا مگر اب اردو نے عالمی سطح پر اپنی موجودگی درج کرالی ہے۔ اس لیے داغ کے مصرعہ ثانی کی صورت کچھ یوں ہوگی:

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اور یہ سچ ہے کہ اردو زبان اپنی لطافت، شیرینی اور اپنی تہذیبی قوت کی وجہ سے پوری دنیا کی زبان بن گئی ہے۔ امریکہ، برطانیہ، مصر، سعودی عرب، خلیجی ممالک، روس، ماریشس، ترکی، جرمنی، جاپان اور ایران جیسے ممالک میں پھل پھول رہی ہے۔ ان میں سے بیشتر ملکوں میں جہاں اردو کی تعلیم کا معقول نظم ہے وہیں بہت سی ایسی تنظیمیں قائم ہو چکی ہیں جو اردو کے فروغ کے لیے عملی سطح پر کوشاں ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے غیر ملکی طلبا اور اسکالرز بھی اردو زبان سیکھنے کے لیے ہندوستان اور دیگر ملکوں کا رخ کرتے ہیں اور اس زبان کے ثقافتی ورثے سے متاثر ہوتے ہیں۔

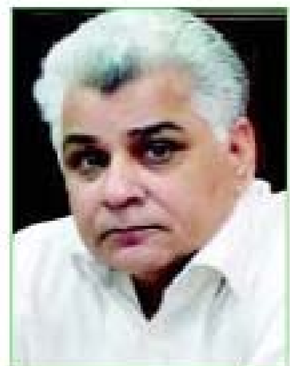

ہندوستان جیسے کثیر لسانی اور تہذیبی معاشرے میں بھی مختلف ترسیلی ذرائع سے اردو زبان کا فروغ ہو رہا ہے۔ اس میں پرنٹ، الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ فلموں کے رول سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مختلف ادارے، تنظیمیں اور اکادمیاں بھی فروغ اردو کے مشن سے جڑی ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں ریاستی سطح کی اردو اکادمیاں قائم ہیں جنھیں حکومت تعاون بھی دیتی ہے۔ یہ تمام ادارے اپنی اپنی سطح پر اردو زبان کے فروغ کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں اردو کا سب سے بڑا ادارہ قومی اردو کونسل ہے اور اس ادارے نے مختصر عرصے میں فروغ اردو کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ اب تاریخ کا ایک روشن باب بن چکی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہا جانا چاہیے کہ اردو زبان کے سامنے ابھی بہت سے چیلنجز ہیں۔ اس کے مقابلے کے لیے ہمیں ایک مربوط میکانزم تیار کرنا ہوگا اور ہمیں زبان کے تدریسی، تعلیمی اسٹرکچر اور نظام کو بھی بہتر بنانا ہوگا۔ یورپی ممالک جس طرح زبانوں کے سیکھنے اور سکھانے پر زور دے رہے ہیں اس طریقہ کار سے بھی فائدہ اٹھا کر ہم اردو زبان کو فروغ دے سکتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں بہت سی سطحوں پر اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ زبان کے فروغ کے لیے ہمیں غیر ضروری لسانی تنازعات سے بھی احتراز کرنا ہوگا اور سب سے بڑا مسئلہ شرح خواندگی کو بڑھانے کا ہے خاص طور پر ان علاقوں میں جو اردو سے مانوس ہیں۔ شرح خواندگی بڑھائے بغیر زبان کی ترقی اور فروغ ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں اپنی زبان کے فروغ کے لیے جدید تکنیک کا سہارا لینا ہوگا۔ ڈیجیٹل دنیا میں زبان کے فروغ اور اپنی ثقافتی وراثت کے تحفظ کے لیے نئی ٹکنالوجی کا استعمال بہت ضروری ہے۔ اس تعلق سے ہمیں تکنیکی، صنعتی، تجارتی اور سائنسی علوم و فنون پر مشتمل کتابیں اردو میں شائع کرنی ہوں گی اور کتابوں کی دستیابی اور اس کی قیمتوں کو کم کرنے پر بھی دھیان مرکوز کرنا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی ہمیں احساس کمتری کے خول سے باہر آنا ہوگا اور جذبہ اور احساس کے ساتھ اردو کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کرنے پڑیں گے۔

قومی اردو کونسل 5 تا 7 فروری 2016 کو فروغ اردو کی امکانی صورتوں کو تلاش کرنے کے لیے ہی ایک عالمی سطح کی اردو کانفرنس کا انعقاد کررہی ہے۔ اس کانفرنس میں اردو زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے اردو کے دانشوران اور عالمی مندوبین اپنے مشورے اور تجاویز پیش کریں گے۔ کونسل ان مشوروں کو عملی صورت عطا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی اور یقین ہے کہ اس سیمینار سے فروغ اردو کے ایک نئے باب کا آغاز ہوگا۔

اس موقعے پر ایک مسرت میں آپ لوگوں کو شریک کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قومی اردو کونسل نے ایک ایسا ادبی کیلنڈر تیار کیا ہے جسے محترمہ اسمرتی ایرانی مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند نے قومی اردو کونسل کا قابل ستائش کارنامہ قرار دیا ہے۔ اس کیلنڈر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اردو ادب کے بیشتر مشاہیر کی تاریخ پیدائش و وفات کے ساتھ ان کی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ آئندہ قومی اردو کونسل ایک باتصویر سوانحی البم بھی تیار کرنا چاہتی ہے جس میں اردو کے قلم کاروں کے سوانحی کوائف کے ساتھ تصنیفات کی تفصیلات بھی درج کی جائیں گی۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

جنوری کا شمارہ اردو دنیا خوب صورت سرورق اور معیاری مضامین کے ساتھ حسبِ معمول منظرِ عام پر تشریف پذیر ہوا ہے۔ اس میں نظموں کے موضوعات پر مضمون لکھنے والے انیس امروہوی صاحب کا کمال امروہوی پر مقالہ قابلِ تعریف ہے۔ اس میں دیگر جامعات کار و ایکٹر سہراب مودی کی ملتی جلتی فلم 'پکار' میں باادب باملاحظہ ہوشیار' کی جس آواز (صفحہ 61) کی بات کی گئی ہے، یہ پکار دراصل مغلیہ دربار کے باہر کوئی بھی پاسبان یا چوکیدار مستعد ہوجانے کی خاطر کبھی بھی نہیں لگاتا تھا۔ صرف اسی فلم میں اول بار جناب کمال صاحب کے ذہنی اختراع کا خاص تھا۔ اسی کی تقلید بعد میں مغلیہ تناظر میں بننے والی متعدد ہندی فلموں میں کی گئی ہے۔ کمال صاحب کی چہیتی بیٹی کا نام رخسار کمال ہو رخسار زہرا صفحہ 62 پر دو طرح سے دنیا الجھن میں ڈالتا ہے۔

رام لعل کے افسانوی ادب میں حقیقت نگاری کا مناسب تجزیہ ڈاکٹر محمد ثاقب انور نے بخوبی رقم کیا ہے۔

اسی طرح محمد فرحان سنبھلی نے ایک نایاب موضوع کا انتخاب کرتے ہوئے رونگٹے کھڑے کے تحت مسلم معاشرے میں لوک گیتوں کی روایت کی شاندار عکاسی کی ہے۔ لوک گیتوں کی بابت کمال امروہوی کے دورِ طفلی میں انھی بابت جو سہراب مودی سے کہا گیا یہ فقرہ لوک گیتوں کے ضمن میں بھی مناسب ہو سکتا ہے کہ "میں دیکھنے کی نہیں، سننے کی چیز ہوں۔" (ص 61-60)

محمد شمس الحق ملک: [illegible] E-18 [illegible]

اردو دنیا جنوری 2016 کا رسالہ موصول ہوا۔ یہ رسالہ اردو دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ اس کے تمام مضامین معیاری اور کارآمد ہوتے ہیں۔ موضوع پر موضوع اہل شخصیات پر نمبر شائع کر کے تشنگانِ علوم کی پیاس بھی بجھاتا ہے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر ریاض احمد کا مضمون 'آموزش بذریعہ امداد باہمی اردو تدریس کے حوالے سے' نہایت معلوماتی رہا۔ آج پورے ہندوستان میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے سیمینار، ورکشاپ، سمپوزیم کا انعقاد کیا

جا رہا ہے تاکہ اردو زبان کو وہ حق دلایا جا سکے جس سے وہ آزادی کے بعد سے محروم ہے۔ موصوف کے مضمون کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ اگر تربیت یافتہ اساتذہ اس طریقے سے اردو زبان کی تدریس کے فرائض کو انجام دیں خاص کر ثانوی سطح اور اعلیٰ ثانوی سطح پر تو طلبا میں خود بہ خود دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔

غلام سرور: [illegible]

'اردو دنیا' کا نئے سال کا پہلا شمارہ بھی حسبِ معمول وقیع اور باوقار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ الکٹرانک میڈیا کے گلوبل اثرات کے درمیان بھی 'اردو دنیا' نے قارئین کے درمیان اپنی چمک برقرار رکھی ہے۔ ادبی مباحث کے کالم میں شاہد پٹھان نے احتشام حسین کے تنقیدی فکر کے جن گوشوں کا احاطہ تحریر کیا ہے وہ اہم ہیں۔ دیگر شعبۂ حیات سے متعلق مضامین بھی معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ 'زبان و تعلیم' کے کالم کے تحت وضع اصطلاحات کے حوالے سے اسلم جاوداں کا مقالہ فکر انگیز ضرور ہے لیکن اس میں چند ایسی غلطیاں در آئی ہیں جن سے قلم کار کی لسانیاتی بصیرت دائرۂ اشتباہ میں آ جاتی ہے۔ مثلاً Legislature کے اردو متبادل کے طور پر انھوں نے 'قانون ساز' اور 'مقننہ' لکھا ہے جبکہ یہ دونوں Legislature کے عام فہم شدہ متبادل ہیں۔ اسی طرح انھوں نے Nationalization کا متبادل بائے تحتی کے ساتھ 'قومیانہ' درج کیا ہے۔ چند عام لوگوں نے جو اس کا کہیں کہیں متبادل بطور سہو سمجھ کر لکھ دیا ہے وہ الف کے ساتھ یعنی 'قومیانا' ہے اور اس جیسے درجنوں انگریزی الفاظ کا صحیح اور درست متبادل ان شاء اللہ ہماری جلد شائع ہونے والی سہ لسانی ڈکشنری میں آرہا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے Socialization کا متبادل 'سماجیات' لکھ دیا ہے جو اصلاً Sociology کا متبادل ہے۔ 'زبان و تعلیم' کے کالم میں مزید مقالے شائع کیے جانے چاہئیں کیونکہ ادبی اور تنقیدی مضامین تو تقریباً ہر رسالے میں شائع ہوتے ہیں، لسانیات و زبان سے متعلق مقالات کی اشاعت 'اردو دنیا' کو انفرادیت بخشتی ہے۔

ذاکر احمد [illegible] 14

'اردو دنیا' دسمبر 2015 کا شمارہ جو اردو صحافت پر ہے قابلِ قدر ہے۔ بلاشبہ مختلف اور منفرد معلوماتی مضامین کی وجہ سے اردو صحافت پر یہ دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل مختلف مضامین بہت زیادہ پسند آئے اور اس سے بے شمار معلومات کے ساتھ علم میں ان کے مطالعے سے اضافہ ہوا: اولین شہید صحافی: مولانا محمد باقر، اردو صحافت پر قدغن اور اس کے معتوب صحافی، اردو صحافت: ایک تحقیقی جائزہ، راشد الخیری کی صحافتی خدمات، میر ہو یا مصحفی: ادب لطیف کا آئینہ، رسالہ روزنامہ 'ملت' [illegible]، اردو صحافت میں غیر مسلم صحافیوں کی خدمات، جدید اردو صحافت کے معمار: حیات اللہ انصاری، فلمی صحافت کے ارتقا میں اردو صحافت کی [illegible] شخصیت کے تحت خواجہ احمد فاروقی، مگر اردو صحافت کے ذکر میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہفتہ وار اخبارات 'سچ'، 'صدق' اور 'صدق جدید' کا کوئی ذکر نہیں۔

اسی طرح غیر مسلم صحافیوں میں سردار دیوان سنگھ مفتون اور ان کے اخبار 'ریاست' کا کوئی ذکر نہیں۔

ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی: [illegible]

رسالہ اردو دنیا دسمبر 2015 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ زیر نظر شمارے میں صحافت سے متعلق بڑے جاندار اور وقیع مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ بالخصوص محمد شکیل اور اے ایم صدیقی کے مضامین کے مطالعے کے دوران تھوڑی بہت الجھن کا احساس ہوا۔ وہ یہ کہ شکیل صاحب نے انگریزی اخبارات کا ذکر کیا ہے جو 1780 میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ مگر اردو دنیا کے پڑھنے والوں کے لیے یہ بات بھی معلومات افزا ہوگی کہ کلکتہ کے اخبار کی اشاعت کے بعد 12 اکتوبر 1785 میں ایک ہفت روزہ انگریزی اخبار کی اشاعت مدراس میں عمل میں آئی جو جنوبی ہند کا پہلا انگریزی اخبار تھا اس اخبار کی اشاعت سے مدراس میں انگریزی زبان میں صحافت کا آغاز ہوا۔ اس اخبار کے بعد انگریزی زبان میں 'ہرکارو' 1791 میں مدراس گزٹ 1795 میں ہفت روزہ 'انڈیا ہیرالڈ' 1795 میں افق صحافت پر آئے۔ ان انگریزی اخبارات کے بعد تمل زبان کا پہلا اخبار 'تمل میگزین' 1833 میں شائع ہوا۔ دکھ اس بات کا ہے کہ اس تمل زبان کے اخبار نے تمل زبان کے عوام کی فلاح کی بجائے ایک عیسائی مشن کی سرگرمیوں کا ایک حصہ رہا ہے۔ جنوبی ہند میں اردو زبان کا پہلا اخبار 'جامع الاخبار' یکم ذی الحجہ 1287ھ (1841) میں مدراس سے شائع ہوا۔ اس اخبار کے بعد 'اعظم الاخبار' 1848 میں، 'شمس الاخبار' 1849 میں، 'تعریف الاخبار' 1850 میں، 'تنظیم الاخبار' 1851 میں، 'صبح صادق' 1854 میں، 'مظہر العجائب' 1856 میں، 'شمس الاخبار' 1859 میں منظر عام پر آئے۔ ان اخبارات کی شہرت نہ صرف مدراس تک محدود تھی بلکہ دہلی، آگرہ اور رامپور جیسے دور افتادہ شہروں تک پھیل گئی تھی۔ ان اخبارات کو مقبولیت اس لیے بھی نصیب ہوئی تھی کہ یہ اخبارات ذات پات کی دیواروں کو توڑ کر اپنے اپنے مذاہب کے ماننے والوں کو اتحاد کی کڑیوں میں جوڑنے میں پیش پیش تھے۔

محترم! اخبارات میں مدراس کے بعض انگریزی اخبارات کا ذکر حامد رضا صدیقی نے کیا ہے جو ان کے تحقیقی مطالعے کا آئینہ دار ہے۔

زیر نظر شمارے میں تبصروں کا حصہ بھی وقیع اور جامع ہے۔ مگر دکھ اس بات کا ہے کہ کتاب 'جنوبی ہند میں افسانہ نگاری آزادی کے بعد' کا تبصرہ پڑھ کر ڈاکٹر داؤد خان کی کوتاہ علمی اور ان کی تنگ نظری کا اثر ذہن و دل پر گہرا ہوا۔ موصوف نے ترچی یونیورسٹی کے خوشگوار ماحول میں بیٹھ کر تمل ناڈو کی افسانہ نگاری کی خاک چھاننے کی ناکام کوشش کی ہے۔ ایک محقق کو اپنے موضوع کے مواد کی فراہمی کے لیے صدی کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ صرف انٹرنیٹ کا سہارا نہیں چاہیے اور بعض غلط لوگوں سے مشورے لینا نہیں چاہیے۔ تمل ناڈو میں افسانہ نگاری سے متعلق راقم نے بہت پہلے ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا جو ہماری زبان دہلی میں شائع ہو چکا تھا۔ موصوف اپنا مقالہ یونیورسٹی میں داخل کرنے سے پہلے تمل ناڈو کے افسانہ نگاروں کے مجموعے کی سیر بھی کر لیتے تو بہتر تھا۔ ڈاکٹر خان نے تمل ناڈو کے بہت اہم ترین افسانہ نگاروں جن کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان کے نام نظرانداز کر دیے ہیں۔ تعجب اس بات پر ہے کہ جن افسانہ نگاروں نے چار چھ افسانے لکھے ہیں ان کے نام گنوائے ہیں۔ جن افسانہ نگار خواتین نے زیادہ افسانے اردو ادب کو دیے ہیں ان میں امیر النساء، صبا مصطفےٰ، عرفانہ تزئین شمیم، منور رشید قابل ذکر ہیں جن کا ڈاکٹر داؤد صاحب نے شمالی آرکاٹ میں بالکل ذکر نہیں کیا ہے۔

ڈاکٹر خان نے کرناٹک میں اردو افسانہ نگاری کا جو جائزہ لیا ہے وہ بھی نامکمل ہے کرناٹک کے افسانہ نگاروں میں بہت اہم نام جن سے سرورق کا ہے جسے کوئی بھی دیانت دار محقق نظرانداز نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر خان نے بعض ایسے افسانہ نگاروں کے نام شامل کیے ہیں جن کے افسانوی مجموعے عالم منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔ مثلاً ایم سعید، ہاشمی، انیس الحق وغیرہم جبکہ رحمت اللہ نے بہت زیادہ افسانے لکھے ہیں جو بالالتزام ماہنامہ 'بنگلور'، 'نشیمن'، 'سہارا بنگلور' اور 'زریں شعاعیں' بنگلور میں شائع ہوتے ہیں۔

علیم صبا نویدی: نمبر 102/286، پارٹ 16، سائی منزل، اسٹریٹ، چنئی

دسمبر 2015 کا اردو دنیا پیش نظر ہے۔ یہ شمارہ بھی حسب روایت بڑے اہم موضوعات اور تحقیقی نگارشات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر اصغر عباس کا انٹرویو تو اس شمارے کی جان ہے۔ صحافت پر مشتمل گوشے میں شہید صحافی مولانا محمد باقر، علمی صحافت کے ذریعے فروغ اردو اور قومی صحافت کی یکجہتی کے عہد میں بڑے معلومات افزا ہیں۔ ادبی مباحث میں 'شمس الرحمٰن فاروقی: تنقید کا ایک نیا جہان' خاصے کی چیز ہے۔ شخصیت میں خواجہ احمد فاروقی کا خاکہ رسالے کے حسن میں چار چاند لگا رہا ہے۔ غرض کہ آپ کی زیر ادارت 'اردو دنیا' نے معنوی و صوری ہر دو اعتبار سے جس طرح ترقی کی منازل طے کی ہیں اس کے لیے آپ لائق مبارکباد ہیں۔

محترم! اگر پوری طرح حقیقت بیانی سے کام لیا جائے تو بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ 'اردو دنیا' کا ہر شمارہ اپنے موضوع پر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں اردو کے موقر قلم کاروں کی نگارشات کو ہی جگہ دی جاتی ہے جس سے قارئین کو بہت ساری معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی خاص بات یہ کہ 'اردو دنیا' کے ذریعے ہم پوری اردو دنیا سے مطلع ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کے کالم 'خبرنامہ' اور 'عالمی اردو منظرنامہ' سے ہم باخبر رہتے ہیں۔

ڈاکٹر رضوان الرحمن عاطف: محلہ میاں سرائے، سنبھل، ضلع مرادآباد

'اردو دنیا' تواتر سے مل بھی رہا ہے اور بغور پڑھ بھی رہا ہوں۔ تازہ شمارہ دسمبر اور کئی گزشتہ شمارے جو آپ کی ادارت میں نکلے ان اداریوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ اردو شعر و ادب کی مجلہ تمام اصناف کے حوالے سے گفتگو محض اک نعرے پر آ جانا بڑی بات ہے۔ اردو صحافت کے حوالے سے آپ کا درج ذیل جملہ Nutshell کی صورت میں نمایاں ہے جو آپ کی دوربیں نظر کا غماز بھی:

"...تمام تر قومی، ملکی اور لسانی خدمات کے باوجود المیہ یہ رہا ہے کہ اردو صحافت کی جملہ جہات اور قومی ثقافتی شعور کی بیداری میں اس کے کردار کے حوالے سے کوئی مربوط اور مبسوط گفتگو نہیں کی جا سکی۔ صحافت کے موضوعات اور مسائل پر بھی کوئی حتمی تجزیہ نہیں ہو سکا اور نہ ہی صحافت کی کوئی منظم و مربوط تاریخ ترتیب دی گئی ہے۔"

مذکورہ جملے کی صداقت سے انکار کی گنجائش اگرچہ نہیں ہے لیکن اگر ادارہ اس پر مثبت اقدام کرے تو یہ کام آپ کی زیر نگرانی تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ قابل مبارکباد آپ کا یہ قدم ہوگا اگر اردو صحافت کا ایک مبسوط انسائیکلوپیڈیا ترتیب دیا جائے۔ یہ بھی حق ہے کہ NCPUL شعر و ادب کے حوالے سے جو خدمات انجام دے رہی ہے وہ لائق ستائش ہے۔

تازہ شمارے کے تمام مشمولات قابل مطالعہ ہیں۔ سید فضل اللہ مکرم کا ترتیب کردہ 'اردو صحافت کو نذر' بڑی

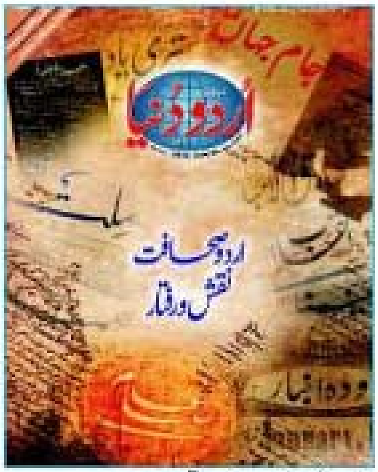

محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ قارئین کے علم میں ضرور اضافے کا سبب بنے گا۔ اسد رضا کا مضمون بھی پر مغز ہے جو تفصیلی طور پر اہم ہے۔ صحافی صاحبان کے مضامین بہت پسند آئے۔ محمد اسداللہ کی کہانی 'بونے' کا ترجمہ بھی خوب ہے۔ تنویر احمد صدیقی کے قلم سے طویل احمد فاروقی کا خاکہ تاثراتی کے حوالے سے اہم ہے۔ آخر میں ایک اہم بات جو صفحہ 64 پر درج ہے "ملک میں کوئی اردو کا دشمن نہیں، اردو داں طبقہ خود اپنی زبان سے ناداری سے کنارہ کش ہے، اگر ہم اردو داں طبقہ کے بیشتر نام نہاد حضرات کو اردو دشمن سمجھتا ہے۔"

فرحت حسین خوشدل: ہزاری باغ، جھارکھنڈ

"اردو دنیا" دسمبر 2015 کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ اس بار آپ نے اردو صحافت کے سنہری دور کو پیش کیا ہے۔ وہ دور اگرچہ ہندوستان اور ہندوستانی اقوام کے لیے بہت ہی صبر آزما اور نہایت ہی کٹھن اور مشکل دور تھا لیکن ان مشکل حالات میں اردو صحافت نے وہ کردار ادا کیا اور قوم و وطن کی وہ خدمت انجام دی جس کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ وہ اردو صحافت ہی تھی جس نے ہندوستانیوں کے دلوں میں اپنے وطن کی آزادی کے لیے جہاد کا جذبہ پیدا کیا۔ اس کام میں اردو کے صحافیوں نے اپنا گھر بار، مال و اسباب ہی نہیں بلکہ اپنی جانیں تک قربان کردیں لیکن ان کے پائے ثبات میں ذرہ برابر لغزش نہیں پیدا ہوئی۔ اردو صحافت کے اولین شہید صحافی مولانا محمد باقر کے نام سے کون واقف نہیں۔ ایسے ہی مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالرزاق ملیح آبادی اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کی صحافتی خدمات اور وطن عزیز کی خاطر ان کی قربانیاں بھی روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ اس خصوصی شمارے کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے ذریعے ہندوستانی قوم کو اس کی تاریخ سے روشناس کرایا گیا ہے جو بہت ضروری تھا کیونکہ جو قوم اپنی تاریخ کو بھلا دیتی ہے، دنیا اس قوم کو بھی بھلا دیتی ہے بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیتی ہے۔

اسد رضا صاحب نے 'اولین شہید صحافی مولانا محمد باقر' کے عنوان سے بہت ہی اچھا اور معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ انھوں نے لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ شمیم طارق صاحب نے بھی 'اردو صحافت پر قدغن اور اس کے مقتدر صحافی' کے عنوان سے بہت اچھا لکھا ہے۔ راشد الخیری کی صحافتی خدمات کے عنوان سے محمد اکبر صاحب نے بھرپور مضمون لکھا ہے۔ ایسے ہی جدید اردو صحافت کے معمار حیات اللہ انصاری پر محمد یوسف وانی کا اچھا اور تفصیلی مضمون ہے۔ اردو صحافت میں غیر مسلم صحافیوں کی خدمات کے عنوان سے حامد رضا صدیقی نے مضمون تو اچھا لکھا ہے لیکن کچھ زیادہ ہی اختصار سے کام لیا ہے اگر تفصیل سے لکھتے تو اس کی افادیت و اہمیت میں اور بڑھ جاتی۔ دیگر مضامین بھی اہم ہیں۔ مجموعی اعتبار سے اس شمارے میں جنگ آزادی کے سلسلے میں اردو صحافت کے کردار کو بڑے سلیقے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

محمد متین شیخ: [illegible]

دسمبر 2015 کا شمارہ زیر نظر ہے۔ جناب آشوتوش سریواستو کا مضمون ادبی مباحث کے تحت 'عشق عرفان' (عشق کا ایک جہان) پڑھنے کے بعد میں حیرت زدہ رہ گیا۔ مضمون نگار نے جناب عرفان صدیقی کے موجودہ عہد کا سب سے بڑا شاعر ہونے کا اعلان ہی نہیں کیا بلکہ ہند و پاک میں ان کے جیسا کوئی دوسرا شاعر اس روئے زمین پر موجود نہیں ہے اس کا بھی ذہنی خاکہ دے دیا۔ حد تو اس وقت ہوگئی جب سریواستو جی نے اپنے زمانے کے نامور شاعروں میں مومن، حسرت موہانی اور فراق گورکھپوری جیسے عظیم شاعروں کو صدیقی صاحب کے سامنے کمتر ثابت کرنے کی کوشش کی۔

اپنے مضمون میں جناب سریواستو جی ایک جگہ جناب عرفان صدیقی کا موازنہ مومن سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مومن کے یہاں جو عشق نظر آتا ہے وہ بازاری اور شوقیہ ہے۔ آگے حسرت موہانی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان کے یہاں بھی اسی طرح کا عشق (شوقیہ اور بازاری) نظر آتا ہے۔ حسرت کا مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے عمر کی دہلیز کی مگر عشق کی گہرائی نہ سمجھ سکے اور سطحی جذباتیت کا شکار ہو کر رہ گئے۔ آگے سریواستو جی فراق گورکھپوری کا موازنہ عرفان صدیقی سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "فراق اور عرفان صدیقی کے عشق میں امتیازی پہلو یہ ہے کہ فراق نے عشق کو ارضیت تو عطا کی مگر محبوب کی حیثیت میں کوئی خاص تبدیلی نہ لا سکے۔ ان کا محبوب بھی پیشروؤں کی طرح صرف تخلیقی سہارا نظر آتا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ فراق صاحب یا تو اشک بار نظر آتے ہیں یا پھر سراپا آرزوئے وصال۔ ان کے یہاں پر تکلیف ارتقا نظر نہیں آتا جو عرفان صدیقی کے یہاں ہے بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جنسی لذت ہی فراق صاحب کے عشق کی معراج ہے۔"

ان الفاظ سے متعلق ایک بھی شعر دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بات تو خوب ہوتی جب آپ اپنے دعوے کی صداقت میں اشعار پیش کرتے اور حوالوں دلائل سے اپنی بات ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔

[illegible]: شاہ پور [illegible]، سمستی پور، بہار

"اردو دنیا" کا شمارہ دسمبر 2015 سامنے ہے، جس میں آپ نے ایک گوشہ اردو صحافت: نقش و نگار کے نام سے نکالا ہے۔ اس مجلے کے ذریعے ہمیں اردو اخبار کے آغاز و ارتقا کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم ہوئیں۔ چھ روپے میں اتنا عمدہ 80 گرام والے کاغذ پر اتنا رسالہ نکالنا ہم قارئین کے لیے ایک تحفہ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ آپ نے صحافت کے میدان کے بڑے بڑے قلم کاروں سے مضامین لکھوا کر ہمیں اتنی زیادہ معلومات بہم پہنچائی کہ آپ کے لیے دعائیں دل سے نکل رہی ہیں۔

خاص طور سے مجھے صفحہ 43 کا ایک مضمون بعنوان 'ہندی صحافت کے ذریعے فروغ اردو' بے حد پسند آیا، جسے اسد فیصل فاروقی علی گڑھ نے بہت ہی عرق ریزی سے تیار کیا ہے۔ انھوں نے اردو میں 'طب، صحت وہ جنسی رسالوں' کو موضوع بنا کر فروغ اردو کے لیے کی جانے والی کوششوں کو اچھے انداز میں اجاگر کیا ہے۔ اسد رضا کا مضمون 'اولین شہید صحافی مولانا محمد باقر' مضمون بے حد معلوماتی ہے اور محنت سے تحریر کیا گیا ہے۔

[illegible]: [illegible]

"اردو دنیا" کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ اردو صحافت پر بہت کام کے مضامین ہیں۔ خاص طور پر مولوی محمد باقر کو یاد کر کے آپ نے بہت اچھا کیا اسی طرح مقتدر صحافیوں والا مضمون بھی بہت اچھا ہے لیکن اس شمارے کی سب سے خاص چیز استاد محترم پروفیسر [illegible] صاحب کا انٹرویو ہے۔ سرسید اور علی گڑھ کے تو خیر وہ ماہر اور عاشق ہیں لیکن شمس الرحمٰن فاروقی کے جس بیان کا انھوں نے ذکر کیا ہے اس سے بھی بہت کم لوگ واقف ہوں گے اسی طرح ڈاکٹر محمد عزیز اور دوسرے لوگوں کے بارے میں انھوں نے جو باتیں کہی ہیں وہ بھی بہت اہم ہیں۔ خاص طور سے محمود الٰہی صاحب مرحوم کے Contribution کے بارے میں انھوں نے جو بات کہی ہے وہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی۔ اس معاملے میں ان کے شریک شاید صرف پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ہوں جنھوں نے دہلی یونیورسٹی کے اکثر کالجوں میں 1947 کے بعد کے زمانے میں اردو کی تدریس کا انتظام کرایا۔ اس شمارے کے لیے بہت بہت مبارک باد۔

اشتیاق احمد: [illegible]

بچوں کے لیے لکھنا بہت مشکل ہے

بانو سرتاج

ڈاکٹر بانو سرتاج اردو اور ہندی کی مشہور ادیبہ ہیں۔ انھوں نے بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے لکھا ہے۔ بچوں کی نفسیات سے کما حقہٗ واقف ہیں۔ ادب اطفال کے ضمن میں انہیں ساہتیہ اکادمی کے بال ساہتیہ پرسکار سے بھی نوازا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ادب اطفال میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کئی اہم اداروں میں انہیں ایوارڈ سے سرفراز کیا ہے۔ ڈاکٹر شگفتہ کالرا نے بچوں کے ادب اور دیگر مسائل کے تعلق سے ان سے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ پیش ہیں انٹرویو کے کچھ اقتباسات: (ادارہ)

شگفتہ کالرا: آپ نے ادبِ اطفال کے خزانے میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ آپ کی اوّل تخلیق کون سی تھی؟ کس صنف میں تھی اور لکھنے کی تحریک کیسے ملی؟

بانو سرتاج: پانچویں یا چھٹی جماعت سے میں نے کہانیاں اور نظمیں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ بچوں کے لیے پہلی کہانی "سزا" تھی۔ وہ کہانی بھی ظفر سر سے متعلق تھی۔ مڈل اسکول میں ہمیں اسکول لائبریری سے پڑھنے کے لیے کتابیں اور رسائل ملا کرتے۔ ہماری کلاس میں ہم چھ لڑکیاں تھیں۔ یقیناً پانچوں کو پڑھنے میں دلچسپی نہیں تھی۔ ہم نے ایک معاہدہ کیا۔ وہ اپنے نام کتابیں الاٹ کرا لیں۔ میں سب کی کتابیں رسائل گھر لے جاتی۔ مہینوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ایک ہفتے کو میں اسکول نہیں پہنچ سکی۔ لائبریری کا پیریڈ آیا تو سہیلیوں نے بتا دیا کہ سب کی کتابیں میں لے جاتی ہوں۔

سنیچر کو میں اسکول پہنچی تو بریک میں ظفر سر نے طلب کر لیا۔ میں نے کتابیں سنبھالیں اور اسٹاف روم کے دروازے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ ظفر سر نے کہا "میری اجازت کے بغیر تم سب لڑکیوں کی کتابیں گھر لے جاتی رہی ہو؟ تمھیں پڑھنے کا بہت شوق ہے؟"

میں نے سر ہلا دیا۔ ظفر سر نے کہا "تم نے غلط کیا۔ تمھیں اس کی سزا ملے گی۔" اس زمانے میں ظفر سر ہی تھے جو لڑکیوں کو بھی سزا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کلاس میں باتیں کرنے پر میں کھڑی اسکیل کی مار کھا چکی تھی۔ سزا کا نام سنتے ہی رونا شروع کر دیا۔ ظفر سر اٹھ کر میرے قریب آئے۔ میرے ہاتھ سے کتابیں لے کر بولے "یہ کیا ہر بات پر روتی ہو۔ سزا تو سن لو پہلے۔ تمھاری سزا یہ ہے کہ آج سے تم جتنی چاہو اتنی کتابیں اپنے نام پر گھر لے جا سکتی ہو۔"

میں نے "سزا" کہانی لکھی جس کا اختتام کچھ اس طرح کیا کہ اگر ظفر سر اس روز مجھے وہ سزا نہ دیتے تو پڑھنے کا میرا شوق دم توڑ دیتا... میں افسانہ نگار نہ بن پاتی۔ مجھے ظفر سر کی اس سزا پر ناز ہے۔

"مسکان" میں کہانی شائع ہوئی۔ ظفر سر نے پڑھی۔ اسکول کا وقت ختم ہوتے ہی اپریل کی تپتی دوپہری میں سائیکل چلاتے ہوئے میری باجی کے گھر پہنچے۔ ان سے کہا "اُسے کہو... وہ جہاں کہیں ہو اُسے کہو کہ مجھے بھی اس پر ناز ہے۔"

ش گ: اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بتائیے؟ کیا آپ کو ادبی ماحول میسر ہوا؟

بانو سرتاج: میرے والد شاہ محمد ابراہیم ڈپٹی کلکٹر تھے۔ میں پانچ سال کی تھی جب ان کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا۔ ان کی یادیں میرے ذہن میں نقش ہیں... البتہ گھر میں انسائیکلوپیڈیاز سے بھری الماریاں مجھے یاد ہیں جن میں سے اکثر جلدوں کو ہم بھائی بہن لے کر بیٹھتے اور ان میں چھپی ہوئی چرند پرند، پھولوں کی تصاویر پر اپنی اپنی پسند کے نشان ثبت کرتے۔۔۔ ہم بھائی بہنوں کے ہوش سنبھالتے وقت الماریوں سے وہ قیمتی جلدیں غائب ہو چکی تھیں۔ والدہ ڈاکٹر محمودہ خاتون شاہ انگریزی ہندی کے ناول اور رسائل پڑھا کرتیں۔ سب بھائی بہن ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ بڑے بھائی جان انگریزی ادب کے دلدادہ تھے۔ چھوٹے بھائی، باجی اور چھوٹی بہن اردو ادب کے شائق ہیں۔ مجھلے بھائی جان امجد رسائل میں شائع شدہ نظموں اور غزلوں پر پیروڈی لکھا کرتے۔ ایسے ماحول میں میں لکھنے کی طرف راغب ہوئی۔

ش گ: آپ نے لکھنے کا آغاز کس صنف سے کیا؟

بانو سرتاج: شاعری سے۔ پیدائش کے وقت میرا نام سرتاج النسا تھا۔ اسکول میں وہ سرتاج بانو ہوا اور پھر بانو سرتاج... جب غزلیں کہنے لگی تو سرتاج بانو تخلص بن گئی۔ آسی رام نگری صاحب سے اصلاح لی مگر جلد ہی میں نثر کی طرف آ گئی۔

ش ک: آپ کا پہلا افسانہ کون سا تھا؟ پہلے افسانے کی اشاعت پر کیسا رسپانس ملا؟

بانو سرتاج: میرا پہلا افسانہ 'دو دکھی لڑکا' تھا جو ماہنامہ کتاب لکھنؤ میں دو تین سال بعد شائع ہوا۔ پہلا شائع شدہ افسانہ 'دو ایک دل کا' ماہنامہ 'سروج' کلکتہ میں شائع ہوا۔ جب رسالہ میرے پاس پہنچا میں اکیلی اماں کے پاس تھی۔ دونوں بھائی جان ملازمت کے سلسلے میں، دونوں چھوٹے تعلیم کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں تھے۔ باجی کی شادی ہو چکی تھی۔ گھر میں ادبی ماحول ضرور تھا مگر افسانہ کسی نے نہیں لکھا تھا۔ میں بہت گھبرائی کہ پتہ نہیں اماں بھائی جان وغیرہ کیا رسپانس دیں گے۔ دراصل ان دنوں رسالہ 'شمع' میں ایک خاتون افسانہ نگار کے فحش افسانے متواتر شائع ہو رہے تھے... کئی مسلم خاندانوں نے شمع خریدنا اور گھر کی خواتین تک پہنچانا بند کر دیا تھا۔ میں نے سوچا افسانہ کہیں چھپا دینا چاہیے۔

میں 'شمع' کے فلمی پیپر (صفحات) کو ضائع کر دیتی اور افسانوں کو کاٹ کر رکھتی۔ پھر بیسویں صدی اور 'ہما' کے افسانوں کے ساتھ جلد بندھوا لیتی۔ ایک جلد بائنڈنگ کے لیے تیار تھی۔ میں نے اپنا افسانہ ان افسانوں کے درمیان لگا دیا... پھر جہاں میرا نام تھا اس پر چیپٹ لگا دی۔

منجھلے بھائی جان چھٹیوں میں گھر آئے۔ وہ شوقین تھے۔ زیادہ تر کتابیں پڑھتے رہتے۔ انھوں نے وہ چیپٹ دیکھی تو لیمپ کی تیز روشنی میں رکھ کر راز جان لیا۔ رات کھانا کھانے کے بعد اماں سے بولے "اماں! بی پھویا (میرا گھر کا نام) افسانہ نگار بن گئی ہے" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "بہت لکھو، خوب لکھو مگر کبھی ایسا نہ لکھنا جسے پڑھ کر ہماری نظریں شرم سے جھک جائیں اور شریف خاندانوں کی معصوم لڑکیوں کے کچے ذہنوں پر برا اثر پڑے۔" اماں نے گلے لگا کر کہا تھا "جسے چمکنا ہوتا ہے وہ اندھیرے میں بھی چمک جاتا ہے۔ آنکھ والے نام پر چیپٹ نہیں لگاتے۔"

ش ک: آپ کی شادی کب ہوئی؟ شادی کے بعد کیسا ماحول ملا؟

بانو سرتاج: فروری 1971 میں شادی ہوئی۔ شوہر عبدالاحد قاضی سینئر پولیس پراسیکیوٹر تھے۔ (آج کل پریکٹس کرتے ہیں) انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کا احترام کیا۔ میں نے ایم اے، ایم ایڈ کیا۔ ایجوکیشن فیکلٹی میں پی ایچ ڈی کی اور لیکچرر بن گئی۔ سسرال میں سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ کسی نے مخالفت نہیں کی... یہاں تک کہ میری کلاسیکل موسیقی سیکھنے کی خواہش بھی پوری ہوئی۔

ش ک: کیا اس دوران افسانے لکھتی رہیں آپ؟

بانو سرتاج: لکھتی رہی مگر اردو میں کم، ہندی میں زیادہ... کیونکہ کالج میں ہندی، مراٹھی، انگریزی زبانوں سے سروکار رہا۔ اردو کا چندرپور میں ماحول سازگار نہیں ہے۔ اس لیے رسائل بھی نہیں ملتے تھے۔ 1990 سے میں نے ادبِ اطفال کی طرف توجہ دی بلکہ اس کے لیے وقف ہو کر رہ گئی۔ دراصل پی ایچ ڈی، ایم ایڈ میں پڑھاتے اور ریسرچ اسکالرز کو گائیڈ کرتے ہوئے میں نے Educational Psychology کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس طرح بچوں کے لیے لکھنے کے لیے خود کو Qualified سمجھنے لگی تھی۔

ش ک: سرتاج صاحبہ! آپ ہندی کی طرف کیسے راغب ہوئیں؟

بانو سرتاج: حیدرآباد میں میرے افسانے شائع ہوئے۔ ان دنوں 'ہما' کا افسانوی حصہ اقبال متین صاحب دیکھتے تھے۔ انھوں نے میرے افسانوں کو نکھارنے، سنوارنے میں کافی مدد کی۔ میں نے ہندی میں ایم اے کر لیا تھا اور بڑے فخر سے نام کے ساتھ ایم اے (ہندی) لکھتی تھی۔ ایک خط میں اقبال متین صاحب نے مجھ سے ان کی کہانیوں کو ہندی میں منتقل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے ان کی تین کہانیاں ہندی میں ترجمہ کیں جو شری پت رائے جی کے رسالہ 'کہانی' میں شائع ہوئیں...

پھر میری زندگی کا وہ یادگار دن آیا جب فرزندِ منشی پریم چند شری پت رائے جی کا خط ملا— "بانو! تمھاری ہندی بہت اچھی ہے۔ تم ہندی میں کہانیاں کیوں نہیں لکھتیں؟" میں خوشی سے بے قابو ہو گئی۔ سب کو وہ خط دکھاتی پھری۔

میں نے ہندی میں لکھا اور شری پت رائے جی نے مجھے چھاپنا شروع کر دیا۔

ش ک: بچوں کے لیے لکھنے کا حوصلہ (گرومنتر) کس سے ملا؟

بانو سرتاج: شری پت رائے جی اور والدہ سے۔

ش ک: آپ تفصیل سے اس بارے میں بتا سکیں تو اچھا ہوگا۔ دراصل سفر کی ابتدا میں جو رہنمائی ملتی ہے وہ تا زندگی ساتھ رہتی ہے... آپ بھی اس سے متفق ہوں گی۔

بانو سرتاج: ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ غالباً 1983 کی بات ہے، ہم کشمیر گھومنے گئے...

ش ک: ہم یعنی کون؟

بانو سرتاج: میں اور میرے شوہر قاضی عبدالاحد۔ شری پت رائے جی کو ہمارے پروگرام کا علم ہوا تو انھوں نے حکم دیا: "واپسی میں دلی رکو، میرے گھر قیام کرو۔"

میں جب دلی پہنچی ان سے ملی تو بولے "تم مجھے بھائی صاحب کہتی ہو۔ میں تم سے عمر میں بہت بڑا ہوں۔ آج سے تم میری بیٹی ہو۔" انھوں نے گھر آئی بیٹی کا استقبال کیا، داماد کو بھی بہت عزت دی۔ شری پت رائے جی کی بیگم زہرہ رائے نے بھی خوب پیار دیا۔

دورانِ قیام میں نے بھائی صاحب کو 'سزا' کہانی پڑھ کر سنائی۔ انھوں نے ہنس کر کہا "بانو! اگر تم بچوں کے دماغ میں کچھ ٹھونسنا چاہتی ہو تو صرف نصیحت لکھو... اور اگر لکھنا ہی ہے تو بچوں کی آنکھوں کے سوال سمجھو، ان کے دلوں کی، خوابوں کی دنیا میں جھانکو، ان سے پوچھ کر لکھو کیا چاہتے ہیں— بڑوں کے لیے لکھنا بہت آسان ہے، بچوں کے لیے لکھنا بہت مشکل ہے۔ ایک ساتھ دو ناؤ میں پاؤں مت رکھو۔ بڑوں کے لیے لکھ کر قلم پر مہارت حاصل کرو اور پھر بچوں کے لیے لکھو یا ادبِ اطفال کے لیے خود کو وقف کر دو۔"

میں آج تک بھائی صاحب کے قول کو گرومنتر مان کر چل رہی ہوں۔

میری والدہ، ہم بھائی بہنوں کی غلطیاں درست کرنے کے لیے کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ ادبِ اطفال کی تخلیق کرنے کے لیے انھوں نے بہت حوصلہ افزائی کی۔

ش ک: سرتاج صاحبہ! آپ مختلف اصناف میں لکھتی ہیں۔ اچھا لکھنے کے لیے آپ کے تئیں کیا ضروری ہے؟ خداداد صلاحیت، مطالعہ یا ذمے داری کا احساس؟

بانو سرتاج: جس میں خداداد صلاحیت ہوتی ہے وہ اچھے Runner کی طرح ابتدا میں آہستہ دوڑتا ہے اور پھر رفتار پکڑتا ہے۔ اکتسابی صلاحیت ابتدا میں تیز دوڑتی ہے اور جلد ہی ہمت ہار دیتی ہے۔ ادبِ اطفال ہی کی مثال لیں، آج ادبِ اطفال وہ لوگ زیادہ لکھ رہے ہیں جو یا تو دوسری اصناف سے خارج کیے گئے ہیں، یا ریٹائرمنٹ کے بعد پرچون کی دکان کھول کر بیٹھنے کی بجائے بچوں کے لیے لکھ رہے ہیں۔

ش ک: ... اور مطالعہ؟ ذمے داری کا احساس؟

بانو سرتاج: مطالعہ دونوں کے لیے ضروری ہے— ذمے داری کے احساس سے معلوماتی مضامین لکھے جاتے ہیں۔ ویسے بھی احساسِ ذمے داری سے حسن پذیری تخلیق احساس ہے۔ بچے کو عالم فاضل بنانے سے زیادہ اہم ہے اسے اچھا انسان بنانا۔

ش ک: سرتاج صاحبہ! مانا جاتا ہے کہ اردو میں بچوں کے لیے بہترین ادب، بڑوں کے لیے لکھنے والوں نے ہی تخلیق کیا ہے۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

بانو سرتاج: نہیں۔ ہرگز متفق نہیں ہوں۔ اس طرح

کا Statement ادب اطفال کے ہمہ وقتی ادیبوں کی حق تلفی کرتا ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ بڑوں کے لیے لکھنے والوں نے بھی بچوں کے لیے اچھا ادب تخلیق کیا ہے۔

ش ک: کیا یہ صحیح ہے کہ بچوں کے لیے ادب تخلیق کرتے وقت بچہ بن جانا پڑتا ہے؟

بانو سرتاج: سو فیصد صحیح ہے۔ میں یہ مانتی ہوں کہ بچوں کے لیے اچھا ادب اسی وقت لکھا جا سکتا ہے جب لکھنے والا بوڑھا ہو جاتا ہے لیکن لکھتے وقت اُسے بچہ بننا پڑتا ہے اس معنی میں کہ اسے وہاں جانا پڑتا ہے جہاں بچے نہیں، بچوں کے خیالات جاتے ہیں۔ اُس نے بچوں کے دلوں کی گہرائیوں میں پوشیدہ نامکمل خواہشات، معصوم شکایتوں، نٹ کھٹ معصوم فرمائشوں کا پتہ لگانا پڑتا ہے۔ ان کے ذہن میں کلبلاتے معصوم سوالوں کے جواب دینا پڑتا ہے۔ رویندر ناتھ ٹیگور کا ایک مقولہ ترمیم کے ساتھ ہر ادب الاطفال پر صادق آتا ہے — وہ کہتے ہیں: He, who, lost the child in himself/herself is absolutely unfit for the great task of writing for children."

میں آج بھی بچوں کے لیول پر آکر ان سے ملتی ہوں، ان کی نظروں سے دنیا کو دیکھنے، سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ان کی نٹ کھٹ پہیلیوں کے جواب ڈھونڈتی ہوں، ان سے پہیلیاں پوچھتی ہوں۔ ان سے لطیفے سنتی ہوں، انھیں لطیفے سناتی ہوں۔

ش ک: سرتاج صاحبہ ادب اطفال کی تخلیق آپ کا مشن ہے یا آپ Self Satifaction کے لیے لکھتی ہیں؟

بانو سرتاج: شکنتلا جی، اس سوال کا جواب میں تفصیل سے دینا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنی ایک کتاب کا انتساب 'اس طرح' کیا ہے — 'اُن حقیقتوں کے نام جو افسانوں میں ڈھل کر قابل برداشت ہو جاتی ہیں' یہ انتساب ظاہر کرتا ہے کہ میرے افسانے Self-Satisfaction کے لیے ہوتے ہیں۔ میں جب کسی مسئلے سے دوچار ہوتی ہوں، غمزدہ ہوتی ہوں تو میرا قلم مجھ سے کہتا ہے — 'اپنے دکھ مجھے دے دو۔ تلخ حقیقت کو افسانوں کے قالب میں ڈھال دو۔' میں ویسا ہی کرتی ہوں۔ قاری میرے افسانے پڑھتا ہے، اُسے خود آگاہی ہوتی ہے کہ دنیا میں وہی اکیلا دکھی نہیں، دوسروں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے... پھر وہ دیکھتا ہے کہ افسانوں کے کردار مسائل کے جال سے کس طرح آزاد ہوئے تو وہ بھی کوشش کرتا ہے اور غموں سے نجات پاتا ہے۔ یہاں میرا ادب -Self Satisfaction تو رہتا ہی ہے... Universal benefit کا مقصد بھی پورا کرتا ہے —

بچوں کے لیے لکھنا میرا مشن ہے۔ بن تراشے ہوئے ہیرے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ میں بچوں کو اچھا بچہ، اچھا شہری، اچھا انسان بنانے کی کوشش کرتی ہوں۔

ش ک: ادب اطفال کی تعریف آپ کیسے کریں گی سرتاج صاحبہ؟

بانو سرتاج: وہ ادب، جو بچوں میں تجسس و فکر و عمل کو فروغ دے کر زندگی کے حقائق کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو، بچوں میں محبت، یکسانیت، بے غرض خدمت، قومیت وغیرہ کے جذبات پیدا کرے، مشکلات سے لڑنا سکھائے، وہ ادب اطفال ہے۔ نصابی کتابوں کے خشک اسباق کے خلاف جو ادب دلچسپ طریقے سے علم مہیا کرائے وہ ادب اطفال ہے۔ نصابی کتب کے علاوہ رسائل اور کتابیں پڑھنے کے لیے جو ادب راغب کرتا ہے، انھیں تفریح مہیا کراتا ہے وہ ادب اطفال ہے۔

ش ک: اچھا ادب اطفال کیسا ہونا چاہیے؟

بانو سرتاج: اس سوال کا جواب میں ڈاکٹر ظ انصاری کے الفاظ مستعار لے کر دوں گی۔ وہ کہتے ہیں "میرے دل سے پوچھو تو بچوں کا ادب وہی سب سے اچھا ہے جسے بچوں کے باپ دادا بھی پڑھیں تو لطف لیں۔ جس طرح موسم کے پھل، تہوار کی جلیبی اور برفی کہ بچے بوڑھے دونوں خوش، مزے کا مزا، غذا کی غذا۔"

بچوں کے لیے 2015 میں شائع شدہ میری کتاب 'مزے کا مزا، غذا کی غذا' سیریز کی پہلی کتاب ہے جس میں میں نے تفریح اور معلوماتی مضامین یکجا کر دیے ہیں۔

ش ک: بچوں کے ادب میں تفریح اور معلومات کا تناسب کیا ہونا چاہیے؟

بانو سرتاج: تفریح 95 فیصد اور معلومات 5 فیصد ہے۔ براہ راست معلومات دینے کی میں حمایت نہیں کرتی۔ معلومات تفریح کے ذریعے بھی دی جا سکتی ہے، اور وہی ادب بہتر ہوتا ہے۔

ش ک: بچوں کی شخصیت کی صحیح نشو و نما کے لیے کیا ضروری ہے؟ — بچے بنائے اخلاقی اقدار کی تعلیم دینا یا زندگی سے براہ راست اقدار کی تلاش کرنا؟

بانو سرتاج: بچے میں اچھے برے کی تمیز کرنے کی اہلیت نہیں ہوتی۔ انھیں اخلاقیات اور اخلاقی اقدار کی پہچان کرانی ہوتی ہے۔ اخلاقیات سکھانی پڑتی ہے...

ش ک: (قطع کلام کرتے ہوئے) اخلاقی اقدار کی پہچان کیسے کرائی جائے، اس کی وضاحت ضروری ہے۔

بانو سرتاج: اخلاقیات، اسباق کی صورت میں پڑھائے نہیں جا سکتے... اخلاقی اقدار ذہن نشین کرائے ہوتے ہیں۔ in culcate کیے جاتے ہیں، مشاہدہ اور مثال پیش کرنا سب سے اچھا طریقہ ہے۔ اچھے برے کی تمیز کرنے کی اہلیت ایک خاص عمر کو پہنچنے کے بعد آتی ہے۔ بچوں سے اس کی توقع کرنا غلط ہے۔

ش ک: آپ کس ادیب/ادیبوں سے متاثر ہیں؟

بانو سرتاج: پریم چند اور شرت چندر چٹرجی سے... ان کی سادہ زبان اور دلفریب بیانیہ مجھے متاثر کرتا ہے۔ ان کی پیش کش میں جذباتیت کا عنصر مجھے پسند ہے۔

ش ک: آپ کی پسندیدہ صنف کون سی ہے؟

بانو سرتاج: کہانی اور ڈراما... ویسے دونوں ایک ہی ہیں۔ ڈراما کی بنیاد میں ایک کہانی ہی ہوتی ہے۔ میں نے اپنی کئی کہانیوں کو ڈراموں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ڈراما ایک ایسی صنف ہے جو بچوں کو آغاز سے اختتام تک اپنے ساتھ باندھے رکھتی ہے۔ ڈرامے میں کہانی کا تجسس اور روانی ہے، نظم کا تسلسل اور شیرینی ہے۔ ڈراما بچوں کو فعال بناتا ہے۔ میں نے 75 سے زیادہ یک بابی ڈرامے لکھے ہیں۔ میرے ڈراموں کے مجموعے کو مرکزی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ حاصل ہوا ہے۔

ش ک: آپ نے بچوں کے لیے نظمیں لکھی ہیں؟

بانو سرتاج: جی ہاں۔ یہ نظمیں 'مرغے میاں کی ککڑوں کوں' مجموعہ میں شامل ہیں۔ ان میں سے نوے فیصد نظمیں لڑکپن میں لکھی گئی نظمیں ہیں۔

ش ک: آپ کے دو ناول 'جنگل اور منگل' اور 'چکیا اور پری چھم' کافی مشہور ہوئے ہیں۔ آپ نے کل کتنے ناول لکھے ہیں؟ تفصیل سے بتائیے۔

بانو سرتاج: صرف یہی دو ناول... فضول انبار لگانے سے کیا فائدہ۔ بچپن میں پڑھے ہوئے ناول Robinson Cruso سے میں بہت زیادہ متاثر تھی، جنگل میں منگل ناول میں یہ اثر نمایاں ہے۔ وقت انسان کی کیسے مدد کرتا ہے۔ کس طرح اسے فعال بناتا ہے یہ سبق جنگل میں منگل ناول کے انسانی اور حیوانی کردار ثابت کرتے ہیں۔ 'چکیا اور پری چھم' حیرت و تجسس، دلچسپ واقعات، انسانی ہمدردی، ملک کی تہذیبی وراثت سے واقف کرنے والا ناول ہے۔

ش ک: دور حاضر میں اخلاقی اقدار کو بد ظن اور دماغی دیوالیہ پن کا اشتہار کہتے ہیں/آؤٹ ڈیٹڈ مانتے ہیں کچھ لوگ اور بچوں کے لیے سائنسی اور تخیلی ادب کی حمایت کرتے ہیں۔ آپ کیا سوچتی ہیں؟

بانو سرتاج: ہندوستانی تہذیب، سنیم، شوم، سندرم کی بنیاد پر قائم ہے۔ تہذیب و تمدن کی قربانی دے کر مثالی معاشرہ کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔ آج ہندوستانی تہذیب کو

اپنانے کے لیے غیر ملک سے لوگ کھنچے چلے آرہے ہیں اُسے Outdated کہہ کر ہم خود کو بونا ثابت کررہے ہیں، جاہل قرار دے رہے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی زمانہ قدیم میں ہندوستان میں تھی آج بھی اس کی اہمیت ہے اور ادب میں بھی سائنسی نظریات شامل ہیں۔ سائنسی ادب تخلیق کیا جارہا ہے جو کسی طرح بھی غیر اہم نہیں ہے۔ اعتراض کرنے والے خود دماغی دیوالیہ پن کے شکار ہیں۔

بانو سرتاج: غلط کرتا ہے۔ بچوں کو راجہ رانی، راکشش، چڑیل، جن بھوت کی کہانیاں آج بھی پسند آتی ہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے، پہلے وہ اڑن کھٹولے میں بیٹھنے کا تصور کرکے خوش ہولیتا تھا آج پرندوں کی مانند آسمان میں اڑنا چاہتا ہے۔ پہلے کسی شہزادے کی طرح، کسی شہزادی کو ظالم راکشش کے چنگل سے چھڑانے کا خواب دیکھتا تھا، آج سپرمین، شکتی مان کی طرح مظلوموں کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ پھر آج بھی وہ شوخی، شرارت، خواب، تجسس، بچوں میں موجود ہیں جن سے بچپن عبارت ہے تو پری کہانیاں بھی اپنی اہمیت رکھتی ہیں، بھلے ہی اُن کا رنگ روپ بدل گیا ہو۔

ش ک: تنقید و تحقیق کی آپ کی کوئی کتاب منظر عام پر آئی ہے؟

بانو سرتاج: 2015 میں 'ادب اطفال: ایک مطالعہ' شائع ہوئی ہے۔

ش ک: آپ کی کتاب 'دنیا کارٹون اور کامک کیریکٹرس کی' کے متعلق کچھ بتائیں۔

بانو سرتاج: اس کتاب میں بچوں کے پسندیدہ کامکس کارٹون کیریکٹرس کا تعارف کرایا گیا ہے۔ رنگین تصاویر سے مزین میری یہ کتاب سات سالوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ انٹرنیٹ تو ابھی ابھی آیا ہے۔ میں نے انگریزی، ہندی، مراٹھی اردو اخبارات و رسائل سے میٹر (مواد) جمع کیا تھا۔ دو سال تک مجھے پبلشر نہیں ملا۔ کوئی اسے چھاپنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔ آخر ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نے کتاب چھاپی۔ پبلشر جناب پریم گوپال مٹل صاحب کے درج ذیل الفاظ کا ایوارڈ آج بھی مجھے لکھنے کے لیے حوصلہ دیتا ہے۔ "1960 سے اشاعت کا کام کررہا ہوں مگر چار رنگوں میں کتاب شائع کرنے کا یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔ اتنی مہنگی کتاب میں نے آج تک نہیں چھاپی۔" اس کتاب کے تعلق سے خاص بات یہ ہے کہ کسی اکادمی کسی ادبی حلقے سے اس کتاب کی پذیرائی نہیں ہوئی۔

ش ک: ادب اطفال کی حالیہ سست اور رفتار کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ اکیسویں صدی ادب اطفال کا سنہرا دور ثابت ہوگی؟ آپ کیا کہتی ہیں؟

سوانحی خاکہ

نام: بانو سرتاج، پورا نام: ڈاکٹر بانو سرتاج قاضی

پیدائش: 17 جولائی 1945 بمقام پانڈھرکوڑہ، ضلع ایوت محل، مہاراشٹر

تعلیم: ایم اے (اردو، ہندی، تواریخ)، ایم ایڈ، پی ایچ ڈی (ایجوکیشن)، پی جی ڈپلوما ان گائڈنس قبائلی، بھاشا استانک مراٹھی)

ملازمت: • سابق پروفیسر اینڈ ہیڈ (ایم ایڈ) شری سائی بابا کالج آف ایجوکیشن، گڑھ چرولی • سابق ڈائرکٹر، شری سائی بابا گروپ آف ایجوکیشن کالجز، گڑھ چرولی اور چندرپور • سابق پرنسپل، جتا کالج آف ایجوکیشن • گرانٹیڈ) چندرپور

مطبوعہ کتب:

- دائروں کے قیدی (افسانے) 1992
- اس کے لیے (افسانے) 2004
- تو می یکجہتی اور اردو شاعری (مقالات) 2004
- الو بھی بی بی کی سرائے (یک بابی ڈرامے) 2011
- یک بابی ڈرامے (حصہ اول ودوم: ڈرامے) 2012
- دنیا کارٹون اور کامک کیریکٹرس کی (سائنس) 2013
- ایک کی گیارہ کہانیاں (لوک کہانیاں) 2013
- دو کی بارہ کہانیاں (لوک کہانیاں) 2013
- تین کی تیرہ کہانیاں (لوک کہانیاں) 2013
- چار کی چودہ کہانیاں (لوک کہانیاں) 2013
- پانچ کی پندرہ کہانیاں (لوک کہانیاں) 2013

انعامات و اعزازات:

• 1993 مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کا انعام 'دائروں کے قیدی' مجموعے پر • 1996 بہار اردو اکادمی کا انعام 'اس کے لیے' افسانوی مجموعے پر۔ • 1997 صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر دیال شرما سے 'تیسرے راستے کے مسافر' مجموعے (پراہندی بھاشی) انعام • 2015 مرکزی ساہتیہ اکادمی کا ادب اطفال ایوارڈ (اردو) بچوں کے لیے یک بابی ڈرامے (حصہ اول و حصہ دوم) پر

بانو سرتاج: بیسویں صدی کے اواخر کا ادب اطفال بھی اطمینان بخش ہے تو اکیسویں صدی میں اس کے زیادہ بہتر ہونے کی امید کرنا غیر مناسب نہیں ہے۔

ش ک: مستقبل کا ادب اطفال اور ادب اطفال کا مستقبل کیسا ہوگا؟ کیسا ہونا چاہیے؟

بانو سرتاج: مستقبل کا ادب اطفال زمانے کی ضرورتوں کے مطابق ہوگا۔ بچہ ہر زمانے میں بچہ ہی رہے گا۔ اس کی بنیادی ضرورتیں بھی وہی رہیں گی۔۔ دونوں کی ضرورتوں میں تال میل ہونا چاہیے۔

ادب اطفال کا مستقبل درخشاں ہوگا۔ جس طرح انسان، باہر کے تشویش ماحول سے گھر میں بچے کی کلکاریوں اور پیاری پیاری باتوں میں چین کی سانس لیتا ہے اسی طرح ادب اطفال بھی بچوں کو زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھائے گا۔۔ نہرو جی کہتے تھے "مجھے حیرت ہے جب میں لوگوں کو ان کا مستقبل جاننے کے لیے آسمان کے تاروں کی طرف دیکھتا پاتا ہوں۔ مجھے تو جب بھی ملک کے مستقبل کو دیکھنا ہوتا ہے میں چہتے کھیلتے بچوں کی طرف دیکھتا ہوں۔" (ادب الاطفال کو بھی یہی کرنا چاہیے)۔

ش ک: ادب اطفال کی بہتری اور فروغ کے لیے کیا آپ کے ذہن میں کچھ تجاویز ہیں؟ اگر ہیں تو ہمارے ساتھ Share کریں؟

بانو سرتاج: رسائل صرف نام دیکھ کر تخلیقات شائع نہ کریں۔ صرف اور صرف عمدہ تخلیقات شائع کریں:

- پبلشرز کے پاس جو مسودہ پہنچے وہ جوں کا توں نہ شائع کیا جائے۔ ماہرین سے رائے لی جائے۔
- بچوں تک کتابیں پہنچانے پر دھیان دیا جائے بلکہ حکومت یہ ذمہ داری قبول کرے۔
- سیمینار میں ادب اطفال سے دور کا بھی تعلق نہ رکھنے والوں ہی کو مدعو کیا جائے۔ بچوں کے لیے لکھنے والوں کو مدعو کیا جائے۔
- بچوں کے لیے لکھنے والوں اور بچوں کو مدعو کیا جائے۔
- فیڈ بیک Feed back کی سہولت رکھی جائے بلکہ Presentation سے زیادہ اہمیت دی جائے۔
- ادب اطفال کی کتابوں پر ایماندار تنقید نگاروں سے تنقید کرائی جائے۔ صرف اوصاف (جو اکثر ہوتے نہیں) گنانے والوں کے ہاتھوں میں کتاب نہ سونپی جائے۔ بندر کے ہاتھ میں تلوار دینا ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے۔
- ایوارڈ کمیٹی میں ادیبوں (شاعروں، افسانہ نگاروں)، تنقید نگاروں کو شامل کیا جائے، پبلشرز کو شامل کیا جائے... بچوں کی رائے لی جائے۔

ش ک: شکریہ بانو سرتاج صاحبہ!

■

Dr. Shakuntala Kalra, N D- 57, Peetampura, Delhi - 110034, Mob.: 09868735123
Dr. Bano Sartaj, Opposite Akashwani, Civil Lines Chandrapur - 442401 (MS)

اسلم جمشید پوری

2015 کے فکشن کا منظر نامہ

2015 گزر چکا ہے۔ نیا سال بھی اب راس آنے لگا ہے۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ ماضی پر نظر رکھنے والے ہی اپنا حال اور مستقبل سنوار سکتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس نئے سال کی ادبی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے سال گذشتہ کے ادب پر نظر ڈالی جائے۔

2015 کے پورے ادب کا احاطہ نا ممکن نہیں تو از حد مشکل ضرور ہے۔اس کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہو گی۔ ہر صنف کے تفصیلی جائزے کے لیے بھی ایک کتاب کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا میں 2015 کے فکشن تک ہی محدود رہوں گا۔ ناول اور افسانے پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ممکنہ حد تک میں نے کوشش کی ہے کہ سال کے فکشن کا ایک جائزہ سامنے آجائے۔

جہاں تک 2015 میں شائع ہونے والے فکشن کا تعلق ہے تو ہمیں مایوسی نہیں ہوتی۔ اس سال ناول تو نصف درجن ہی شائع ہوئے لیکن جہاں تک افسانوی مجموعے کی بات ہے تو تقریباً دو درجن افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے۔ ناولوں میں مشرف عالم ذوقی کا ناول 'نالۂ شب گیر'، نورالحسنین کا ناول 'چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'، صادقہ نواب سحر کا ناول 'جس دن سے'، قمر جمالی کا ناول 'آتش دان' اور علی خاں کا ناول 'گئو دان کے بعد' اہم ناول ہیں۔ افسانوی مجموعے میں مظہر الزماں خاں کا 'خود کا خیال'، بشیر مالیر کوٹلوی کا 'زندگی زندگی'، سید احمد قادری کا مجموعہ 'ملبہ'، احمد صغیر کا 'کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے'، اختر آزاد کا 'خدا سے سوال'، مجتبیٰ عالم پوری کا 'بازگشت'، وسیم حیدر ہاشمی کا 'عہد گو برہنہ اعلان'، ماجد پرکاش ساحر کا 'ایک بھیگے لمحے کی لمبی سڑک'، نسرین ترنم کا 'ابر'، راقم کا مجموعہ 'عید گاہ سے واپسی' منظر عام پر آئے۔

کچھ افسانہ نگاروں کے دوسرے افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے جن میں شرافت حسین کا مجموعہ 'اکیلا شخص'، فرقان سنبھلی کا 'طلسم'، شاہد حسن شاہد کا 'چہروں کی چوری' خاص ہیں۔ اس سال کئی افسانہ نگاروں کے پہلے مجموعے کی اشاعت عمل میں آئی۔ جن میں معروف افسانہ نگار ابرار مجیب کا 'رات کا منظر نامہ'، ارشد نعیم کا 'ملتوی خواب زندگی'، محمد مستمر کا 'صدوں سے آگے'، ڈاکٹر رشید احمد کا 'منگرو' خاص ہیں۔ حمید سہروردی کے افسانوں کی کلیات 'شہر کی انگلیاں خونچکاں' اور مظفر حنفی کی کہانیوں کی کلیات 'بھولی بسری کہانیاں' بھی اس سال شائع ہونے والے افسانوی مجموعے ہیں۔

2015 کے افسانوں کا سرسری جائزہ

بشیر مالیر کوٹلوی کا شمار ہمارے عہد کے ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو افسانے بھی لکھتے ہیں اور افسانے کی باریکیوں پر بھی سخت نظر رکھتے ہیں۔ بشیر مالیر کوٹلوی بہت ٹھوک بجا کر افسانے لکھتے ہیں۔ افسانے پر ان کی فنی دسترس انھیں اپنے عہد میں ممتاز کرتی ہے۔ اس سال ان کا تازہ مجموعہ 'زندگی زندگی' شائع ہوا ہے۔ مجموعے کے کئی افسانے معروف ادبی رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ کشمیر میں آئے آبی سیلاب کی منظر کشی کرتا ہوا ان کا بے حد خوبصورت افسانہ 'پانی کا دوزخ' اپنے اختتام پر جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ بھوک جب اپنی انتہا پار کر جاتی ہے تو پھر کیا ہوتا ہے، یہ افسانے میں بخوبی دیکھا جا سکتا

ہے۔ اشتہار، شان بے نیازی اور اپنے لوگ، ان کے بے حد خوبصورت اور عمدہ افسانے ہیں۔

جیم ماہیر کوثوی نے متن بر متن یعنی کسی پرانی کہانی پر لکھی گئی کہانی کی روایت کو اختتام بخشتے ہوئے ایک نیا تجربہ کیا۔ انھوں نے اردو کے کئی معروف افسانوں کے ریمیک 2 کی شکل میں تحریر کیے۔ مثلاً ٹھنڈا گوشت2، 'سوا سیر2'، 'پیشر سنگھ2'، 'گرم کوٹ 2'، 'کفافہ2'، 'حمیدہ گاؤں2' لکھنے کا کامیاب تجربہ کیا۔ یہ روایت تو پرانی ہے۔ لیکن جیم ماہیر کوثوی نے ان افسانوں سے ان کے اصل افسانوں کی تخلیق کو 'مختصر خاکہ' کے تحت پیش کیا اور بعد میں اپنا افسانہ تحریر کیا۔ مجموعے میں ایسے نصف درجن افسانے شامل ہیں۔

جیم ماہیر کوثوی افسانچہ نگار بھی ہیں۔ اس مجموعے میں انھوں نے نصف درجن افسانچے بھی شامل کیے ہیں۔ یہ بھی اہم اور پراثر ہیں۔ 'پانی کا دوزخ' کا آخری حصہ ملاحظہ فرمائیں۔ آپ کو افسانے میں بھوک کی شدت اور اس سے پیدا ہونے والے حالات کا علم ہو جائے گا:

'گھر میں آج چاول کا دانہ بھی نہ تھا۔ قمرو نے کروٹ لی۔ اس کی سانسیں تیز تیز نکل رہی تھیں۔ چمرو خوف زدہ تھا۔ قمرو جاگا تو وہ کچھ مانگے گا۔ وہ کیا جواب دے گا اس کو۔ جتی نے چمرو کے کچھے سے اپنا ریشم کے بچا ہوں جیسا جسم رگڑا اور اپنی آواز میں شاید دہائی دی۔ چمرو قمرو پر نظریں جمائے کچھ سوچنے لگا کہ وہ بچے کو بھوک سے مرتا ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔ قمرو کو گھورتے گھورتے اس نے ایک فیصلہ لے لیا۔ آنکھیں چھت کی طرف اٹھا کر وہ بڑبڑایا۔

'یا میرے مولا... مجھے معاف کرنا... اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں...'

اس نے لپک کر سامنے پڑی چھری اٹھائی...

اور... دوسرے ہاتھ سے اپنی پیاری بلی جتی کی گردن دبوچ لی۔ اوہ...!'

[افسانہ پانی کا دوزخ، زندگی زندگی، جیم ماہیر کوثوی، ص 35-34]

'منٹو کے شہر میں' معروف افسانہ نگار مظہر الزماں خان کا تازہ مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے نصف درجن افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مظہر الزماں خان ہمارے عہد کے پختہ کار افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے 70 کے آس پاس افسانہ نگاری کی ابتدا کی۔ جدیدیت کے چند اہم اچھے لکھنے والوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ خوبصورت اور سحر انگیز اسلوب کے حامل مظہر الزماں خان قصہ آخری داستان گو کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ آپ کے افسانوں کا وصف خاص علامت نگاری ہے۔

مظہر الزماں خان کے تازہ مجموعے میں تقریباً 13 افسانے شامل اشاعت ہیں۔ جس میں 9 افسانے ایک ہی افسانہ 'تاک کے اندر' کے 9 حصے ہیں۔ یہ ایک افسانوی سیکول ہے بلکہ ہر افسانہ مکمل اور ایک دوسرے سے منسلک ہے۔ مظہر الزماں خان نے اس افسانوی سلسلے میں تاریخی واقعات خصوصاً اسلامی تاریخی واقعات کو علامتوں کی شکل میں بھی عبارت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

مظہر الزماں خان اپنے مخصوص داستانوی اسلوب کی بنا پر اپنے ہم عصروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ تاک کے اندر کا ایک پیراگراف ملاحظہ ہو:

'کسی روشنی والے کو آواز دے کر دیکھو کر شاید کوئی

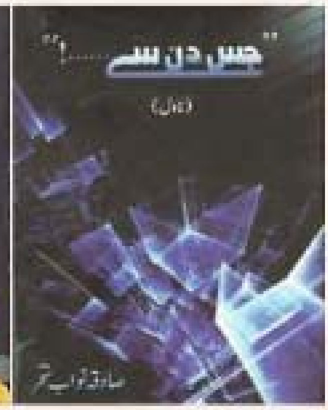

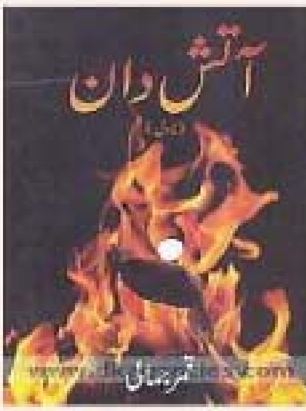

حل نکل آئے۔ تیسرے شخص نے پہلے اور دوسرے شخص سے کہا تو وہ بولے روشنی والا ہم میں اب کوئی بھی باقی نہیں ہے کہ وہ سب کے سب ہمیں چھوڑ کر ستارے بن گئے ہیں اور ہمارے ساتھ جو تھے وہ سب کے سب شاید اپنی اپنی ناقوں کے اندر پڑے اپنے آپ کو چاٹ رہے ہیں۔ لہٰذا اب روشنی اور خود کو حاصل کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کہ بڑی گہری اور تاریک رات ہم پر آ کر مسلط ہو گئی ہے البتہ ہم ایک دوسرے کو چھو سکتے ہیں اور چھو کر پہچاننے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ کیا ہم پورے کے پورے جانور بن گئے ہیں یا ہم میں کچھ آدمیت باقی ہے کیونکہ باقی رہنا ہمارے وجود کی موجودگی کا ثبوت ہے کہ ہم ابھی اس خارش یا دوزخ میں باقی ہیں۔'

[تاک کے اندر، مظہر الزماں خان]

آنند لہر معروف افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے کئی خوبصورت ناول بھی لکھے ہیں۔ ان کا تازہ افسانوی مجموعہ 'سرحد' نے بھی لکھا ہے' پانچواں افسانوی مجموعہ ہے۔ وہ پانچ ناول بھی تحریر کر چکے ہیں۔ ان کے ناولوں اور افسانوں میں جموں و کشمیر کے منظر نامے ملتے ہیں۔ دہشت گردی، دخل اندازی، سرحدوں کے پار کے حالات ان کے افسانوں کو ایک منفرد رنگ عطا کرتے ہیں۔ تازہ افسانوی مجموعہ 'سرحد نے بھی لکھا ہے' کے زیادہ تر افسانے سرحدوں کے کرب، فوج، دہشت گردی، بیوگی، شہادت وغیرہ کو پیش کرتے ہیں۔ مجموعے کا ٹائٹل افسانہ بھی دونوں سرحدوں کے پار ہونے والے غیر انسانی اعمال کی پیش کش ہے۔

'گلبہار' کے معروف افسانہ نگار سید احمد قادری کا تازہ مجموعہ ہے۔ اس سے قبل بھی سید احمد قادری کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانے ہمیں چونکاتے ہیں۔ ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ اپنے آس پاس وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو افسانوں میں فنی چابکدستی سے قلم بند کرتے ہیں۔ عالمی سطح کے حادثات و واقعات پر بھی ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسے واقعات پر افسانوی رنگ چڑھا کر انھیں کامیاب تخلیق بنا دیتے ہیں۔ مجموعہ کا ایک بے حد خوبصورت افسانہ 'ملبہ' ہے۔ جو نائن الیون پر لکھا گیا ہے۔ ہمارے یہاں اس واقعے پر کم افسانے قلم بند ہوئے ہیں۔ سید احمد قادری کا یہ افسانہ ایک ایسی لڑکی کیتھرین کی درد بھری کہانی ہے جو مارک نامی ایک لڑکے سے بے انتہا پیار کرتی ہے اور وہ دونوں جلد شادی کے بندھن میں بندھنے والے ہوتے ہیں کہ اچانک نائن الیون ہو جاتا ہے جس میں مارک مارا جاتا ہے۔ اس کی لاش تک نہیں ملتی۔ کیتھرین کا یہ درد ایسا ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ وہ آنے جانے والے مسافروں سے دل بہلا کر اپنا غم ہلکا کرتی رہتی ہے۔ لیکن درد و کرب کی لہریں اسے بھگوتی رہتی ہیں۔ افسانے کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کریں:

'جی چاہتا ہے، مجھے بھی کوئی ایسے ہی کسی ملبہ میں دفن کر دے۔ لیکن کبھی کبھی ادا سیوں کے درمیان تم جیسا کوئی مل جاتا ہے، تو جینے کی خواہش انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ لیکن میں اب جینا نہیں چاہتی۔

میں اس قدر ٹوٹ کر بکھر چکی ہوں کہ خود کو سمیٹنا چاہوں، تو سمیٹ نہیں پاتی۔ میرا پورا وجود غموں، دکھوں اور مصیبتوں کے ملبے میں دبا پڑا ہے.........

یہ کہتے کہتے وہ زاروقطار رونے لگی، اس کے چہرے پر پھیلنے والی معنی خیز مسکراہٹ غائب تھی اور اس کی سسکیاں تیز ہو رہی تھیں۔'

[ملبہ، سید احمد قادری]

احمد صغیر نئی نسل کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کے کئی ناول اور افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ وہ گلشن کے ناقد بھی ہیں۔ ان کا تازہ مجموعہ، جسے دلت افسانہ کہا گیا ہے 'کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے' کے عنوان سے منظر عام پر آیا ہے۔ اس میں ان کے یک موضوعی یعنی دلت مسائل پر مبنی افسانے شامل ہیں۔ کچھ افسانے نئے اور تازہ ہیں جب کہ بعض پرانے افسانے بھی شامل ہیں۔

احمد صغیر کے کئی افسانے سنجیدگی سے مطالعے کے متقاضی ہیں۔ 'منتظم'، 'لا کو آنے دو'، 'میں داسی نہیں ہوں'، 'شدھی کرن'، 'آگ ابھی باقی ہے'، 'پناہ گاہ'، 'سفر ابھی ختم نہیں ہوا' افسانے اپنے موضوعات کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ مجموعے کا ٹائٹل افسانہ 'کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے' دلت لوگوں پر ہونے والے مظالم کی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے۔ اس کہانی کا سب سے بڑا وصف یہی ہے کہ یہ اختتام پر بھی ختم نہیں ہوتی، بلکہ اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ کہانی کا اختتام ملاحظہ ہو:

'کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے

جب تک میں ایک کہانی مکمل کر رہا ہوں گا کوئی دوسرا گاؤں جل اٹھے گا.... کسی شہر کا کوئی محلہ ویران ہو جائے گا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ، آگ اور خون، چیخ اور پکار، خوف اور دہشت کے قدم بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اخباروں میں محض رپورٹ، محض مذمت اور بس!'

[کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، احمد صغیر، ص 128]

اختر آزاد نئی نسل کا نمائندہ افسانہ نگار ہے۔ اختر آزاد کا یہ چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل 'بانٹی کا بیٹا'، 'ایک سمپورن انسان کی گاتھا'، 'سونامی کو آنے دو' افسانوی مجموعے اور 'لیکی جیلو گرل' ایک ناول شائع ہو چکا ہے۔ اختر آزاد کا اپنا منفرد انداز ہے۔ جدیدیت کے خوبصورت اسلوب اور علامتوں کا فن کارانہ استعمال اختر آزاد کی شناخت ہے۔

'خدا سے سوال' مجموعے میں اختر آزاد کے تیرہ افسانے شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر ہندو پاک کے معتبر ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ کئی افسانے بے حد اہم اور عمدہ ہیں۔ 'پانی والا انکل'، 'خواہشات کی اندھی گلی'، 'سانپ سیڑھی'، 'صحرائی'، 'ریلٹی شو'، 'پنسل اسکیچ' ایسے ہی افسانے ہیں۔ 'ریلٹی شو' بے حد خوبصورت افسانہ ہے۔ اختر آزاد کا وصف ہے کہ وہ عصری حسیت کو اپنے افسانوں میں بڑی فن کاری سے استعمال کرتے ہیں۔ ریلٹی شو میں بھی انھوں نے ہمارے معاشرے کی دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھی ہے۔ آج ٹی وی چینلوں نے جس طرح سے بچوں سے ان کا بچپن چھین کر انہیں ایک نہ ختم ہونے والی دوڑ Race میں لگا دیا ہے۔ وہ مقام عبرت ہے۔ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کے لیے کس طرح سے والدین خود اپنے بچوں کو گہری وادی میں دھکیل رہے ہیں۔ اختر آزاد نے سماج کے ایسے ہی گھر کی کہانی پیش کی ہے۔ ایک کم عمر بچی کی والدہ کا خیال دیکھیں:

رئیلٹی شو میں بھی انہوں نے ہمارے معاشرے کی دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھی ہے۔ آج ٹی وی چینلوں نے جس طرح سے بچوں سے ان کا بچپن چھین کر انہیں ایک نہ ختم ہو نے وا لی دوڑRaceمیں لگا دیا ہے۔ وہ مقام عبرت ہے۔ زیا دہ سے زیادہ پیسہ کمانے کے لیے کس طرح سے والدین خود اپنے بچوں کو گہری وادی میں دھکیل رہے ہیں۔

'شوبھا نے جب یہ دیکھا کہ اتنی قیمت چکانے کے بعد بھی پریتی فائنل تک نہیں پہنچ پائی ہے تو اس نے اسے ماڈلنگ اسکول جوائن کرا دیا۔ ان دنوں شوبھا کے پسندیدہ چینلوں میں ایف ٹی وی جیسے کئی چینل شامل ہو گئے تھے۔ ماڈلنگ کی مقناطیسی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ کیٹ واک کرتی ادھ ننگی لڑکیوں کی طرح شوبھا پریتی کو بھی ویسا ہی کرنے کے لیے کہتی۔ بیٹا کپڑے تھوڑا اور اوپر اٹھاؤ، جسم ایک دو دنیا وہ بھی کھل جائیں تو کوئی بات نہیں۔ نمبر اسی کے تو ملتے ہیں۔ سب کچھ چھپا رہ گیا تو بے چارے جج کیا دیکھیں گے؟ نمبر کہاں دیں گے...؟'

[خدا سے سوال، اختر آزاد، ص 50]

'رات کا منظر نامہ' اس سال شائع ہونے والا ایک دیدہ زیب مجموعہ ہے جس کے خالق معروف افسانہ نگار ابرار مجیب ہیں۔ ابرار مجیب کا یوں تو یہ پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ لیکن وہ گذشتہ 30-35 برسوں سے افسانے کی زلفیں سنوار رہے ہیں۔ انھوں نے 80 کی دہائی میں افسانہ نگاری شروع کی اور ہندو پاک کے معتبر رسائل میں خوب شائع ہوئے۔ ان کی زندگی کے تقریباً 20 سال خلیجی ممالک میں بہ سلسلۂ روزگار گذرے ہیں۔ اس دوران افسانہ نگاری کی رفتار خاصی کم رہی۔ لیکن گذشتہ برس انھوں نے افسانہ نگاری کے میدان میں شاندار واپسی کی ہے۔ ادھر پھر ان کے افسانے اچھے رسائل کی زینت بن رہے ہیں۔ فیس بک پر بھی ابرار مجیب نے افسانے کے فروغ کے لیے 'عالمی افسانہ فورم' کے ذریعے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔

مجموعے میں ان کے تقریباً 15 افسانے شامل ہیں۔ یہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ضرور ہے مگر ان کے اب تک افسانوں کا انتخاب بھی ہے۔ مجموعے کے کئی افسانے اغواء، ابابیل، موت، رات کا منظر نامہ 1، رات کا منظر نامہ 2، نیل کنٹھ کی واپسی، بارش، نروان سے پرے، پچھواڑے کا نالا وغیرہ ایسے افسانے ہیں جنہیں ہم نمائندہ افسانے کہہ سکتے ہیں۔ 'پچھواڑے کا نالا' ان کا بے حد عمدہ افسانہ ہے۔ افسانے میں وقت کو کلید کی حیثیت حاصل ہے۔ نالا یعنی بہتا ہوا پانی--- یعنی وقت، یعنی نالے کا جو پانی بہہ کر ندی میں شامل ہو جاتا ہے وہ کبھی اپنے منبع و مخرج تک واپس نہیں آتا۔ بہت ہی خوبصورت نفسیاتی افسانہ ہے۔ علامتی اور استعاراتی اسلوب ابرار مجیب کی پہچان ہے۔ افسانے کا آخری پیراگراف دیکھیں:

'یہ رات جو ختم ہونے میں نہیں آتی، اس رات کا بھی انت ہے۔ یہ ختم ہو کر رہے گی۔ پھر دن کا سفر شروع ہوگا اور یہ دن بھی مر جائے گا۔ چارپائی کے نیچے رکھا ہوا بوٹ پھر میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ کل ایسے ہی بالکل نئے بوٹ مجھے اپنے پیروں میں سجا کر چمنیوں کے شہر کو جانا ہے اور پھر.......!!!

باہر پچھواڑے کا نالا ویسے ہی جھر جھر، سر سر بہتا چلا جا رہا ہے۔ چلا جا رہا ہے۔ چلا جا رہا ہے۔'

[افسانہ پچھواڑے کا نالا، ابرار مجیب، ص 18]

'بازگشت' مہتاب عالم پرویز کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ مہتاب عالم پرویز کا تعلق بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی سے ہے۔ ابرار مجیب کی طرح مہتاب عالم پرویز نے بھی اپنی زندگی کے تقریباً 20 برس معاش کے سلسلے میں سعودی عرب اور کویت میں گزارے ہیں۔ مہتاب عالم پرویز کے موضوعات میں جنسیت، دہشت گردی، فرقہ واریت، غریب الوطنی، ہجر کا کرب، خلیجی زندگی کے مسائل کو مرکزیت حاصل ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پرویز نے اپنے افسانوں میں اس نئی نسل کی نمائندگی کی ہے جو بے روزگار ہے، جنسی طور پر ناآسودہ ہے اور اپنے مستقبل کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

'بازگشت' کے کئی افسانے پوسٹ مارٹم، فیس بک، کسی نظر کو تیرا انتظار، وہ، ول پاور وغیرہ کئی اعتبار سے اہم ہیں۔ 'بازگشت' مہتاب عالم پرویز کا ایک یادرہ جانے والا افسانہ ہے۔ یہ ایک غیر مسلم کی نفسیات کا بہترین افسانہ ہے۔ فساد میں اس کی بیوی پریتی کو بربریت کا شکار بنایا گیا۔ وہ دم توڑ گئی۔ چھوٹی ارپتا، دودھ پیتی بچی بلکتی رہ گئی۔ پڑوس کی نادرہ نے اسے دودھ پلایا، پالا پوسا، فطری طور پر نادرہ کا مذہب اپنایا، جسے وہ زیبا کہہ کر پکارتی، حاوی ہوتا گیا۔ اس شخص کی نفرت، نادرہ اور زیبا کی عزت تار تار کر کے اپنا انتقام لیتی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی ایک ہولناک تصویر ملاحظہ کریں:

'پھر دور جیسے کسی بھیڑیے کے قہقہوں کا شور بلند ہوا۔ قہقہوں کے اس شور میں وہ شخص چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ دیکھو دیکھو، میں نے انتقام لے ہی لیا۔ دور بہت دور سے کہیں گیتا کے شلوک درد کی کہانیاں بیان کر رہے تھے۔ شاید بائبل کی مقدس کتاب کے سارے الفاظ، حرف حرف مٹ گئے تھے۔ آکاش پھڑ پھڑاتے ہوئے پرندوں سے ڈھک چکا تھا۔'

[بازگشت، مہتاب عالم پرویز، ص 77-76]

'گوہر پس انداز' وسیم حیدر ہاشمی کا تازہ مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے دو افسانوی مجموعے 'کرچیاں' اور 'مریخ کا سفر' شائع ہو چکے ہیں۔ وسیم حیدر ہاشمی کے افسانے سادگی میں پرکاری کی مثال ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ ہے۔ وہ بڑی معصومیت سے چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑا افسانہ بن دیتے ہیں۔ 'گوہر پس انداز' میں ان کے تقریباً دو درجن افسانے شامل ہیں۔ یہ بھی افسانے وسیم حیدر ہاشمی کی فن افسانہ نگاری پر ان کی گرفت کے غماز ہیں۔ 'گوہر پس انداز' ایک خوبصورت اصلاحی افسانہ ہے۔ افسانے میں وسیم حیدر ہاشمی نے عورت کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اسی طرح سلام روستاں ایک بہت عمدہ افسانہ ہے۔ افسانے میں قاری اس وقت مبہوت رہ جاتا ہے جب سب کی نظروں میں جاہل، ان پڑھ، دیہاتی چالاکی سے بس سے اپنے گاؤں تک فری سفر کر لیتا ہے۔

'طلسم' 2015ء میں شائع ہونے والا انجینئر فرقان سنبھلی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کا افسانوی مجموعہ 'آب حیات' 2010ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ فرقان سنبھلی نوجوان افسانہ نگار ہیں۔ ان کے موضوعات ہمارے آس پاس کی زندگی کے مناظر ہیں۔ ان کے کردار بھی ہماری ہی طرح کے انسان ہیں۔ فرقان نے سائنس فکشن کے تحت بھی کئی کامیاب افسانے لکھے ہیں۔ 'طلسم' میں 21 افسانے شامل ہیں۔ ان میں کئی افسانے مثلاً طلسم، انصاف، وراثت، آنر کلنگ، آب حیات، دائمی جہیز، شہادت کے بعد وغیرہ اچھے افسانے ہیں جو قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کرنے میں کامیاب ہیں۔

'اکیلا فن' شرافت حسین کا تازہ مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کا مجموعہ 'کنویں کے پاس' شائع ہو چکا ہے۔ شرافت حسین نے اپنے افسانوں میں مشرقی اتر پردیش کے دیہی مسائل خصوصاً بنکر طبقے کے مسائل کو خصوصیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں سادگی پائی جاتی ہے۔ 'اکیلا فن' میں ٹائٹل افسانہ میں معاشرے کی

> ناول کے ذریعے ذوقی بتاتے ہیں کہ دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ دور میں داخل ہونے کے باوجود مرد، عورت کو استعمال کی شے ہی سمجھتا ہے۔ ناول میں صوفیہ اور ناہید، دو اہم کردار ہیں، صوفیہ سہمی سہمی، ڈری ڈری سی لڑکی ہے جو رشتوں کے مکڑ جال میں محصور استحصال کا شکار ہوتی رہتی ہے جب کہ ناہید ظلم کے خلاف آواز اٹھاتی ہے۔ ناہید کی یہ آواز صرف ایک عورت کی آواز نہیں رہتی بلکہ انقلاب کی نوید بن جاتی ہے۔

تعلیم اور شادی بیاہ کے مسئلے کو عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ لڑکیوں کی شادی آج مسلمانوں کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اکثر لڑکیاں اپنی جوانی اسی انتظار میں گذار دیتی ہیں۔ مناسب تعلیم یافتہ اور باروزگار لڑکے اب نہیں ملتے ہیں۔ سعودی عرب میں ملازمت کرنے والے لڑکے ملتے ہیں جو شادی کر کے خود تو سعودی عرب چلے جاتے ہیں اور لڑکی سال یا دو سال کی تکلیف دہ انتظار کی زندگی گذارنے پر مجبور ہوتی ہے۔ شرافت حسین نے سماج کے اس مسئلے کو افسانے میں خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

شاہد حسن شاہد کا نیا مجموعہ 'چہروں کی چوری' بھی 2015ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ ویسے اسے افسانوی مجموعے کے بجائے افسانچوں کا مجموعہ کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ مجموعے میں تقریباً 34 تخلیقات شامل ہیں جن میں سے دو چار کو چھوڑ کر زیادہ تر افسانچے ہی ہیں۔ شاہد حسن کی خوبی یہ ہے کہ وہ بالکل سامنے کے واقعات کو فنی سانچے میں ڈھال کر تخلیق کرتے ہیں۔ یہ ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

ارشد نسیم کا پہلا افسانوی مجموعہ 'خواب زندگی' بھی اسی سال منظر عام پر آیا ہے۔ ارشد نسیم کی خوبی یہ ہے کہ ان کے افسانے چونکاتے ہیں۔ اختتام پر قاری حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ وہ زندگی کے واقعات کو طربیہ اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ مجموعے کے کئی افسانے فرق، بے ثمر، گناہ، فرض شناس، گرہ وہ اچھے افسانے ہیں۔ مجموعے میں افسانچے بھی شامل ہیں۔

'حدوں سے آگے' محمد مستمر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ مستمر کی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کو جنسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جنسی موضوعات کا استعمال انھیں ایک منفرد شناخت عطا کرتا ہے۔ ابتدائی ایام میں جنس مرغوب موضوع ہوتا ہے۔ لیکن مستمر فن سے واقف ہیں لہٰذا وہ دیگر موضوعات کو بھی عمدگی سے افسانہ میں پیش کرتے ہیں۔ مجموعے کے کئی افسانے نا آسودگی، شاخ مرجھا گئی، حدوں سے آگے، تحریک، میرے استاد، مستمر کی شناخت بنیں گے۔

'سعید گاہ سے واپسی' راقم الحروف کا تازہ مجموعہ ہے۔ جس میں تقریباً ایک درجن افسانے شامل اشاعت ہیں۔

2015 کے اہم ناول

'نالۂ شب گیر' 2015 میں شائع ہونے والا مشرف عالم ذوقی کا نیا ناول ہے۔ مشرف عالم ذوقی گذشتہ 4-5 برسوں سے ہر سال ایک ناول تخلیق کر رہے ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ ان کے ہر ناول کا موضوع مختلف ہوتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی اپنے ہر ناول میں سماج کی کسی نہ کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ موضوع کا نیا پن تو مشرف کا امتیاز ہے ہی ساتھ میں ان کا اسلوب بھی انھیں ہم عصروں میں ممیز و ممتاز کرتا ہے۔ ان کے گذشتہ ناولوں 'آتش رفتہ کا سراغ' اور 'لے سانس بھی آہستہ' نے مشرف عالم ذوقی کو سنجیدہ ناول نگار کے طور پر استحکام بخشا ہے۔

ان کا اس سال شائع ہونے والا ناول 'نالۂ شب گیر' کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اس ناول میں انھوں نے صدیوں سے ظلم و ستم کی شکار عورت کو مختلف طریقے سے پیش کیا ہے۔ ناول کے ذریعے ذوقی بتاتے ہیں کہ دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ دور میں داخل ہونے کے باوجود مرد، عورت کو استعمال کی شے ہی سمجھتا ہے۔ ناول میں صوفیہ اور ناہید، دو اہم کردار ہیں، صوفیہ سہمی سہمی، ڈری ڈری سی لڑکی ہے جو رشتوں کے مکڑ جال میں محصور استحصال کا شکار ہوتی رہتی ہے جب کہ ناہید ظلم کے خلاف آواز اٹھاتی ہے۔ ناہید کی یہ آواز صرف ایک عورت کی آواز نہیں رہتی بلکہ انقلاب کی نوید بن جاتی ہے۔ پاکستانی افسانہ نگار معصوم، ذوقی کے اس کردار کے بارے میں لکھتی ہیں:

'ناہید' اس تبدیل ہوتے ہوئے کردار کا نام ہے جس نے قلم چھینے سے انکار کر دیا تھا، جس نے برسوں کی تذلیل کا بدلہ لینے کی ٹھان لی تھی جس نے نہ صرف اپنی سوچ کو بدلا بلکہ اپنی صدی کو ہی بدل دیا۔ ڈکشنری بدل دی۔ قلم چھینے والی حقوق بدل دی۔ وہ جہاں تک کر سکتی تھی، اس نے کیا۔'

'نالۂ شب گیر' ذوقی کا تخلیق کردہ ایسا شاہکار ناول ہے جس میں رات کی سیاہی سے عورت کی بلند ہونے والی وہ آواز ہے جو ابتدا میں درد و غم سے لبریز لگتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ آواز اپنا سر بلند کرتی ہے اور آخر کار یہ آواز مضبوط و مستحکم ہوتی ہوئی انقلاب کی سی گھن گرج حاصل کر لیتی ہے۔

'گئودان کے بعد' 2015 کے اوائل میں شائع ہونے والا علی ضامن کا ایک اہم ناول ہے۔ یہ ناول جہاں ایک عمدہ ناول ہے وہیں ناول کی روایت میں ایک تجربہ اور اضافہ بھی ہے۔ متن پر متن کے پیش نظر اردو میں متعدد افسانے تخلیق ہوئے ہیں۔ مثلاً بجوکا (سریندر پرکاش)، عید گاہ (عابد سہیل)، کابلی والا کی واپسی (انور قمر)، بادبو (شوکت حیات)، ایک اور کفن (اشتیاق سعید)، اکیسویں صدی کی نرملا (اشرف جہاں)، عید گاہ سے واپسی (اسلم جمشید پوری)، ٹھنڈا گوشت 2، لحاف 2 وغیرہ (بشیر مالیر کوٹلوی) افسانے کی یہ روایت ناول میں بھی شروع ہو سکتی ہے۔ یہ کسی نے خیال نہیں کیا تھا۔ لیکن علی ضامن نے 'گئودان کے بعد' تحریر کر کے ناول کی اس روایت کی مضبوط و مستحکم شروعات کی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر مجاور حسین ناول کے تعلق سے لکھتے ہیں:

'ناول نگاری کی دنیا میں کم از کم یہ تجربہ کرنے والا بالکل نیا نام ہے لیکن جب میں نے اسے پڑھا تو اس سے یہ اندازہ ہوا کہ یہ بہت ہی کہنہ مشق، منجھا ہوا ناول نگار ہے، جس نے اردو میں پہلی بار ایک مکمل ناول کو بنیاد بنا کر اسی کے کرداروں کو آگے بڑھاتے ہوئے خود ایک ناول تصنیف کیا ہے۔'

[فلیپ کور، گئودان کے بعد، علی ضامن]

علی ضامن نے پریم چند کے ناول 'گئودان' کے زیادہ تر کرداروں (ہوری اور دھنیا کو چھوڑ کر کیونکہ یہ دونوں گئودان میں مر جاتے ہیں) کو ان کے فطری انداز میں آگے بڑھایا ہے۔ گئودان پریم چند کے انتقال سے کچھ دنوں قبل 1936 میں تحریر ہوا۔ علی ضامن کا ناول 1936 سے شروع ہو کر صبح آزادی 15 اگست 1947 تک کے زمانے پر پھیلا ہوا ہے۔ جس طرح پریم چند کے ناولوں میں ایک وسیع سیاسی منظر نامہ ملتا ہے۔ 1936 سے 1947 تک کی سیاسی صورت حال، مسلم لیگ، کانگریس کے جلسے جلوس، تحریک آزادی کے نشیب و فراز سے گذرتا ہندوستانی سماج ناول کا حصہ ہے۔ ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

'مجمع میں بابوؤں اور مزدوروں کی کثرت تھی جنھیں آزادی کی حقیقی اہمیت کا اندازہ تھا، اس کے سچے معنوں کا احساس۔ کچھ تو وہاں تفریحاً آئے تھے اور کچھ تفریح کرنے والوں کے ساتھ۔ باقی لوگ وہ تھے جنھیں مجمع بازی کا شوق تھا۔ ان سب کے علاوہ کچھ ایسے بھی تھے جنھیں واقعی کانگریس کی تحریک آزادی نے بیدار کر دیا تھا۔ انھوں نے غفلت اور غلامی کے لباس کو تار تار کرنے کا عزم کر لیا تھا اور سر سے کفن باندھ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔'

[گئودان کے بعد، علی ضامن، ص 140]

2015 میں شائع ہونے والے اس اہم ناول کا استقبال ہونا چاہیے۔

'چاند ہم سے باتیں کرتا ہے' معروف فکشن نگار نور الحسنین کا بے حد خوبصورت ناول ہے۔ نور الحسنین کا شمار ۷۰ء کے بعد والی نسل سے ہی ہے۔ وہ اچھے اور منجھے ہوئے افسانہ نگار اور بہترین ناول نگار ہیں۔ 'گڑھی میں اترتی شام' کے حوالے سے ان کی شہرت سے سب واقف ہیں۔ اس سے قبل دو ناول 'اہنکار' اور 'ایوانوں کے خوابیدہ چراغ' لکھ کر نور الحسنین نے خود کو بہتر ناول نگار ثابت کیا ہے۔ نور الحسنین کا وصف ہے کہ وہ تاریخ کی سنگلاخ زمینوں پر محبت کے پھول کھلاتے ہیں۔

'چاند ہم سے باتیں کرتا ہے' نور الحسنین کا رومانی ناول ہے۔ اس ناول میں مرکزی کردار کوئی گوشت پوست کا انسان نہیں بلکہ عشق اس کا مرکزی کردار ہے۔ باقی سب کردار ضمنی ہیں اور ناول کو یادگار بناتے ہیں۔ یہ ناول 500 قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے اور محبت کی وادیوں، الفت کے ریگزاروں، عشق کے کہساروں کی سیر کراتا ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم کوئی تاریخی فلم دیکھ رہے ہیں اور فلم میں لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کا عشق ہمارے سامنے ہے۔

تاریخی ناول لکھنا یا تاریخی پس منظر میں کہانی بننا کوئی کھیل نہیں، ہماری نسل میں نور الحسنین نے اس کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ 'ایوانوں کے خوابیدہ چراغ' میں بھی نور الحسنین نے 1857 کے واقعات و حادثات اور عشق و معاشقے کو اس طور پر قصہ کیا تھا کہ قاری مدہوش ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ اس ناول میں بھی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ نور الحسنین 'چاند ہم سے باتیں کرتا ہے' میں زیادہ کامیاب ہیں۔ ان کے قلم کی جولانیاں قصے کو نہ صرف بیان کرتی ہیں بلکہ اسے انسانی زندگی کا فلسفہ بنا کر پیش کرتی ہیں۔ ناول کی ابتدا ملاحظہ کریں:

'میں عشق ہوں، میں اپنے خالق کا کرشمہ ہوں، جنون میرا مزاج، وفا اگر میری سلطنت ہے تو سرکشی اور بغاوت میری صفت، میں ازل سے ہوں اور ابد تک باقی رہوں گا۔ میرا پہلا جلوہ کائنات کی تخلیق کا بہانہ ہے۔ اس کی حمد و ثنا میں غرق ملائکہ میری ہی ڈوری میں بندھے ہوئے ہیں۔ وہ آسمان سے زمین پر مجھے بھیجنا چاہتا تھا، اس نے مجھے آدم اور حوا کی آنکھوں میں روشن کیا اور پھر ان کے ساتھ ہی مجھے بھی زمین پر اتار دیا..... تب سے آج تک میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا ہوں۔'

['چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'، نور الحسنین، ص 10]

صادقہ نواب سحر کا تازہ ناول 'جس دن سے' بھی اسی سال شائع ہوا ہے۔ صادقہ نواب ناول نویسی کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری اور شاعری بھی کرتی رہی ہیں۔ اس سے قبل ان کے ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' نے ناقدین اور قارئین میں خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ 'جس دن سے' ان کا ایسا ناول ہے جس میں آج کے حالات ہیں۔ خاندانی تقسیم، رشتوں کی پامالی اور اس کے بعد کی اضطرابی کیفیت کو صادقہ نواب نے عمدگی سے ناول میں پیش کیا ہے۔ یہ ایک ایسے بد قسمت لڑکے جتیش (جیتو) کی کہانی ہے جس کی ماں، اس کے بھائی کو لے کر اسے اور باپ کو چھوڑ کر کسی دوسرے مرد کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔ باپ بھی ایک نہیں دو دو عورتیں گھر میں لے آتا ہے۔ جیتو کو ان حالات میں اپنی زندگی شروع کرنی پڑی۔ نتیجہ وہی کہ وہ بارہویں میں متعدد بار فیل ہوا۔ ہر جگہ ناکامی اس کے ساتھ رہی۔ ایل ایل بی کرنے کی ٹھانی تو وہاں بھی کئی سال ناکام ہوتا رہا۔ باپ کا حال دیکھتے ہوئے شادی نہیں کرتا ہے، نہ کوئی دوست، نہ محبوب، ایسے حالات میں نہ کوئی غم گسار، نہ ہمدرد۔ دو ایک چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں۔ لیکن نتیجہ صفر ہی رہا۔ ناول کے تعلق سے معروف فکشن نگار رتن سنگھ کا خیال ہے:

'گٹھے ہوئے واقعات، چست جملے، نفسیاتی اعتبار سے حقیقی تجزیہ اور فکری سطح پر مکمل کہانی، صرف جیتو کی داستان ہی نہیں رہ جاتی بلکہ یہ داستان اس ملک کے ان لاکھوں کروڑوں گھروں کی داستان بن جاتی ہے، جہاں زندگی اسی قسم کے بدنما حالات کا شکار ہو کر اندھیروں میں بھٹکتی رہ جاتی ہے۔'

[ناول 'جس دن سے'، صادقہ نواب سحر]

رسائل وجرائد میں افسانے

2015 میں اردو کے خاص اور اہم رسائل میں افسانے خاصی تعداد میں شائع ہوئے ہیں۔ سرکاری رسائل میں افسانوں کی کبھی کمی نہیں ہوتی مگر سہ ماہی اور غیر سرکاری رسائل کی جب سے بھرمار ہوئی ہے، رسائل نکالنے والوں کو عام طور پر افسانوں کی کمی کا رونا روتے دیکھا گیا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ شاعری کے مقابلے نثر لکھنے والوں کی تو ہر عہد میں کمی رہی ہے۔ لیکن موجودہ صدی میں نثر خصوصاً فکشن نگاروں کی تعداد خاصی کم ہے۔ ہمارے زیادہ تر افسانہ نگار اپنے تازہ افسانے پہلی فرصت میں ایسے رسائل وجرائد میں شائع کرنے کے لیے بھیجتے ہیں جو معاوضہ دیتے ہیں اور جن کی تعداد اشاعت بھی خاصی ہو۔ جب ان رسائل سے افسانے واپس آتے ہیں تو پھر غیر سرکاری رسائل میں ارسال کرتے ہیں۔ بہر حال اس سال افسانے شائع ہونے کی رفتار میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ میرے سامنے آجکل، ایوان اردو، کتاب نما، انتساب، اسباق، رنگ، شاعر، نیا دور، آمد، ثالث، مژگاں، سلسلہ، دربھنگہ ٹائمز، ذہن جدید، عالمی انوار تخلیق، امید سحر، فکر وتحریر، زبان وادب، روح ادب، جہاں نما، سب رنگ، نگین، پیش رفت، تحریک، لاریب، شیرازہ، راوی، صدف، فروغ ادب، جیسے ہندوستانی رسائل کے متعدد شمارے پھیلے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بیرون ممالک سے شائع ہونے والے رسائل اجراء، روشنائی، قرطاس، ارتقاء، تخلیق، اجمال (پاکستان)، احساس (جرمنی) کے شمارے بھی ہیں۔ ان رسائل میں پاکستان کے علاوہ ہندوستان کے افسانہ نگاروں کے افسانے بھی کثرت سے شائع ہوتے ہیں۔ ایسا ہی معاملہ ہندوستانی رسائل کا بھی ہے کہ ان رسائل میں پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک کے افسانہ نگاروں کے افسانے بھی شائع ہوتے ہیں۔ 2015 کے رسائل میں شائع شدہ افسانوں کے مطالعہ سے ایک بات بہت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ہمارے وہ افسانہ نگار جنھیں آج تک نئی نسل کے افسانہ نگار مانا جاتا ہے، جنھوں نے 70 کے آس پاس لکھنا شروع کیا، ان میں سید محمد اشرف، شوکت حیات، ابن کنول، نگار عظیم، ترنم ریاض، انیس رفیع، طارق چھتاری، حمید سہروردی، بیگ احساس، انجم عثمانی، انور نزہت، محسن خان وغیرہ میں سے کئی کے افسانے بہت لمبے عرصے سے شائع نہیں ہوئے ہیں۔ بعض کے اکا دکا افسانے رسائل میں نظر آجاتے ہیں، جب کہ اس نسل سے قبل کے کئی افسانہ نگار عابد سہیل، اقبال مجید، رتن سنگھ، نعیم کوثر اور کچھ اسی نسل کے افسانہ نگار ذکیہ مشہدی، نور الحسنین، غضنفر، حسین الحق، مشتاق احمد نوری، عبد الصمد، بشیر مالیر کوٹلوی، اقبال حسن آزاد، سلام بن رزاق، شموئل احمد، عظیم راہی، دیپک بدکی اور کچھ بعد کی نسل میں مشرف عالم ذوقی، ایم مبین، احمد صغیر، اختر آزاد، اشتیاق سعید، ابرار مجیب، اسلم جمشید پوری، پرویز شہریار، پرویز اشرفی، نیاز اختر، شاہد اختر، تبسم فاطمہ، شائستہ فاخری، ثروت خان، سلمیٰ صنم، کہکشاں پروین وغیرہ کے افسانے اکثر رسائل میں نظر آجاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور نسل

> **کمپیوٹر انٹر نیٹ کے عہد میں انسانی زندگی کے مسائل بھی تبدیل ہو ئے پھر قومی اور بین الاقوامی سطح پر دہشت گردی کی نئی نئی شکلیں سامنے آرہی ہیں۔ ان سب پر افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ پیار اور محبت بھی نئے نئے ذائقوں میں پرو ئے جا رہے ہیں۔ فیس بک، ای میگزین اور دیگر ادبی سائٹس پر افسانوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو رہا ہے اور انٹر نیٹ پر تو عالمی سطح کا ایک پلیٹ فارم سامنے آرہا ہے۔**

افسانے میں قدم جما رہی ہے۔ اکثر رسائل میں ان کے افسانے بھی نظر آتے ہیں، صغیر افراہیم، صدف اقبال، ذاکر فیضی، ترنم جہاں شبنم، غزالہ قمر اعجاز، شبیرہ سوری، حنیف خان، سیمی کرن، ابوبکر عباد، محمد مستمر، تسنیم فاطمہ، نشاں زیدی وغیرہ کے افسانے رسائل کی زینت بن رہے ہیں۔

گزشتہ برس یعنی 2015 میں شائع ہونے والے سیکڑوں افسانوں، درجنوں افسانوی مجموعوں اور افسانہ نگاروں کے گوشوں کے مطالعے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ ان افسانوں کے موضوعات کثیر جہتی ہیں۔ بعض بالکل نئے موضوعات ہیں۔ کمپیوٹر انٹرنیٹ کے عہد میں انسانی زندگی کے مسائل بھی تبدیل ہوئے ہیں پھر قومی اور بین الاقوامی سطح پر دہشت گردی کی نئی نئی شکلیں سامنے آرہی ہیں۔ ان سب پر افسانے لکھے جارہے ہیں۔ پیار اور محبت بھی نئے نئے ذائقوں میں پروئے جارہے ہیں۔ فیس بک، ای میگزین اور دیگر ادبی سائٹس پر افسانوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو رہا ہے اور انٹرنیٹ پر تو عالمی سطح کا ایک پلیٹ فارم سامنے آرہا ہے۔ متعدد افسانہ میلے، افسانوی نشست کے انعقاد اور اس میں افسانہ نگاروں کی کثیر تعداد میں حصہ داری سے ایک بات تو واضح ہوگئی ہے کہ افسانہ کے مستقبل کو لے کر منفی رخ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انٹرنیٹ کا معاملہ ہو یا رسائل وجرائد اور افسانوی مجموعوں کی اشاعت کی بات ہو، ایک نسل تربیت پا رہی ہے اور افسانے کو اپنے طور پر صحت مند سمت میں لے جا رہی ہے۔

اس سال مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہونے والے چند اہم افسانوں کے نام اس طرح ہیں۔ جنگ (عابد سہیل) کوشش جاری ہے (رتن سنگھ)، روح کا سرگم (نعیم کوثر)، بجز کا چھتا (غضنفر)، پانی کا دوزخ (بشیر مالیر کوٹلوی)، ایک زخم خوردہ چھپکلی (اقبال مجید)، بھرم (عبد الصمد)، ساعتوں کا چور (حسین الحق)، لمبی ریس کا گھوڑا (مشتاق احمد نوری)، ایک ماندگی کا وقفہ (مشرف عالم ذوقی)، شجر پناہ (مظہر الزماں خاں)، گڑیا (ف س اعجاز)، ہار جیت (صغیر افراہیم)، آشا (اسلم جمشید پوری) بجھی آگ (اظہر مسعود خاں)، سوئے فردوس زمیں (عارف نقوی)، امید (ایم مبین)، فرنگی (اشتیاق سعید)، حرامی (اختر آزاد)، بٹ گئی جب زمین (سیف الرحمن عباد)، بھکارن (محمد قیوم میو)، لالۂ صحرائی (صابرہ مانی)، یادوں کی بارات (قمر جہاں)، چیخ (نیاز اختر)، وہ بے وفا کس کا ہوا (ابوبکر عباد)، عید کا جوڑا (رضا جعفری)، ناسور (کمال احمد)، چوراہے پر کھڑا آدمی (انور امام)، الم آشنا دل (دیپک بدکی)، شاہ محمد کا تانگہ (علی اکبر ناطق)، مٹی کی خوشیاں (سکین علی) رات کا منظر نامہ (ابرار مجیب)، سانسوں کے درمیان (بیگ احساس)، آخری لائن (صغیر رحمانی)، ڈیتھ سرٹیفکیٹ (طبراج بخشی)، بددعا کرنے والے (سلیم سرفراز)، نیکی (نعیم بیگ)، سیڑھیاں (طلعت زہرہ)، اناکونڈا (علم اللہ)، بھور بھئی جاگو (نور الحسنین)، ماحول (ثروت خان)، آفندی کا بیٹا (شائستہ فاخری)، بلی لوٹن (ناصر راہی)، خانہ بدوش (پیغام آفاقی)، پہاڑ، ندی، عورت (خورشید حیات)، گزرتے موسم کی تپش (ترنم جہاں شبنم)، صحرا میں نہیں رہنا (تبسم فاطمہ)، بانجھ (صدف اقبال) میں اور میرا باس (شبیر احمد)، نکھل ناکھل (فیروز عابد)، عجائب گھر کا طوطا (وحشی سعید)، سیاست کی کالا بازاری (ایم رحمٰن)، طلسم (فرقان سنبھلی)، بھورے سید کا بھوت (احمد رشید)، دائروں کے اسیر (رفیع حیدر انجم) وغیرہ۔

اس طرح 2015 کے فکشن نے اردو فکشن کی ثروت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

■

Dr. Aslam Jamshedpuri, HOD, Urdu, CCS University, Meerut
aslamjamshedpuri@gmail.com
Mob.: 09456259850

معین الدین عثمانی

مشرقی پنجاب کے اردو افسانے پر تقسیم کے اثرات

کوئی اکائی جب اپنے قدرتی روپ میں ہوتی ہے تو اس کا رنگ روپ اور خوبصورتی اپنے آپ میں ایک مثال ہوتی ہے۔ انسان ان قدرتی اکائیوں سے شروع ہی سے مستفیض ہوتا آیا ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انھیں قدرتی اکائیوں کے سبب اس کی زندگی میں رونق ہے۔ جب تک یہ اکائیاں قدرتی خدوخال میں رہتی ہے انسانی زندگی بھی پروان چڑھتی رہتی ہے مگر جب جب بھی حضرت انسان نے قدرت کے معاملات میں دخل اندازی کی ہے اس کی زندگی میں بھی اتھل پتھل ہوئی ہے۔ پھر یہ معاملہ زمینوں کا ہو یا ندی نالوں پہاڑوں کا ہو یا درختوں کا انسان نے ہر جگہ ہزیمت اٹھائی ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ قدرت کے آگے انسان بے بس اور مجبور ہے۔

زمین کے جس حصے پر بھی ہم رہتے ہیں عرصہ گزرنے کے بعد وہ ہماری زندگی کا اٹوٹ حصہ بن جاتا ہے۔ نامعلوم طریقے سے اس زمین کے کھیت کھلیان، ندی نالے میدان حتیٰ کہ درختوں سے پیدا ہونے والے پھول اور ہواؤں سے بھی ہمارا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ ہم اس زمین کے ذرّے ذرّے کو ٹوٹ کر چاہنے لگتے ہیں۔ یہ ایک ایسا رشتہ ہے جس سے انسانی زندگی پر بہار ہے اس کے قیام سے چہار سو سکون ہے، امن ہے۔ مگر جب کبھی اس رشتہ میں دراڑ آتی ہے تو انسانی زندگی بے کیف اور بے نور بن جاتی ہے۔ انسانی زندگی میں زمین سے وابستگی کا یہ رشتہ گھر کی چہار دیواری سے لے کر ملکوں کی سرحدوں تک پھیلا ہوا ہے۔ گھر کی چہار دیواری جب تقسیم کے عذاب سے دوچار ہوتی ہیں تو افراد خاندان متاثر ہوتے ہیں مگر جب یہ تقسیم ملکی سرحدوں کو عبور کر کے اوج پاتی ہے تو پوری معاشرت اور سماج متاثر ہوتا ہے۔ اس کے اثرات صدیوں تک انسانی زندگی میں سائے کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

تقسیم اگر قدرتی نظام سے متعلق ہے تو انسان اس سے سرخ روئی نہیں پاتا ہے۔ مگر جب یہی تقسیم انسانی تفرقہ اور نفرت کی بنیاد پر ہوتی ہے تو انسانی رشتوں کی ڈور ڈھیلی ہی نہیں کمزور ہو کر ٹوٹنے لگتی ہے۔ رواداری، بھائی چارگی اور محبت کے جذبات ماند پڑنے لگتے ہیں۔ انسانی برتاؤ کی یہ تبدیلی نسل در نسل اذہان میں کسی مرض کی طرح سماجی، سیاسی حتیٰ کہ مذہبی بنیادوں کو بھی کھوکھلا کر دیتی ہے۔ ایسے حالات میں انسانی بربریت کا وہ مظاہرہ ہوتا ہے جسے دیکھ کر شیطان کا سر بھی شرم سے جھک جاتا ہے۔

انسان کا یہ عمل ہمیشہ سے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اس کی ایک زندہ مثال برصغیر ہند و پاک ہے۔ سیاسی عزائم کے تحت مذہبی بنیادوں پر عرصہ پہلے یہ عمل ہوا ضرور مگر اس آگ کی لپٹیں آج بھی دونوں طرف کی سرحدوں کے درمیان محسوس کی جاسکتی ہے۔ سات دہائیوں کا عرصہ گزرنے کو ہے مگر تیسری نسل بھی اس کے اثرات دیکھ رہی ہے۔

سنہ 1947 ہند و پاک کے لیے محض ایک سنہ ہرگز نہیں بلکہ یہ ایک علامت ہے افراد کی داخلی اور خارجی زندگی کے تجربات کی۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم کے بعد کی نسل میں عام طور پر بے بسی، بے یقینی اور عدم تحفظ کا احساس اس قدر عام ہے کہ انسانی رشتوں کے بکھرنے اور زندگی کی مسرت کے کھونے کا انھیں ذرا بھی احساس نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ دونوں ممالک میں کئی سطحوں پر بے شمار الجھنیں پیدا ہوئی ہیں۔

تقسیم ہند، مہاجرین کے مسائل، فرقہ وارانہ فسادات، عورتوں اور بچوں کے اغوا اور گمشدگی کے واقعات یہ ایسے موضوعات ہیں جن پر افسانے خاصی تعداد میں تحریر کیے گئے۔ لیکن ان میں ایک افسانے کی

طرح ایسی بھی ہے جس میں جبر کی طرف نشاندہی کی گئی ہے تیز حالات اور واقعات پر اظہار افسوس کے ساتھ ظاہر ہونے والی درندگی، فرقہ پرستی، بے رحمی، ظلم اور مہاجرین کے معاملات سے صرف آگہی ہی نہیں ایک طرح کی بے بسی اور لاچارگی کا احساس بھی دکھائی دیتا ہے۔

چونکہ یہاں سرزمین پنجاب سے وابستہ افسانہ نگاروں کے محض تقسیم سے متعلق افسانوں کا ذکر مقصود ہے اور اس مختصر تحریر میں سبھی افسانہ نگاروں کی ساری تخلیقات کا احاطہ کرنا ممکن بھی نہیں ہے لہٰذا چند اہم افسانہ نگاروں کی چند تخلیقات پر ہی اجمالی گفتگو ہوگی۔

غالباً میری رائے سے سبھی حضرات اتفاق کریں گے کہ اس موضوع کا حق دل جمعی سے ادا کرنے والا اگر کوئی فنکار گزرا ہے تو وہ ہے سعادت حسن منٹو۔ منٹو کی تحریر کی بے باکی سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اس کا حقیقت پسندانہ انداز تحریر کیسے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ وہ جب بھی بات کرتا ہے دوٹوک انداز میں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریر میں آج بھی زندہ، تابندہ اور تازہ دم محسوس ہوتی ہے۔ تقسیم سے متعلق اس کا افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' ایسا لازوال شاہکار ہے جس کی نظیر اردو دنیا آج تک نہیں دے سکی ہے۔ اس نے تقسیم کے عمل کو غیر فطری قرار دیا ہے اور منطقی طور پر اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس افسانے میں پاگلوں کی تقسیم اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ ایک غیر فطری حرکت ہے۔ اس افسانے میں ایک پاگل درخت پر چڑھ کر یہ کہتا ہے کہ "میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔ میں اسی درخت پر رہوں گا۔"

کچھ دیر بعد جب اس کی کیفیت نارمل ہوتی ہے تو وہ درخت سے نیچے اتر کر اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل کر رونے لگتا ہے وہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

اس افسانے کا مرکزی کردار جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا اوندھے منہ لیٹا تھا۔ ادھر ہندوستان تو ادھر پاکستان درمیان میں ٹکڑا جس کا کوئی نام نہ تھا وہاں ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ منٹو تقسیم کو غیر فطری تسلیم کرتے تھے۔

تقسیم کی بربریت کو ظاہر کرنے والا منٹو کا شاہکار افسانہ 'کھول دو' بھی ہے۔ اس کا اختتام اس قدر پُر اثر ہے کہ بقیہ حصے کو اگر فراموش کیا جائے تو بھی بے جا نہ ہوگا۔ زیادہ تر گرفت اس کے اختتام والے حصے پر ہوتی ہے۔ یہ افسانہ زندگی سے ماخوذ ہے جو ایک لڑکی کی یہ حالت

کس نے کی تھی؟ اس سوال کی گونج آج بھی ادب کے سیاسی ایوان میں سنائی دیتی ہے۔

دوسری طرف 'سیاہ حاشیے' کے عنوان سے جو تحریریں آئی ہیں حقیقت پسندی کا جیتا جاگتا ثبوت فراہم کر کے انسانیت کو شرمسار کر گئی ہیں۔

افسانہ 'موتری' میں منٹو نے جو نقشہ کھینچا ہے ذرا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

"تیسری بار پھر اسے موتری میں جانا پڑا۔ پیشاب کرنے کے لیے نہیں۔

ناک پر رومال رکھ کر بند سانس بند کر کے وہ غلاظتوں کی اس کوٹھری میں داخل ہوا۔

فرش پر کیڑے چل رہے تھے۔ دیواروں پر انسان کے شرمناک حصوں کی نقاشی کرنے کے لیے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔

وہ تو فسادی کی تہہ میں جا کر فسادی کو آشکار کر کے اُسے پڑھنے والوں کے سپرد کرتا ہے۔"

منٹو کے معاصرین میں احمد ندیم قاسمی بھی تھے۔

"ڈاکٹر انیس ملک نے احمد ندیم قاسمی کے افسانے 'پرمیشر سنگھ' کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے پرمیشر سنگھ کو انسان نوازی کے دیوتا کے طور پر پیش کیا ہے اور اختر کو پجاری قرار دیتے ہوئے اس کی ان آسودگی کی راہ بڑی خوب صورتی سے نکالی ہے۔ گویا نقطۂ نظر سے یہ افسانہ دراصل مذہبی اور اخلاقی رجحانات کی ہم وزنی پیش کش ہے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ اسے تو بس احمد ندیم قاسمی کے فن کا کمال ہی گردانا جا سکتا ہے کہ پرمیشر سنگھ اپنے ہم مذہب اور گھر والوں کی مخالفت کے باوجود ایک ننھے سے مسلمان لڑکے کی دیکھ بھال اور حفاظت کرتا ہے اور آخر میں اس سلسلے میں خود گولی کا نشانہ بنتا ہے۔

تقسیم سے متعلق اس کا افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' ایسا لازوال شاہکار ہے جس کی نظیر اردو دنیا آج تک نہیں دے سکی ہے۔ اس نے تقسیم کے عمل کو غیر فطری قرار دیا ہے اور منطقی طور پر اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس افسانے میں پاگلوں کی تقسیم اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ ایک غیر فطری حرکت ہے۔ اس افسانے میں ایک پاگل درخت پر چڑھ کر یہ کہتا ہے کہ "میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔ میں اسی درخت پر رہوں گا"

سعادت حسن منٹو

جب وہ آہستہ آہستہ باہر نکلا تو اُسے یوں لگا کہ اسے بدبوؤں کے اس گھر میں ایک بے نام سی مہک آئی تھی۔ صرف ایک لمحے کے لیے۔

اس کے علاوہ منٹو نے اس موضوع پر ٹھنڈا گوشت، سہائے، موذیل، شریفن، گورمکھ کی وصیت، حلفیہ بیان وغیرہ بھی تحریر کیے۔

اس ضمن میں زبیر رضوی نے بڑی سچی کی بات کہی ہے "کہ ان کے مطابق اردو میں فسادات پر لکھی تحریر ایسے سانحے اور حادثے کن کر پڑھنے والے کے دل میں ایک گہری دردمندی کے جذبے کو ابھارتی ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہے وہ بیتا ہوا زیادہ ہے دیکھا اور سنا ہوا کم ہے۔ ایسے سانحے اور حادثے جب دل سے گزر کر جانے کی صورتوں میں ڈھلتا ہے تو نوحہ گری کی طرح رلاتا نہیں۔ حوادث کو جھیل جانے اور ہوا کی زد پر جلتے ہوئے چراغ کی لو کو ہتھیلیوں کی اوٹ سے روکنے کی تحریک دیتا ہے۔

دراصل ادب کی عظمت ہی اس بات میں ہوتی ہے کہ وہ محض فسادات کی تفصیلات ہی بیان نہیں کرتا بلکہ

افسانے کے آخری حصے میں جس درد کو لفظوں کا جامہ پہنا کر پیش کیا گیا ہے اس سے پتھر دل انسان کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

"ترم ہواتی کے دائرے پر اس جھرمٹ سے لڑ رہی تھی۔ اور ننھا سا اختر اور وصولی کی ڈاڑھی پر ایک لمبے ترنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔ پرمیشر سنگھ اس پگڑی کا اسے تھیلے پر بٹھا رہا اور جب اختر کا لفظ ختم سن کیا تو وہاں سے اتر آیا۔

اور پرمیشر سنگھ کا یہ جملہ کس قدر درد آمیز ہے:

"مجھے کیوں مارا تم نے۔ میں تو اختر کے کیس کا بھول گیا تھا۔ میں اختر کیس کو اُدھر سپاہی سے آیا تھا یار۔

اور اختر بھاگا آ رہا تھا۔ اس کے کیس ہوا میں اڑ رہے تھے۔

عورتوں پر ہونے مظالم کو منٹو کے بعد بیدی نے نہایت حساس طریقے سے بیان کیا ہے۔ اردو افسانے میں انسانی رشتوں کی پامالی کی روداد کئی لوگوں نے دوہرائی ہے مگر بیدی نے عورت کے اغوا کی داستان اسے لطیف

اور حساس طریقے سے بیان کی ہے کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ بیدی انسانی نفسیات کے ماہر تھے۔ "لاجونتی" کے توسط سے رشتوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی جو داستان انھوں نے پیش کی ہے اُسے پڑھ کر قاری کا حیرت زدہ ہونا یقینی فطری ہے۔

عورتوں پر ہونے مظالم کو منظر کے بعد بیدی نے نہایت حساس طریقے سے بیان کیا ہے۔ اردو افسانے میں انسانی رشتوں کی پامالی کی روداد کئی لوگوں نے دہرائی ہے مگر بیدی نے عورت کے اغوا کی داستان اتنے لطیف اور حساس طریقے سے بیان کی ہے کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ بیدی انسانی نفسیات کے ماہر تھے۔ لاجونتی کے توسط سے رشتوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی جو داستان انھوں نے پیش کی ہے اسے پڑھ کر قاری کا حیرت زدہ ہونا یقینی فطری ہے۔

کرشن چندر

تقسیم کی کرب ناک داستان اور کرشن چندر کے اسلوب نے افسانے کی تاثیر کو دو چند کر دیا ہے اور اپنی بات کہنے سے ہمیشہ کی طرح یہاں بھی انھوں نے گریز نہیں کیا ہے۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ اس کا مرکزی کردار کوئی فرد نہیں ہے بلکہ ریل گاڑی ہے کرشن چندر نے ریل گاڑی کو اظہار کا واسطہ بنایا ہے اور مخصوص فرقے کی عورتوں اور مظلوموں کے ساتھ ہر اسٹیشن پر جو شرمناک حرکتیں ہوئیں اس کا منظر بڑی فنکاری سے کھینچا ہے۔

سندر لال اپنی لاجونتی کے اغوا کے بعد اس کی یاد میں آنسو بہاتا۔ جلسے کے بعد اراپیڈ کرنے کا دل میں عہد بھی کرتا ہے۔ محبت سے پیش آنے کا وعدہ بھی کرتا ہے مگر جب لاجونتی اسے دوبارہ مل جاتی ہے تو اسے گھر میں تو جگہ دے دیتا ہے مگر دل میں جگہ نہیں دے پاتا۔ ماضی و حال کی کش مکش میں سندر لال کی شخصیت کی مختلف پرتوں کو کھولنے والا یہ شاہکار افسانہ اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔

اسی طرح اس دور کے قلم کاروں میں ایک نام اپندر ناتھ اشک کا بھی ہے جو کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اپندر ناتھ اشک کے افسانوں میں مشاہدے کی گہرائی صاف دکھائی دیتی ہے۔

وہ سماجی افسانے کو آپ بیتی کا روپ دینے میں مہارت رکھتے تھے۔ زندگی حقائق کو سامنے رکھ کر انھوں نے تقسیم کے بعد کے حالات میں جو سماجی فسادات ہوئے ان کو اپنی نفسیات کے ساتھ انجام دیتے ہیں اس کی گرہ "ٹیبل لینڈ" جیسے افسانے میں بڑے ہی واضح انداز میں کھولی ہے جسے پڑھ کر اس وقت کے حالات اور معاشرہ کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ افسانے کا یہ ٹکڑا دیکھیے:

"بات ختم کرتے کرتے بزرگ کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔ اس وقت نہ جانے دیپا کو کیا ہوا کہ وہ سیٹھ ہیرالال سے کیا گیا اپنا عہد بھول گیا۔ جیب سے اس نے ایک کم پانچ سو کے نوٹ اور ریز گاری نکالی اور ان بزرگ کے سامنے چارپائی پر رکھ دی۔

بزرگ نے اپنی نم آلود آنکھیں حیرت سے اس کی طرف اٹھائیں۔

"بابا میں ہندو ہوں۔ میرا گھر بار پاکستان میں لٹ چکا ہے۔ پاکستان میں رب العالمین پر یقین رکھنے والے مسلمانوں نے بے قصور ہندوؤں پر اور ہندوستان میں گھٹ گھٹ میں باسی بھگوان کے پجاریوں نے معصوم مسلمانوں پر جو مظالم توڑے ہیں ان کا کفارہ تو دو سات جنم میں ادا نہیں کر سکتے۔ میری یہی دعا ہے کہ بھگوان انھیں نیک صلاح دے۔ میں یہ چندہ پنجاب کے دکھی شرنارتھیوں کے لیے اکٹھا کر رہا تھا۔ آپ بھی پنجاب کے شرنارتھی ہیں اور دکھی بھی کم نہیں۔ روپیہ زیادہ نہیں۔ مگر دیکھیے اگر اس سے آپ کا کچھ کام چل سکے اور اس سے پہلے کہ بزرگ کچھ کہتے دیپا چند وہاں سے آنکھیں پونچھتے ہوئے باہر نکل آیا۔

کرشن چندر نے پشاور ایکسپریس کے ذریعہ تقسیم کی وارداتیں سنائی ہے۔ چونکہ ان کا تعلق ترقی پسندی سے تھا اور ان کا اپنا ایک اسلوب تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ نثر کے ذریعہ شاعری کیا کرتے تھے۔ تقسیم کی کرب ناک داستان اور کرشن چندر کے اسلوب نے افسانے کی تاثیر کو دو چند کر دیا ہے اور اپنی بات کہنے سے ہمیشہ کی طرح یہاں بھی انھوں نے گریز نہیں کیا ہے۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ اس کا مرکزی کردار کوئی فرد نہیں ہے بلکہ ریل گاڑی ہے کرشن چندر نے ریل گاڑی کو اظہار کا واسطہ بنایا ہے اور مخصوص فرقے کی عورتوں اور مظلوموں کے ساتھ ہر اسٹیشن پر جو شرمناک حرکتیں ہوئیں ان کا منظر بڑی فنکاری سے کھینچا ہے۔

گاڑی کی زبانی ادا کرنا ان کا یہ آخری جملہ دوہرا کام کر گیا ہے۔

"میں لکڑی کی ایک بے جان گاڑی ہوں۔ لیکن پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ اس خون اور گوشت اور نفرت کے بوجھ سے مجھے نہ لادا جائے۔ میں قحط زدہ علاقوں میں اناج ڈھوؤں گی۔ میں کوئلہ اور پٹرول اور لوہا لے کر کارخانوں میں جاؤں گی۔ میں کسانوں کے لیے نئے ہل اور نئی کھاد مہیا کروں گی۔ میں اپنے ڈبوں میں کسانوں اور مزدوروں کی خوش حال ٹولیاں لے کر جاؤں گی جہاں باعصمت عورتوں کی میٹھی نگاہیں اپنے مردوں کا دل ٹٹول رہی ہوں گی اور ان کے آنچلوں میں ننھے ننھے خوب صورت بچوں کے چہرے کنول کے پھولوں کی طرح کھلتے نظر آئیں گے اور وہ اس موت کو نہیں بلکہ آنے والی زندگی کو جھک کر سلام کریں گے۔ جب نہ کوئی ہندو ہوگا نہ مسلمان ہوگا بلکہ سب مزدور ہوں گے اور انسان ہوں گے۔"

"مشہور ناقد وقار عظیم کہتے ہیں کہ کرشن چندر نے 'ہم وحشی ہیں' وغیرہ افسانے کبھی ہندوؤں اور سکھوں کے لیے لکھے اور کبھی مسلمانوں کے لیے۔ لیکن خود ہندو یا مسلمان ہو کر نہیں بلکہ انسان ہو کر اور اسی لیے ان افسانوں میں ایک خاص قسم کا جذباتی گہراؤ بھی ہے۔ درد کی کسک بھی۔ لیکن جذبات کے بہاؤ پر بھی غور و فکر نے اعتدال اور توازن کی نگہداشت کی ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تقسیم کے سبب ہونے والے فسادات اور ہجرت کی کرب انگیزی کے اظہار میں بے شمار افسانے تحریر کیے گئے۔ جن میں زیادہ تر میں اس بات پر زور دیا گیا کہ کس طرح انفرادی زندگی خوشیاں اور سکون برباد ہوا اور انسانی رشتوں پر اس کے کیا کیا اثرات کس طرح پڑے۔ اس ضمن میں رام لعل کا افسانہ 'ایک شہری پاکستان کا' اس کی عمدہ مثال ہے۔ فسادات کے دوران ایک شخص کا اپنی بیوی سے بچھڑنا ہوا۔ اسے مردہ سمجھ کر اس کی بیوی کی دوسری شادی کا ہو جانا کس قدر درد انگیز ہے اس کا احساس تو وہی شخص کر سکتا ہے جس پر یہ سانحہ گزرا ہے۔ دو شوہروں کے درمیان مجبور اور بے بس عورت اس طور پر پیش کی گئی ہے کہ قاری کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس افسانے میں شوہر کی نفسیاتی کیفیت کو بڑے دل پذیر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ "مٹی دھرتی پکارے" اشک کا یہ افسانہ بھی تقسیم کے کرب کا بیانیہ ہے۔

مجموعی طور پر افسانوں میں سماجی اعتبار سے مذہبی عصبیت اور فرقہ واریت کو مرکزی موضوع کی حیثیت دے کر نمایاں تبدیلی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ خواجہ احمد عباس

کا افسانہ 'سردار جی' بھی اسی ٹائپ کا افسانہ ہے۔ جس میں ایک جواں مرد اپنی جان دے کر ایک مسلم فیملی کی جان کی حفاظت کس طرح کرتا ہے بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

افسانوی ادب کے ماتریت میں رتن سنگھ ایک ایسا نام ہے جس پر اردو دنیا کو آج بھی ناز ہے۔ اُن کا افسانہ "بھولے بسرے رشتے" ایک ایسا غیر معمولی شاہکار ہے جس میں ہند و پاک میں رہنے والوں کے پرانے روابط اور تعلقات کو یاد دلایا گیا ہے تو دشمن تو پہچانو، میں تقسیم کس طرح غیر فطری عمل ہے کی طرف نشاندہی کی گئی ہے اور تقسیم کے بعد سماجی تبدیلی کی آئینہ دار کہانی ہے۔

اپنی سوانح 'زخموں کی داستان' - بھول سا بیان میں وہ کہتے ہیں کہ "فسادات کے دنوں میں جب سب لوگ انسان نہ رہ کر مختلف دھرموں میں بٹ چکے تھے۔ دوسرے مسافروں کے لیے یہ ایک حیران کن بات تھی۔ شاید وہ دل ہی دل میں سوچتے ہوں گے کہ یہ لوگ ہندوستان کے باشندے تو ہو ہی نہیں سکتے۔ ضرور کسی ایسے ملک کے رہنے والے ہوں گے جس کا نام انسانستان کہا جاتا ہے۔ یہ انسانستان اس زمین پر کہیں دکھائی نہیں دیا۔ دنیا کے نقشے میں اس کا نام نہیں۔ کسی آسمان پر ہو تو کہہ نہیں سکتا۔ (ص 71) رتن سنگھ۔

جوگندر پال کا افسانہ 'میلے ملاقاتیں' بھی اسی موضوع کا غماز ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ "اپنی یہ ٹی کہانیاں لکھ کر اس طرح لگتی ہیں کہ اپنے ان کرداروں پر مجھے اپنے آپ کا بھی گمان ہوتا ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نہیں رہوں گا تو کیا یہ سارے لوگ تو رہ جائیں گے۔ زندگی کا جوہر تو وہی ایک ہے۔ اگر وہی ایک ہے تو رفتگان کہیں بھی جائیے۔ آخر کہاں جاتے ہوں گے۔ بس یہیں کہیں یہیں گھر کیے رہتے ہوں گے جہاں سے روانہ ہوئے۔"

ڈاکٹر کیول دھیر نے بھی اپنے جذبات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے۔ اُن کے مطابق "ادب میں زندگی کے حقائق سے آنکھیں موند لینا اخلاقی جرم ہے" (اُن کی سوچ اور جذبوں کے احساس نے ہی ہمیشہ اُن کے قلم کو تحریر کی تحریک و قوت بخشی ہے۔ "ہم دونوں" عنوان سے تحریر کردہ ان کی کہانی آج بھی تازہ کار محسوس ہوتی ہے۔ یہ دو دوستوں کی کہانی ہے۔ جو جنگ کی تباہ کاریاں پیش کرتی ہے کمل اور احمد کی یہ کہانی جنگ کے منظر نامہ پر سوال قائم کر کے انسانوں سے پوچھتی ہے کہ کیا جنگ مسائل کا حل ہے۔ کہانی کا یہ پیرا کس قدر حقائق کا غماز ہے۔

"مگر ایک انسان اور انسان کے درمیان کی لکیریں ابھر کر کھنچ گئیں۔

آزادی اور بٹوارے کی آڑ میں انسانوں کو بانٹ دیا گیا۔ بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا گیا۔

اور ملک تقسیم ہو گیا۔ اب ہم سرحد کی اس طرف تھے اور احمد کا گھرانہ سرحد کی دوسری طرف۔ بٹوارے نے خاندان بانٹ دیے۔ زمین بانٹ دی۔ لیکن دلوں کے رشتے نہ ٹوٹ سکے۔"

اب آخر میں محمد بشیر مالیر کوٹلوی کے افسانے 'حرام زادہ' سے متعلق بھی غور فرمائیں:

حرام زادہ ایک ایسے کردار کی کہانی ہے۔ جس کا راست تعلق افسانے کے خالق سے بھی ہے۔ عام طور پر مشاہدے تجربے کے علاوہ خود پر گزرے ہوئے واقعہ پر جب کوئی قلم کار قلم اٹھاتا ہے تو تاثیر میں حقائق کا در آنا فطری بن جاتا ہے۔ حرام زادہ افسانے کا کردار اپنی جنم تقسیم کے بعد ہونے والی ہجرت کے ساتھ میں اپنی بہن کی عزت بچاتے ہوئے قربان ہو جاتا ہے اور مرتے وقت "ذکر یار ہو برگ سیاں" کہہ کر کمل کا شکریہ ادا کرتا۔ ایسا سانحہ تھا جو بیوی کے باپ کی آتما پر بوجھ بن جاتا ہے۔ بیوی اس گناہ کے کفارے کے طور پر کرم الٰہی کی مدد کرنا چاہتا ہے مگر اس کے باوجود نفرت کی بھڑکنے والی آگ اُسے بیوی کے گھر میں باپ کی لاش کی سزا کا عرصہ

ایک بات تو طے ہے کہ تقسیم ایک بہت بڑا اور بڑا حادثہ تھا جو گزر گیا اور لوگ ہیں کہ برائی سے بھی بھلائی کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ تقسیم کے سانحے پر اردو کے افسانہ نگاروں نے ادب کے میدان میں ایسے ایسے درد انگیز اور کرب ناک پھول چڑھائے ہیں کہ اس سے اردو کا افسانوی محل آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہے

بعد بھی محسوس کروا کے احساسات قبول کرنے سے روک دیتی ہے۔ نفرت کی یہ آگ نسل در نسل سفر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی ہے جس میں آج تک دونوں فریق برابر جھلس رہے ہیں۔

اس کے علاوہ رامانند ساگر کا 'اور انسان مر گیا' ڈاکٹر اوماں بالا کا 'دروازہ کھلتا ہے' (جس کا ہندی ترجمہ ڈاکٹر کیول دھیر نے کیا ہے) اسی زمرے کی تحریریں ہیں۔ ساتھ ہی ہرچرن چاولہ، کشور وکرم، مہندر ناتھ سنگھ، ہیرا لال، کشمیری لال ذاکر وغیرہ نے بھی تقسیم کے موضوع پر طبع آزمائی فرمائی ہیں۔

بعض ناقدین نے اس طرح کے ادب کو ہنگامی ادب کہا ہے مگر علی سردار جعفری "اس کو ہنگامی کہہ کر صرف وہی لوگ ٹال سکتے ہیں جن کی روحیں سڑ گئیں اور شعور اُن کے جذبے خشک ہو گئے ہیں۔"

چونکہ زندگی مختلف مسائل سے عبارت ہے۔ اس میں جہاں خوشیاں ہیں وہیں غم بھی دامن پھیلائے نظر آتا ہے۔ لیکن ایک بات تو طے ہے کہ تقسیم ایک بہت بڑا اور بڑا حادثہ تھا جو گزر گیا اور لوگ ہیں کہ برائی سے بھی بھلائی کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ تقسیم کے سانحے پر اردو کے افسانہ نگاروں نے ادب کے میدان میں ایسے ایسے درد انگیز اور کرب ناک پھول چڑھائے ہیں کہ اس سے اردو کا افسانوی محل آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہے اور یہ بات بھی سچ ہے کہ افسانہ محل کی اس روشنی میں پنجاب کے قلم کاروں کا بھی خون جگر شامل ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

حوالے

(1) اردو اور ہندی افسانے پر تقسیم کے اثرات۔ غیرہ

(2) فسادات کے افسانے۔ زبیر رضوی

(3) افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کا ادبی افسانہ۔ ڈاکٹر اقبال ملک

■

Mohiuddin Usmani 204, Shahu Nagar, Jalgaon - 425001 (MS)

ندیم احمد ندیم

پنجاب اور اردو افسانہ
تقسیم سے پہلے

کہانی ادب کی قدیم ترین صنف ہے۔ اردو ادب کی بات کریں تو آج سے تقریباً ساڑھے تین سو سال پہلے سے کہانی کی مختلف ہیئتوں اور جہتوں کا سراغ ملتا ہے جیسے داستان، مثنوی، ناول، ناولٹ، افسانہ اور مختصر افسانہ بلکہ اب تو اس میں افسانچہ بھی شامل ہو گیا ہے۔ بقول وقار عظیم:

"مختصر یہ کہ تقریباً تین صدیوں میں اردو میں نثر اور نظم کی ان گنت قصے کہانیوں کی کتابیں لکھی گئیں، وہ سب مل کر اتنی ہیں کہ کوئی دن رات پڑھتا رہے پھر بھی اس دفتر کو مشکل سے کئی مہینوں میں ختم کر پائے گا۔ ان قصوں میں تقریباً ہر ایک کا ماخذ کوئی فارسی یا سنسکرت کا مشہور قصہ ہے۔" (وقار عظیم، نیا اردو افسانہ، ص 10)

ایک خاص بات یہ کہ کہانی ہمارے یہاں صرف نثر میں ہی نہیں بلکہ نظم میں بھی موجود ہے۔ اردو مثنویاں اس کی عمدہ مثال ہیں جن میں غواصی کی سیف الملوک اور بدیع الجمال، ابن نشاطی کی پھول بن، تحسین الدین کی کام روپ کلا اور نظامی کی مثنوی ہشت پیکر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سترھویں صدی میں نامور شاعر اور ادیب ملا وجہی کی پہلی نثری اور تمثیلی داستان 'سب رس' 1635 میں منظر عام پر آئی جس میں ایک فرضی قصہ شامل ہے۔ اٹھارویں صدی میں وجہی کا خسرو نامہ، فریدالدین عطار کی گل ہرمز اور میر حسن کی سحرالبیان سامنے آتی ہیں۔ اسی دور میں فضلی کی کربل کتھا 1731 میں مکمل ہوئی۔ میر عطا حسین تحسین کی نوطرز مرصع (قصہ چہار درویش کا ترجمہ) بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ جولائی 1800 میں [illegible] کی قیادت میں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کا قیام عمل میں آتا ہے۔ اس کالج کے مقاصد حالانکہ کچھ اور تھے لیکن اس سے اردو ادب کو خاطر خواہ فائدہ پہنچا۔ یہاں پر میر امن نے باغ و بہار اور گنج خوبی، بہادر علی حسینی نے نثر بے نظیر، حیدر بخش حیدری نے لیلیٰ مجنوں، طوطا کہانی اور آرائش محفل اور نہال چند لاہوری نے قصہ تاج الملوک، گل بکاولی اور مذہب عشق جیسی تصانیف مکمل کیں۔

ان کے بعد منشی کمال لعل، ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور محمد علی کے ناول فکشن میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ سب انگریزی طرز سے متاثر ناول نگار ہیں۔ ان کے بعد محمد ہادی رسوا کا ناول 'امراؤ جان ادا' زندگی کے عکاس کے طور پر سامنے آتا ہے جس میں نفسیات سے تعلق رکھنے والا نیا انداز اپنایا گیا ہے۔

ناول کی طرح مختصر افسانہ بھی انگریزی ادب کے زیر اثر اردو میں داخل ہوا حالانکہ افسانے کے ساتھ ساتھ ناول بھی لکھے جاتے رہے لیکن افسانے کا جادو لگاتار سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ آج افسانے کو نثر میں وہی مقام حاصل ہے جو صنفِ نظم میں 'غزل' کو حاصل ہے۔ اردو نثر کا زیادہ سرمایہ بھی افسانے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی اپنے مضمون افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل میں لکھتے ہیں:

"افسانے اور شعر میں کوئی فرق نہیں، ہے تو صرف اتنا کہ شعر چھوٹی بحر میں ہوتا ہے اور افسانہ ایک لمبی اور لمبی بحر میں ہوتا ہے جو افسانے کے شروع سے آخر تک چلتی ہے۔ مبتدی اس بات کو نہیں جانتا اور افسانے کو بحیثیت فن شعر سے زیادہ سہل سمجھتا ہے۔"

(بحوالہ اردو افسانہ، روایت اور مسائل، گوپی چند نارنگ، ص 31)

مختصر افسانے کی ابتدا یعنی انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستانی سماج میں اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی طور پر کافی انتشار ملتا ہے۔ اس لیے مذہبی اور اصلاحی تحریکات کا بھی کافی زور تھا۔ بیسویں صدی شروع ہوتے ہوتے ان تحریکوں نے اور زور پکڑا۔ پریم چند بھی بطور ادیب اس تحریک میں شامل ہوئے۔ انھوں نے قوم پرستی اور نچلے اور متوسط طبقے کے مسائل کی بیداری کے لیے مہم شروع کی۔ ہندوستانی معاشرت پر غور کریں تو اس کا زیادہ تر حصہ دیہات میں ملتا ہے۔ پریم چند نے اس طبقے کی زندگی اور مسائل کو ہی اپنی تخلیقات کا محور بنایا۔ اسی زمانے میں اردو افسانے کی شروعات ہوئی اور پریم چند کو باقاعدہ طور پر پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا گیا۔ انھوں نے نئی تہذیب کے کھوکھلے پن کو چھوڑ کر اپنے تابناک ماضی کی روشن روایتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے محبت، مساوات، روحانیت اور وطن پرستی کی تعلیم کو عام کیا۔ ان کے افسانے کفن، عیدگاہ، پوس کی رات، دو بیل وغیرہ خاص طور پر اہم ہیں۔ انھوں نے زندگی کے حقائق اور تقاضوں کی طرف دھیان دلایا۔ ان کے یہاں حقیقت پسندی کا رجحان غالب ہے۔ پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ 'سوز وطن' 1908 میں شائع ہوا۔

پریم چند کے بعد جب ہم کسی دوسرے افسانہ نگار کی تلاش کرتے ہیں تو ہمیں پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ سرزمین پنجاب ہمیشہ سے ذکر و فکر کا مرکز رہی ہے۔ جہاں اس کے صاف شفاف لہراتے بل کھاتے مست دریا اس کی شادابی کا باعث ہیں وہیں اس کی فضا میں مہک رہی وحدانیت اور روحانیت کی خوشبو پنجابیوں کی سوچ کو لوچ، جوش کو ہوش اور خیال کو جمال عطا کرتی ہے۔ بقول راجندر سنگھ بیدی:

"وہی تو ایک دیش ہے جس کی دھرتی سے آٹھوں پہر لوبان کی خوشبو اٹھتی ہے۔ اس کے دریا تو ایک طرف پوکھر بھی انوراگ سے واقف ہیں۔ جہاں کے مرد اکھڑ، عورتیں جھگڑالو، وہ خود اپنے قانون بناتے ہیں اور اگلے ہی پل بے بس ہو کر خود ہی انھیں توڑ دیتے ہیں اور پھر سے

قانون وضع کرنے چل نکلتے ہیں۔ انھوں نے بہت دکھ دیکھا ہے، وہ کسی وقت بھی سونے کو مٹی میں رول دیتے ہیں اور پھر اسی مٹی کو کھنگال کر اس میں سے کندن پیدا کر لیتے ہیں، عجب کیمیاگر ہیں۔ وہ پنجابی ہی ہے جو خود پر ہنس سکتا ہے۔ وہ اچھا دوست ہے، برا دشمن۔ جہاں بھی لوگ بلند آواز سے ہنستے، قہقہے لگاتے ہوئے سنائی دیں وہاں ضرور کوئی پنجابی ہوگا۔ وہ اندر بھی وہی ہے باہر بھی وہی ہے۔ وہ ایک ایسا پودا ہے جو دنیا کی کسی بھی دھرتی پر پنپ سکتا ہے۔" (ایک چادر میلی سی)

بات اردو زبان و ادب کی ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب نے ہر دور میں اس کی نمائندگی کی ہے۔ جہاں اردو پنجاب میں پیدا ہوئی وہیں اس کی ترویج و ترقی میں بھی پنجاب کا نمایاں رول رہا ہے۔ ادب ہمیشہ زبان کے پروں پر ہی اڑان بھرتا ہے۔ لہٰذا زبان کے ساتھ ساتھ ادب سازی میں بھی پنجاب کی اولیت مسلّم ہے۔ فکشن کی بات کریں تو منشی کمال علی کے ناول 'ریاض دلربا' 1832 کو پہلا اردو ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ناول کے مرتب ڈاکٹر ابن کنول نے لکھا ہے کہ "اس میں محض ایک عہد کے مسائل پیش نہیں کیے گئے بلکہ یہ کہانی آج کی کہانی ہے"۔ (صفحہ نمبر 220) ڈاکٹر بشر نقوی لکھتے ہیں کہ موضوع کے اعتبار سے بھی ناول کا کینوس وسیع ہے جبکہ نذیر احمد کے ناول صرف ایک خاص مسلم معاشرے سے جڑے ہوئے ہیں۔" (صفحہ نمبر 13)

اسی طرح افسانے میں بھی پریم چند کے بعد اردو افسانے کے زیادہ تر معتبر نام پنجاب ہی سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ ایک نظر سے دیکھا جائے تو پنجاب کے افسانہ نگار امر سنگھ منصور کی پیدائش 1875 میں پریم چند سے بھی پہلے ہوئی ہے۔ افسانوں کے علاوہ ان کے دو ناول 'جھوٹی پریت' اور 'حسن کی رسوائی' بھی شائع ہوئے۔ انھوں نے پسماندہ طبقے کے تلخ حقائق کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا یعنی وہ ادب برائے زندگی کے حامی ہیں۔ 'ایکے کی برکت' ان کا اہم افسانہ ہے۔ پنجاب کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں حکیم احمد شجاع کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے جن کی پیدائش 1895 میں لاہور میں ہوئی۔ افسانوں کے علاوہ ڈرامے بھی تخلیق کیے۔ حالانکہ انھوں نے بہت زیادہ افسانے نہیں لکھے لیکن ان کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ ان کا نام ابتدائی افسانہ نگاروں میں سرفہرست ہے۔ ان کا پہلا افسانہ 'اندھا دیوتا' 1913 میں شائع ہوا جبکہ پہلا افسانوی مجموعہ 'حسن کی قیمت' 1920 میں منظر عام پر آیا۔ ان کے افسانوں میں پریم چند کی حقیقت پسندی اور یلدرم کی رومانیت کے باوجود انفرادیت نمایاں ہے۔

ابتدائی افسانہ نگاروں میں پنڈت بدری ناتھ سدرشن کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ 1896 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ پریم چند کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حقیقت پسندی، فطرت نگاری اور علاقائی عناصر کو فروغ دیا۔ دیہات کے ساتھ ساتھ شہری زندگی کو بھی موضوع بنایا۔ متوسط طبقے کے مسائل کو نہایت سلیقے سے پیش کیا۔ افسانوں کے علاوہ ڈرامے بھی لکھے، شاعری بھی کی۔ چھ افسانوی مجموعے شائع ہوئے جن میں سدا بہار پھول، چشم و چراغ، طائر خیال، سولہ سنگار، چندن اور آزمائش شامل ہیں۔ ان کے اسلوب میں سادگی کے باوجود کشش پائی جاتی ہے۔

اگلے مرحلے میں دیوندر ستیارتھی، موہن سنگھ دیوانہ اور پورن سنگھ ہنر کے نام قابل ذکر ہیں۔ دیوندر ستیارتھی 1908 میں ضلع سنگرور کے گاؤں بھدوڑ میں پیدا ہوئے۔ 1942 میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'نئے دیوتا' اور 1945 میں دوسرا مجموعہ 'اور بانسری بجتی رہی' سامنے آیا۔ پنجابی تہذیب کی نمائندگی ان کے فکشن کا خاص حصہ ہے۔ خاص طور پر ان کے افسانوں میں جو لوک گیت ملتے ہیں وہ ان کی انفرادیت ہے۔ دیوندر ایک ترقی پسند افسانہ نگار مانے جاتے ہیں۔ قومی بیداری، جنسی مسائل، سماجی عدم مساوات، غریب طبقے کی خستہ حالی اور اصلاح معاشرہ ان کے افسانوں کے اہم پہلو ہیں۔ ان کے افسانوں میں ان داتا، دوہا تیج، پھر پھرا، اور بانسری بجتی رہی، انگا چڑا، پل، پرانے ٹل اور چائے کے باغوں میں وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

موہن سنگھ دیوانہ کا پہلا افسانہ جو ٹھمو کے نام سے شائع ہوا۔ ان کا ایک مجموعہ بعنوان 'پچکیاں' 1938 میں منظر عام پر آیا۔ وہ ایک ادیب، شاعر اور نقاد کے طور پر اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ پورن سنگھ ہنر 1904 میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک افسانہ نگار سے زیادہ شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کے پانچ شعری مجموعے اور ایک افسانوی مجموعہ 'موتیوں کا ہار' شائع ہوا۔ ایک تھا راجہ، قزاق اور آئینہ ان کے اہم افسانے ہیں۔ افسانوں میں پنجابی تہذیب کی نمائندگی کے علاوہ تمثیلی انداز بھی ملتا ہے۔

1909 سے 1915 تک کے چھ سال پنجاب ہی نہیں بلکہ ملکی سطح پر بھی اردو افسانے کے لیے عہد زریں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان برسوں میں ہی فکشن کے بڑے ناموں کا جنم ہوا جن میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، صالحہ عابد حسین، غلام عباس، ممتاز مفتی، گوربخش سنگھ گھنور اور جنگ بہادر سنگھ کے نام شامل ہیں۔ جس طرح ستلج، بیاس، راوی، چناب اور جہلم پنجاب کی سرزمین کی شادابی اور رعنائی کا باعث ہیں۔ اسی طرح سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ پنجاب کے آسمان ادب کی کہکشاں ہیں۔ سعادت حسن منٹو، پریم چند کے ساتھ اردو افسانے کا بڑا نام ہے۔ تقریباً 22 افسانوی مجموعوں کے خالق ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامے، خاکے، انشائیے اور ایک ناول بھی تخلیق کیا۔

سعادت حسن منٹو ایک عام آدمی تھا لیکن وہ اس وقت خاص ہو گیا جب اس نے عام انسان کی عام سی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی تخلیقی سرگرمیوں کا موضوع خاص بنایا۔ وہی سادہ سی حقیقتیں جنھیں ہم بار بار دیکھتے، سنتے اور نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ کچھ چیزوں کو تو ہم جان بوجھ کر بھی پشت ڈال دیتے ہیں، منٹو نے جب ان ہی تلخ حقائق کو ہمارے روبرو کیا تو ہمارے مہذب اور شائستہ سماج کے گلے میں یہ کڑواہٹ اٹک کر رہ گئی اور ایک دم منٹو پر جنس پرستی، فحاشی اور بدگوئی کے الزامات عائد کر دیے گئے۔ صرف یہ دیکھا گیا کہ منٹو نے کس بات کو کیسے پیش کیا ہے، افسوس کہ یہ جاننے کی کوشش نہیں کی گئی کہ منٹو نے کیا پیش کرنا چاہا ہے؟

ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ فنکار اپنی تخلیق کے لیے مواد اپنے سماج اور گرد و نواح سے ہی حاصل کرتا ہے، تو اگر منٹو کی کہانیوں میں کسی کو غلاظت محسوس ہوتی ہے تو یہ ہمارے سماج کی برائی تو ہو سکتی ہے منٹو کی ہرگز نہیں۔ منٹو نے ایک جگہ لکھا ہے:

"زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔"

منٹو کے افسانوں میں جو کھلا پن، دوسرے الفاظ میں ننگا پن موجود ہے، منٹو اس کا خالق نہیں بلکہ ہمارے سماج میں صدیوں سے موجود ہے۔

منٹو کے افسانوی مجموعوں میں آتش پارے 1936، منٹو کے افسانے 1940، دھواں 1941، افسانے اور ڈرامے 1943، تقسیم وطن سے پہلے شائع ہوئے جبکہ لذت سنگ، سیاہ حاشیے اور چغد 1948 میں سامنے آئے۔ منٹو کے افسانوں کی زبان نہایت آسان اور روز مرہ کی بول چال کے قریب ہے لیکن اس میں بھی ایک کشش پوشیدہ رہتی ہے۔ ذرا یہ انداز ملاحظہ کریں:

"کبھی کبھی کسی آنے جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران کسی نے زور سے 'ہوں' کہی ہے۔"

راجندر سنگھ بیدی نے جو ادبی وقتی نمونے پیش کیے وہ ان کی بالغ النظری، دور رسی اور بے پناہ صلاحیتوں کو ابھار کر کرتے نظر آتے ہیں۔ فنکارانہ چابکدستی، پختگی، شگفتگی اور حیات و کائنات کے بصیرت افروز مشاہدات یہ سب وہ عوامل ہیں جو ان کی عظمت میں اضافے کا باعث ہیں اور جس سے اردو افسانے کو ثبات حاصل ہے۔ بیدی کے کل چھ افسانوی مجموعے شائع ہوئے جن میں سے دو مجموعے دانہ و دام 1936 اور گرہن 1942 تقسیم وطن سے پہلے شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ڈرامے اور ایک ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' ان کی یادگار ہیں۔

دکھ درد کو شدت سے محسوس کرنا، اپنے آپ کو کرداروں میں سمو دینا بیدی کی سب سے بڑی خاصیت ہے اور یہی چیز ان کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ کردار نگاری میں ان کو کمال حاصل تھا۔ وہ اپنے کرداروں سے گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ذریعے بھی بات کرتے ہیں اور ان کی رسائی خود کلامی تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ کبھی کبھی صرف ایک جملے ہی سے ہمارے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ افسانہ 'بُبل' میں دیوی کہتی ہے "ہاں میں بیوقوف ہوں، ماں ہونا اور عقل رکھنا الگ باتیں ہیں۔"

کرشن چندر کو پنجاب کا پریم چند بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ 'طلسم خیال' 1940ء میں سامنے آیا جس کے بارے میں سمجھا اول کہہ دے کہا تھا کہ کرشن چندر پریم چند کی طرح صف اول کا افسانہ نگار بنے گا۔ دوسرا مجموعہ 'نظارے' 1940ء میں چھپا۔ کرشن چندر کی خاصیت یہ ہے کہ انھوں نے کسی خاص رجحان کی پیروی نہیں کی، چاہے وہ رومانیت ہو، جنس ہو یا اشتراکیت، بلکہ وہ وقت کے بدلتے دھارے کے ساتھ بہتے رہے تھے۔ وہ زندگی کو کسی تصویر میں عینک سے نہیں دیکھتے بلکہ اپنی آنکھوں پر ہی زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ انھوں نے [illegible] اور ہر طرح کی حد بندی سے آزاد ہو کر زندگی کا ساتھ نبھایا۔ ان کے اسلوب کی خاصیت یہ ہے کہ وہ خشک مضامین کو بھی دلکشی اور شگفتگی عطا کرتے ہیں، اسی خوبی کی وجہ سے احمد ندیم قاسمی ان کو افسانہ نگار کے ساتھ شاعر بھی تسلیم کرتے ہیں۔ مختصر طور پر وہ صحیح کل کے افسانہ نگار کہے جا سکتے ہیں۔

[illegible] (اوپندر ناتھ اشک) پریم چند اسکول کے ایک بہترین افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے پہلے مجموعے نورتن 1930 سے قبل شائع ہو کر قائم کی۔ اس کے بعد عورت کی فطرت 1933، ڈاچی 1937، کونپل 1940، چٹان 1941، قفس 1943، ناسور 1943 اور کالے صاحب 1956 مجموعے شائع ہوئے۔ ابتدائی افسانوں میں پریم چند کی طرح اصلاحی رنگ وافر اثرات کے ساتھ موجود ہے حالانکہ ان کے یہاں رومانی عناصر بھی موجود ہیں اور جذبات کا گہرا اثر بھی ملتا ہے۔ انھوں نے پسماندہ اور متوسط طبقوں کے مسائل کو ابھار کرتے ہوئے فرد کی اہمیت کو واضح کیا۔ بقول ڈاکٹر صادق:

"انھوں نے اس طبقے کے متوسط خاندانوں کی گھریلو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ان کے حقیقی رنگوں میں پیش کیا۔ 'جتنی' کی ماں، کونپل اور قفس اس ذیل میں آنے والی اچھی کہانیاں ہیں۔"

(ڈاکٹر صادق، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ ص 179)

خواجہ احمد عباس 1914 کو پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کی افسانہ نگاری میں حقیقت پسندی کا رجحان غالب ہے جو ترقی پسندی تک پہنچتا ہے۔ زندگی کی کڑوی سچائیوں کا بیان ان کا خاصہ ہے۔ ان کے یہاں فکر کی گہری جدت ملتی ہے۔ ایک لڑکی، زعفران کے پھول، دیا جلے ساری رات، کہتے ہیں جس کو عشق، نئی دھرتی نئے لوگ وغیرہ ان کے اہم افسانے ہیں۔

انور عظیم کا پہلا افسانہ 'جنگ کو جانے والے جہاز' 1949 میں شائع ہوا۔ پہلا مجموعہ 'آگ کی آغوش میں' منظر عام پر آیا۔ پہلی بار اردو افسانے میں بحری معاملات کو موضوع بنایا۔ لاہور سے وابستہ غلام عباس اردو افسانے کا اہم نام ہے۔ پہلا افسانہ بعنوان 'جلا وطن' 1925 میں 15 سال کی عمر میں لکھا۔ پہلا مجموعہ 'کاروان' 1939 میں دوسرا مجموعہ 'آنندی' 1947 میں شائع ہوا۔ ان کے یہاں قدامت اور جدیدیت کا امتزاج ملتا ہے۔ حقیقت نگاری کا رجحان بھی موجود ہے۔

1932 میں ایک اہم افسانوی مجموعہ 'انگارے' کے نام سے شائع ہوا جس میں نو افسانے اور ایک ڈرامہ شامل تھا۔ اس مجموعے میں سجاد ظہیر کے پانچ، احمد علی کے دو، رشید جہاں کا ایک اور محمود الظفر کا ایک افسانہ شامل ہے۔ یہ افسانے ترقی پسند ادب کے اہم افسانے مانے جاتے ہیں اور ان کی اشاعت انقلاب آفریں مانی جاتی ہے۔ ان مصنفین میں محمود الظفر اور رشید جہاں کا تعلق بھی پنجاب سے رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک اپنی نوعیت کی اہم تحریک ہے جس میں پنجاب کے قلم کاروں نے اہم رول ادا کیا۔ سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے اپنے چند ہم خیال لوگوں کے اشتراک سے لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین Indian Progressive Writer Association کا پہلا اجلاس منعقد کیا۔ پھر دوسرے اجلاس کا اہتمام 1936 میں لکھنؤ کیا گیا، جس کی صدارت پریم چند نے کی۔ اس کے بعد اردو افسانے کے بڑے نام بھی اس تحریک سے وابستہ ہو گئے جن میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، سدرشن، سجاد حیدر یلدرم، علی عباس حسینی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس، امتیاز علی تاج، اختر حسین رائے پوری، عصمت چغتائی، غلام عباس، بلونت سنگھ اور احمد ندیم قاسمی کے نام قابل ذکر ہیں۔

مجموعی طور پر اردو افسانہ کو اسکے موضوعات میں پنجاب سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ پنجاب میں افسانے کی روشن روایتیں موجود ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ بہت سے معتبر نام اس سچائی کے امین ہیں۔ بہت سے افسانہ نگار ایسے ہیں جو تقسیم وطن سے پہلے پیدا ہوئے مگر ان کی تخلیقات آزادی کے بعد منظر عام پر آئیں۔ اس لیے میں صرف ان کے ناموں پر ہی اکتفا کروں گا۔ ایسے افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی، اے حمید، رام لعل، جیلانی بانو، اشفاق احمد، جوگندر پال، رتن سنگھ، بانو قدسیہ، [illegible]، ہرچرن چاولہ، مہندر ناتھ، سریندر پرکاش، ستیہ پال آنند، شمشیر سنگھ نرولا، کرتار سنگھ دگل، [illegible]، گوربچن سنگھ، [illegible]، تسنیم، شرون کمار ورما، کرنیل سنگھ، [illegible]، جوہر سنگھ امرتسری، [illegible] سنگھ، گیان سنگھ شاطر، پی کے باوا، [illegible]، گرچرن سنگھ، سرجیت سنگھ اور ڈاکٹر کیول دھیر کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے بعد تقسیم ملک ہندوستان، ہند اور پاک میں بٹ گیا۔ میں اپنی بات کو تقسیم وطن سے جڑے دل خراش سانحے سے متعلق سعادت حسن منٹو کے ان جذبات کی عکاسی پر ختم کرتا ہوں کہ:

ایک پاگل تو ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنی پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا... میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں، میں اس درخت پر ہی رہوں گا۔" (افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ')

■

Dr. Nadeem Ahmad 'Nadeem' Lecturer (Urdu)
Northern Regional Language Centre, Punjabi University Campus, Patiala- 147002 (Pun)

شہرِ ادب
مالیرکوٹلہ کا افسانوی سفر

سالک جمیل براڑ

مالیرکوٹلہ ہمیشہ سے شعر و ادب کا مرکز رہا ہے۔ سرزمینِ مالیرکوٹلہ اردو ادب کی آبیاری کے لیے بہت زرخیز ثابت ہوئی ہے۔ ملک کی دوسری ریاستوں کی مانند ماضی میں یہاں کے شعرا کو بھی ریاست کی سرپرستی حاصل تھی۔

نوابینِ مالیرکوٹلہ شعر و ادب کے شوقین ہی نہیں بلکہ شعرا و ادبا کے سچے دلدادہ تھے۔ ریاست کی جانب سے شعرا کی خوب پذیرائی کی جاتی تھی۔ ساتھ ہی انعام و اکرام سے بھی نوازا جاتا تھا۔ ایسے حالات میں شعر و ادب کی ترقی فطری بات ہے۔ مالیرکوٹلہ کی اسی ادبی فضا نے یہاں پر بے شمار ایسے شاعر پیدا کیے ہیں جن پر اردو ادب کو ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

مالیرکوٹلہ کی ادبی تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ یہاں کا ادبی سفر ڈیڑھ صدی پر محیط ہے جہاں اس عرصے میں یہاں سیکڑوں شعرا پیدا ہوئے وہیں نثر لکھنے والے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ نثر میں افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈراما نگاری، مضمون نگاری یا پھر تنقید کیوں نہ ہو۔ ان سبھی اصناف پر طبع آزمائی کرنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اسی لیے ریاست میں اشاعت و طباعت پر پابندی تھی۔ حکمران طبقہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کی عوام کتب و اخبار کی اہمیت سے واقف ہو کیونکہ انھیں اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں عوام اپنی نثری تخلیقات سے ریاست اور انگریزوں کے ظلم و زیادتیوں کے خلاف آواز بلند نہ کرنے لگیں۔ اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ریاست کی جانب سے شعرا حضرات کی ہی پذیرائی کی گئی اور نثر نگاروں اور صحافیوں کو ریاست سے باہر کا راستہ دکھا دیا گیا۔ اس ضمن میں گوپال متل رقم طراز ہیں:

"معلوم ہوا کہ سی آئی ڈی نے اپنی تحقیقات کے سلسلے میں یہ لکھ دیا تھا کہ درخواست کنندہ مالیرکوٹلہ کا باشندہ ہے اس لیے کاغذات ریاست کو بھیج دیے گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ درخواست داخلِ دفتر ہوگئی کیونکہ نواب مالیرکوٹلہ کو اخباروں سے سخت وحشت تھی اور یہ بات تو انھیں گوارا ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ ان کی رعایا کا کوئی فرد اخبار نویس جیسے خطرناک پیشے کو اختیار کرے۔"

(لاہور کا جو ذکر کیا، گوپال متل، ص 90)

ایسے حالات میں ریاست مالیرکوٹلہ میں نثر نگاروں کا پنپنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا اور پھر ریاست میں اشاعت و طباعت کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے اس شہر میں نثر نگاری کو کوئی فروغ نہیں مل سکا اور نہ ہی ان کی تخلیقات کتابی شکل میں منظرِ عام پر آسکیں۔ بہر حال مالیرکوٹلہ میں اردو کہانی کا جنم تقسیمِ وطن سے پہلے ہوا تھا۔ محققین کے مطابق آزادی سے پہلے شہاب مالیرکوٹلوی، منظور حسن ناہی اور کمال مالیرکوٹلوی نے چند افسانے تخلیق کیے تھے لیکن آج ان کے افسانے دستیاب نہیں ہیں۔ مولانا شہاب مالیرکوٹلوی بطور صحافی اور مذہبی اسکالر کے طور پر جانے جاتے ہیں اور منظور حسن ناہی اور کمال الدین کمال کا شمار مالیرکوٹلہ کے استاد شعرا میں ہوتا ہے۔ عبدالرزاق قریشی مولانا شہاب مالیرکوٹلوی کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولانا نے جو چند افسانے لکھے ہیں، وہ حقیقی معنی میں سچے افسانے یا واقعات ہیں۔ ان کے بعض دوستوں نے مختلف اوقات میں انھیں اپنی یا کسی اور کی داستانیں سنائیں۔ ان داستانوں کو موصوف نے افسانے کی صورت میں قلم بند کر دیا۔ مثال کے طور پر ان کا ایک افسانہ 'انسان سے شیطان' ہے۔ 1930 کی تحریک میں ان کے ایک دوست جو ایک اردو روزنامہ کے ایڈیٹر تھے گرفتار ہوئے ان پر مقدمہ چلا اور انھیں سزا ہوئی۔ جیل میں ایک غیر سیاسی قیدی سے ان کو خاص طور پر انسیت ہوگئی۔ اس نے انھیں اپنی سرگزشت من و عن سنائی۔ جب وہ رہا ہو کر گھر آئے تو انھوں نے اس قیدی کی سرگزشت مولانا کو سنائی اور انھوں نے اس کو سینے سے سفینے میں منتقل کر دیا۔"

(مولانا محمد عمر خاں شہاب مالیرکوٹلوی نمبر، کتاب نما، جنوری 1978)

اس ضمن میں ڈاکٹر طارق کفایت مالیرکوٹلہ میں اردو افسانہ نگاری کی ابتدا کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مالیرکوٹلہ کے ادیبوں نے اگرچہ آزادی سے پہلے بھی فکشن کے میدان میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائے تھے مثلاً مولانا محمد عمر خاں شہاب، ناہی صاحب اور مولانا کمال نے چند افسانے لکھے تھے جو شائع بھی ہوئے۔ ان کے ناولوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے جو اب دستیاب نہیں ہیں لیکن فکشن کی جانب کسی مرتب رجحان کی نشاندہی کم ہی ہوتی ہے۔ البتہ انھیں افسانوی ادب کی ابتدائی کوششیں ہی کہا جا سکتا ہے۔"

(مجلہ نثر نگارانِ مالیرکوٹلہ: شخصیت اور فن نمبر، ص 11)

مالیرکوٹلہ میں اردو افسانہ نگاری کا آغاز کب اور کس نے کیا اس کے بارے میں اب تک واضح نہیں ہو سکا۔ اس ضمن میں مولانا شہاب مالیرکوٹلوی، منظور حسن نامی اور کمال الدین کمال کے افسانوں کو مالیرکوٹلہ میں اردو افسانہ نگاری کے اولین نقوش کہا جا سکتا ہے۔

بے شک مالیرکوٹلہ میں افسانہ نگاری کا آغاز آزادی سے پہلے ہوا تھا۔ لیکن اس نے ترقی آزادی کے بعد 1960-70 کی دہائی میں کی۔ آزادی کے بعد یہاں کے کئی ادیبوں نے افسانے لکھے۔ ان میں پریم وار برٹنی کا نام بہت اہم ہے۔ پریم کی شخصیت مالیرکوٹلہ کے دوسرے ادیبوں و شاعروں سے مختلف ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔ چند افسانے لکھنے کے بعد پریم نے شاعری کی طرف رخ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا شمار اپنے دور کے ممتاز شاعروں میں ہونے لگا۔ پریم نے شاعری کو ذریعہ معاش بنایا۔ لیکن صرف شاعری ہی گھر چلانے کے لیے کافی نہیں تھی۔ اس لیے انھوں نے مختلف فرضی ناموں سے افسانے لکھے۔ ڈاکٹر سلطان انجم نے اپنے تحقیقی مقالے 'پریم وار برٹنی: شخصیت اور فن' میں لکھتے ہیں کہ پریم نے پی کے اگروال، اجتبا ناز (پریم کی بیٹی) اور کمل کمار کے فرضی ناموں سے افسانے لکھے۔ اصل میں پریم نے افسانے صرف روپیہ کمانے کے لیے لکھے تھے۔ لیکن ماہنامہ 'روبی' دہلی نے ایک دن اچانک پی کے اگروال کے چہرے کا نقاب اتار دیا اور پریم کو افسانہ نگار کے طور پر ادبی دنیا میں روشناس کروایا۔ پریم نے تقریباً 18 افسانے لکھے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے فلمی دنیا کے ارد گرد گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر انجم کے مطابق پریم اپنے افسانوں کو 'سیلولائیڈ کے لوگ' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کرنا چاہتے تھے۔

اس دور کے دوسرے افسانہ نگاروں میں کرشن امیتھ، تشنہ ادیب، مرحوم پال شہزادہ، ناز بھارتی، ظہور احمد ظہور اور اشوک نرولش وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ ان سبھی قلم کاروں کے افسانوں کی تعداد بہت کم ہے اور کسی کا افسانوی مجموعہ بھی شائع نہیں ہوا اور نہ ہی ان میں سے کسی کو بطور افسانہ نگار شہرت حاصل ہوئی۔

اصل میں مالیرکوٹلہ کا ادبی ماحول شروع سے شاعرانہ رہا ہے۔ یعنی مالیرکوٹلہ کی ادبی فضا پر شاعری اور شاعروں کا غلبہ رہا ہے۔ اس لیے ہر افسانہ نگار چند افسانے لکھنے کے بعد شاعری کی طرف راغب ہو جاتا تھا۔ ساتھ ہی یہاں کے شعرا و ادبا میں چھپنے کا رواج بہت کم تھا جو آج بھی برقرار ہے۔ حالت یہ ہے کہ آج ان میں سے بیشتر کے افسانے شاید ہی دستیاب ہوں۔

1970-80 کی دہائی میں ڈاکٹر نریش اور محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور مالیرکوٹلہ میں اردو افسانے کا سنہری دور شروع ہوا۔ 1980 میں ڈاکٹر نریش کے دو افسانوی مجموعے 'ننھے ہاتھوں کا لمس' اور 'ٹھنڈے سائے' شائع ہوئے۔ ڈاکٹر نریش کو مالیرکوٹلہ کا پہلا صاحب کتاب افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ افسانہ نگاری کے علاوہ شاعری، ڈراما نگاری، ناول نگاری اور مضمون نگاری ڈاکٹر نریش کے پسندیدہ میدان ہیں۔ تقریباً ایک درجن اردو کتابوں کے خالق ڈاکٹر نریش کو بہت سے اعزازات کے ساتھ ساتھ پنجاب سرکار کی جانب سے شرومنی ساہت کار پرسکار مل چکا ہے۔

مارچ 1974 سے مالیرکوٹلہ میں ایک مقامی اخبار 'صدائے اہل پنجاب' کے ذریعے افسانوی ادب میں قدم رکھنے والے محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے اپنے 40 سالہ ادبی سفر میں دور حاضر کے افسانہ نگاروں میں اپنا مقام بنایا ہے۔ 200 کے قریب افسانے تخلیق کر چکے محمد بشیر مالیرکوٹلوی کے پانچ افسانوی مجموعے بالترتیب 'قدم قدم موت' 1987، 'سسکتے لمحے' 1999، 'چنگاریاں' 2007، 'بکھرتے شجر' 2010 اور 'کرب آگہی' 2013 شائع ہو چکے ہیں۔

محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ فروغ افسانہ کے لیے بھی کام کیا ہے۔ مالیرکوٹلہ میں افسانوی ماحول پیدا کرنے کی غرض سے 1984 میں موصوف نے 'انجمن' کے نام سے اپنے ہم عصروں پروفیسر محمود عالم، خالد کلاچت، ایم انوار انجم، انوار آذر، ماسٹر عبدالعزیز، ڈاکٹر انوار صدیقی اور مشتاق وارثی کے ہمراہ ایک انجمن تشکیل دی۔ چند ہی افسانوی نشستوں کے بعد اس شہر میں مکمل طور پر افسانوی ماحول بنا۔ شعرا حضرات بھی افسانے لکھنے کے لیے کوشش کرنے لگے۔ اقبال ملک نے جو کہ شاعر تھے افسانہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ 1985 میں انجمن کی جانب سے 'شام افسانہ' کا اہتمام کیا گیا جس میں ملک کے نامور ادیب بلراج کومل، جوگندر پال، رتن سنگھ، ستیش بترا، اوم کرشن راحت، دیپک بدکی سوز اور ڈاکٹر کیول دھیر وغیرہ تشریف لائے تھے۔

1980 کے بعد نئی نسل کے کئی افسانہ نگار ابھر کر سامنے آئے جن میں ڈاکٹر سلطان انجم، لیاقت کومل، ڈاکٹر انوار احمد انصاری، ایم انوار انجم، منصور عالم، ڈاکٹر محمد ایوب خاں، ساجد اسحاق، اشرف محمود نندن، یوسف سراج اور شہزاد بشیر کے نام قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر سلطان انجم کے افسانوں کے دو مجموعے 'ڈوبتے سورج کا منظر' اور 'خواہشیں خواب ہیں' بالترتیب 1989 اور 1998 میں شائع ہو چکے ہیں۔ افسانہ نگاری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کرنے والے ڈاکٹر انجم نے بھی مالیرکوٹلہ کے افسانہ نگاروں کی روایت کو اپنایا ہے۔ موصوف نے افسانہ نگاری کے علاوہ تنقید، نظم، غزل، تبصرہ اور رپورتاژ وغیرہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ موصوف نے اردو کے معتبر جرائد میں چھپ کر مالیرکوٹلہ کا نام روشن کیا ہے۔ کئی کتابوں کے خالق ڈاکٹر انجم کو ہریانہ سرکار کی جانب سے حالی ایوارڈ اور پنجاب سرکار کی جانب سے شرومنی ساہت کار ایوارڈ مل چکا ہے۔

لیاقت کومل نے 1980 میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ موصوف کے افسانے روزنامہ 'ہند سماچار'، ماہنامہ 'تعمیر ہریانہ' اور ماہنامہ 'پرواز ادب' میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لیاقت کے تحریر کردہ افسانوں کی تعداد بیس سے پچیس کے درمیان ہے۔ اس کے علاوہ موصوف نے 'منٹو کے شاہکار افسانے۔ تحقیق و تجزیہ' پر ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد انصاری نے بھی تقریباً 1980 میں افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ موصوف کے دو افسانوی مجموعے 'انتشار' 2004 میں اور 'زندگی کی تلاش میں' 2010 میں شائع ہو چکے ہیں۔ موصوف کے افسانے مشرقی پنجاب سے شائع ہونے والے جرائد میں برابر شائع ہوتے رہے ہیں۔

ایم انوار انجم اس نسل کے واحد افسانہ نگار ہیں جنھوں نے افسانوی دنیا میں بطور افسانہ و افسانچہ نگار اپنی پہچان بنائی ہے۔ انوار انجم کا افسانوی سفر تقریباً تین دہائیوں پر مشتمل ہے۔ موصوف کے افسانے و افسانچے ہندوستان بھر کے ادبی جرائد کی زینت بن چکے ہیں۔ انوار انجم کے افسانچوں کا مجموعہ 'سنگریزے' شائع ہو چکا ہے۔ منصور عالم نے بھی 1982 میں کہانی لکھنی شروع کی۔ ان کی بیشتر کہانیاں ماہنامہ 'نور' رامپور میں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ ان کے افسانے ماہنامہ 'بیسویں صدی' نئی دہلی کی زینت بھی بنے۔ ڈاکٹر محمد ایوب خاں نے 1983-86 میں کالج کے دنوں میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ موصوف کے افسانے مشرقی پنجاب کے مختلف رسائل و جرائد کی زینت بنے۔ افسانہ نگاری کے علاوہ اردو افسانے کے تعلق سے ڈاکٹر محمد ایوب خاں کا ایک اور اہم کام ان کا ایم فل کا تھیسس 'آزادی کے بعد پنجاب کے اردو افسانہ نگار' ہے۔ ساجد اسحاق نے بھی ادبی زندگی کا آغاز بطور افسانہ نگار کیا۔ ان کے کئی افسانے مسلسل ہند

سماچار میں شائع ہوتے۔ اشرف محمود نندن ایڈیٹر ماہنامہ "پرواز ادب" پٹیالہ نے بھی کالج کے دنوں میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ ان کے مسلسل کئی افسانے ہند سماچار میں شائع ہوئے۔ ساجد سحاقی اور اشرف محمود نندن اپنی صحافتی ذمے داریوں کی وجہ سے اپنے افسانوی سفر کو جاری نہیں رکھ سکے۔

1980-90 کی دہائی کی یا پھر بیسویں صدی کی آخری دہائی میں بھی مالیرکوٹلہ کے افسانوی میدان میں نئی نسل کے نوجوان قلمکاروں کی آمد جاری و ساری رہی۔ اس دور میں سالک جمیل براڑ، عبدالستار ساحر، حنیف آزاد اور اختر شاد جیسے نوعمر قلم کاروں کے افسانے ہند سماچار میں شائع ہونے شروع ہوئے۔ ان نوعمر افسانہ نگاروں کی جہاں ہند سماچار گروپ نے حوصلہ افزائی کی وہیں ایک بار پھر معروف افسانہ نگار محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے منصور عالم اور ڈاکٹر انوار احمد انصاری کو ساتھ لے کر افسانہ کلب کی بنیاد ڈالی اور فروغ اردو افسانہ اور نئے افسانہ نگاروں کی تربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ پروفیسر محمود عالم، ڈاکٹر محمد ایوب خان، شکیل خاں اور انسپکٹر محمد حبیب بھی اس کام میں محمد بشیر مالیرکوٹلوی کے ساتھ ساتھ رہے۔ محمد بشیر مالیرکوٹلوی اور افسانہ کلب کی کوشش رنگ لائیں اور ہفتہ وار تنقیدی نشستوں کے علاوہ ماہانہ نشستوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ افسانہ کلب کی وجہ سے پہلی بار مالیرکوٹلہ میں افسانوی ماحول پیدا ہوا۔ سیکڑوں کی تعداد میں افسانے اصلاحی تنقید کی بھٹی میں تپ کر کندن بنے۔ نتیجے کے طور پر اس نسل کے افسانہ نگاروں کے افسانے ملک و بیرون ملک کے اخبار و رسائل میں شائع ہونے شروع ہو گئے۔ افسانہ کلب کی جانب سے ماہانہ نشستوں کے علاوہ شام افسانہ، ایوارڈ فنکشن اور سیمیناروں کے ذریعے نئی نسل کی آبیاری کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھر کے نامور افسانہ نگاروں کی افسانوی خدمات کے اعتراف کا سلسلہ شروع ہوا۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ارشد نعیم، محمد شکیل انصاری، محمد انیس قریشی، رشید عباس، عابد علی خاں، ارشد شریف، سیف الدین ساجد، محمد عمر فاروق، امتیاز ساحل اور محمد الیاس جیسے نوعمر قلم کار بھی مالیرکوٹلہ کے افسانوی افق پر وارد ہوئے۔ محمد بشیر مالیرکوٹلوی کی سرپرستی اور افسانہ کلب کا پلیٹ فارم ان نئے قلم کاروں کے لیے نعمت ثابت ہوا۔ نئی نسل کے ان افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں سے چند نام ابھر کر سامنے آئے جنھوں نے افسانوی دنیا میں مالیرکوٹلہ کا نام روشن کیا۔ ان میں سالک جمیل براڑ، عبدالستار ساحر، محمد حنیف آزاد، ارشد نعیم، محمد شکیل انصاری، رشید عباس، عابد علی خان اور محمد عمر فاروق کے نام قابل ذکر ہیں۔

سالک جمیل کا افسانوی سفر 1997 میں ہند سماچار سے شروع ہوا۔ محض 24 سال کی عمر میں سالک جمیل براڑ کا

مالیرکوٹلہ کالج

پہلا افسانوی مجموعہ "لمحے" 2006 منظر عام پر آیا۔ دوسرا افسانوی مجموعہ "مٹی کے رنگ" زیر ترتیب ہے۔

عبدالستار ساحر نے 1998 میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ ساحر کے افسانے کئی سال تک مسلسل ہند سماچار میں شائع ہوتے رہے۔ محمد حنیف آزاد کا شمار بھی اس نسل کے سنجیدہ اور کامیاب افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ موصوف کے افسانے اکثر ہند سماچار میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ارشد نعیم نے بھی بطور افسانہ نگار اپنی پہچان بنائی ہے۔ موصوف کا افسانوی سفر تقریباً 2000 میں ہند سماچار سے شروع ہوا۔ ارشد نعیم کے افسانے ملک بھر کے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ 50 سے زائد افسانے تخلیق کر چکے اس نوجوان افسانہ نگار کا افسانوی مجموعہ "خواب خواب زندگی" شائع ہو چکا ہے۔ محمد شکیل انصاری کا پہلا افسانہ "نئی کونپل" 29 اگست 2000 کو روزنامہ ہند سماچار جالندھر میں چھپا۔ موصوف کے افسانے بھی ہند سماچار کے علاوہ "پاکیزہ آنچل" نئی دہلی اور "گونج" حیدرآباد میں شائع ہو چکے ہیں۔ رشید عباس نے افسانہ نگاری کا آغاز اردو میں کیا تھا لیکن پھر انھوں نے پنجابی کہانی میں [illegible] ہے۔ ادب اطفال لکھنے والے عابد علی خاں ابھی تک اپنے افسانوی مجموعے "خوابوں کی خوشبو" کے ذریعے 2010 میں افسانوی ادب میں وارد ہوئے۔ موصوف کا ایک اور افسانوی مجموعہ "بے نام رشتے" بھی شائع ہو چکا ہے۔ موصوف کے افسانے کئی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ محمد عمر فاروق نے ادبی زندگی کا آغاز بطور شاعر کیا تھا لیکن موصوف پچھلے سات آٹھ سال سے مسلسل افسانے لکھ رہے ہیں۔ فاروق کے افسانے ملک بھر کے جرائد میں برابر شائع ہو رہے ہیں۔

2010 کے بعد بھی مالیرکوٹلہ میں نئے افسانہ نگاروں کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ محمد ناصر آزاد، محمد شفیق قریشی اور ڈاکٹر روبینہ شبنم نے بھی افسانوی میدان میں قدم رکھا ہے۔ محمد ناصر آزاد اختصار کے قائل ہیں۔ موصوف کے مختصر افسانے ہند سماچار میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ شکیل احمد پنجاب ہوم گارڈز اینڈ سول ڈیفنس میں اسسٹنٹ کمانڈنٹ کے عہدے سے ریٹائر ہو کر افسانوی دنیا میں وارد ہوئے ہیں۔ موصوف اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ شکیل احمد کے افسانے مشرقی پنجاب کے مختلف اخبار و رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں مالیرکوٹلہ کے ادبی ماحول، مختلف ادوار میں یہاں کی افسانوی سرگرمیوں اور یہاں کے تقریباً سبھی افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف پیش کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ سرزمین مالیرکوٹلہ کا افسانوی سفر [illegible] [illegible] ہے۔

■

Salik Jameel Brar, W-14/320, Brar Street, Hazrat Shaikh Road, Maler, Malerkotla - 148023 (Punjab)

افسر کاظمی

گوپال متل

ماہنامہ 'تحریک' کے حوالے سے

عالم رنگ و بو میں قدرت کے ہاتھوں کچھ ایسی شخصیات وجود میں آتی ہیں جن سے قدرت کو کچھ اہم کام لینا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں ہرگز یہ خیال نہ کیا جائے کہ قدرت کے دیگر شاہکار غیر اہم ہیں بلکہ کہنا یہ مقصود ہے کہ ہر کام ہر ایک کے بس کا نہیں ہوتا اور نہ ایک طرح کا کام سب بہتر ڈھنگ سے کر سکتے ہیں۔ بہترین کارکردگی کی خاطر قدرت کچھ ایسے لوگوں کا انتخاب کرتی ہے جو عام فرد سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک اہم نام جناب گوپال متل کا ہے۔

گوپال متل کی پہچان بطور صحافی، شاعر، مترجم، سیاسی مبصر کے علاوہ ایک مخلص، منفرد فرد کے طور پر کی جاتی ہے۔ عمر کا ایک بڑا حصہ صحافت کی نذر کیا۔ درمیان میں شاعری بھی کی۔ ابتدائی دنوں میں مترجم کی ذمے داریاں بھی اٹھائیں۔ معاملہ کسی ادبی جلسے کا ہو یا احباب کی بزم آرائی ہو گوپال متل اپنی پوری انفرادیت کے ساتھ موجود رہتے ہیں۔ زندگی کے تعلق سے ان کا مشاہدہ گہرا، حالات کے بہترین نباض، اپنی رائے میں اس قدر بے باک کہ اپنے ہم عصر ہوں یا تصور اسٹیج، انھوں نے بغیر کسی لحاظ کے اپنی بات کہی، کسی سے مرعوب نہیں ہوئے خواہ وہ پنڈت آنند نارائن ملا ہوں یا مراجی ایس آئی جو ان کے نزدیک درست و مقدم تھا اسے برملا کہا۔ ایسی صورت حال میں جب حالات اُن کے موافق نہ ہوں اپنی پہچان کو بنائے رکھنا کس قدر مشکل ہوسکتا ہے یہ وہی لوگ جان سکتے ہیں جنھیں ان حالات کا تجربہ ہو—

گوپال متل صاحب کی سب سے اہم اور قابل توجہ خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کسی بھی مسئلے یا سوال پر اپنی جو رائے قائم کی ہے اس پر انھیں اتنا بھروسا اور یقین ہوتا کہ وہ اپنی رائے نہیں بدلتے۔ استدلال کی بنیادیں اتنی مضبوط ہوتیں کہ اس سے انکار مشکل ہوتا۔ رویہ یا طریقۂ اظہار اکثر جارحانہ ہوتا لیکن اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جاتا۔ نظریاتی اختلاف کو ذاتی مراسم پر کبھی حاوی ہونے نہیں دیا۔ چونکہ مجھے گوپال متل کے سیاسی و ادبی نظریے کے تعلق سے گفتگو کرنی ہے وہ بھی 'تحریک' کے حوالے سے جو ان کے نظریات کی تشہیر کا سب سے مضبوط آرگن تھا لہٰذا اس طرف لوٹتا ہوں۔

1953 میں گوپال متل نے دلی سے 'تحریک' کا اجرا کیا۔ لیکن یہاں ان کی صحافتی زندگی کی شروعات نہیں ہے۔ تحریک کے اجرا سے قبل روزنامہ بھارت ماتا، ملاپ، نیشنل کانگریس، چترا، ویکلی، جگت نگی، مزدور کی آواز، شاہکار اور ادب لطیف سے بھی وابستہ رہے اور تقسیم ہند کے بعد انھوں نے 'تحریک' (ماہنامہ) کا اجرا کیا اور 1981 تک یہ رسالہ پوری پابندی کے ساتھ نکلتا رہا۔

اپنے اس طویل صحافتی سفر کے دوران یقیناً انھیں تجربات و مشاہدات کی ایسی دنیا ملی جہاں سے انھوں نے بہت کچھ اخذ کیا۔ اپنے وقت کے بہترین اور صاحب علم حضرات کی صحبت کا فیض اٹھایا۔ جہاں سے ان کی سیاسی و ادبی نظریہ سازی کا دور بھی شروع ہوتا ہے۔ ایک معتبر صحافی کی اہم خوبی یہ بھی ہے کہ اس کا اپنا نظریہ بھی ہو اور اپنے اس نظریے کی تشہیر میں نہ صرف بے باک ہو بلکہ مضبوط دلائل بھی رکھتا ہو۔ ورنہ خیالات و نظریات کی تکرار اُسے جلد زیر کر سکتی ہے۔ تحریک کی اشاعت کا سب سے بڑا فائدہ انھیں یہ ہوا کہ اپنے خیالات و نظریات کو عوام کے سامنے رکھنے اور سمجھانے کا بہترین موقع میسر آیا۔ چونکہ صحافتی ذمے داریوں اور تقاضوں سے وہ پوری طرح واقفیت رکھتے تھے۔ نیز انگریزی زبان پر عبور نے ان کے لیے پھیلاؤ کے راستے کھول رکھے۔ تحریک کی نسبت سے 28 سالہ یہ سفر نہ صرف ان کے سیاسی نظریات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ ان کے ادبی نقطۂ نظر کی بھی وضاحت ہوتی ہے— اردو زبان کے عاشقین میں تھے اور اس زبان کی خاطر بہت کچھ برداشت کیا بلکہ اس کے حق میں لڑائی بھی لڑی۔ ان کی تحریروں میں آپ رواداری نہیں تلاش کر سکتے۔ اُن کے مضامین اس بات کی وضاحت دیتے ہیں کہ انھوں نے جب بھی کسی موضوع کو اٹھایا پورے استدلال، جواز اور شہادت کو سامنے رکھا—

اس سے قبل کہ گفتگو کا سلسلہ دوسری طرف جائے 'تحریک' کے اجرا کے جواز پر بھی غور کرنا لازمی ہے۔ ماہنامہ 'صبح امید' کے تلخ تجربے سے کبھی بھی وہ ہمت ہار کر بیٹھ سکتے تھے اور کچھ وقت اس میں گزرا بھی۔ لیکن فکری سطح پر ان کے اندر جو بے چینی تھی اُسے وہ دبا کر بہت دنوں تک نہیں رہ سکتے تھے۔ اس وقت کے سیاسی حالات پر نظر ڈالیں تو کسی بھی حساس صاحب نظر کے لیے کس قدر مشکل تھا کہ وہ اپنی باتوں کو یا اپنی رائے کو بہت دنوں تک دبائے رہے۔ آزادی کے بعد ملک میں رونما ہونے والے حالات، سیاسی طور پر انتشار، بے اطمینانی اور غیر یقینی صورت حال نے آسودگی اور اطمینان کو متاثر کر رکھا تھا۔ نئی نئی حاصل آزادی چند لوگوں کے ہاتھوں سمٹ کر رہ گئی تھی اور جس آزادی کا تصور عوام کے ذہنوں میں تھا یا انھیں پیش کیا گیا تھا وہ محض خواب بن کر رہ گیا تھا۔ دوسری طرف ملک کی تحریکات نے سر اٹھانا بھی شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے دانشوروں کی سوچ متاثر ہو رہی تھی اور آنے والے دنوں میں سیاسی صورت حال کے یکسر بدل جانے کا امکان گہرا رہا تھا۔ ایسے دور میں گوپال متل جیسے صحافی کیونکر خاموش بیٹھ سکتے تھے۔ میرے خیال میں یہ ایک بڑی وجہ تھی ہے 'تحریک' کے اجرا کی۔ لفظ 'تحریک' کا

اختیار کرنے کے پیچھے غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ فرار ادبی کی ایک تحریک کو سرد کرنے یا اس کا مقابلہ کرنے کی خاطر دوسری تحریک ضروری ہے۔ ماہنامہ 'تحریک' کی اشاعت سے ان کا یہ منصوبہ کسی حد تک کامیاب رہا۔ ترقی پسند تحریک جو ادبی حلقوں سے ایک زبردست تحریک مانی جاتی ہے اپنے ابتدائی سالوں میں اس قدر مضبوط تھی کہ اس کے آگے کسی تحریک کا ٹھہر جانا ناممکن تھا۔ جس وقت یہ تحریک اپنے عروج پر تھی شمالی ہندوستان کا کوئی بھی معروف ادیب و شاعر ایسا نہیں تھا جو اس تحریک سے وابستہ نہیں تھا۔ کچھ براہ راست تھے اور کچھ ہمدردی رکھتے تھے لیکن اس تحریک کی کمیوں اور کوتاہیوں پر کچھ کہنے یا لکھنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ اس ماحول میں حسن عسکری کے علاوہ جو توانا آواز ابھرتی ہے وہ گوپال متل کی ہے۔ 'گوپال متل' ہر صورت میں جمہوری نظام کے حامی تھے۔ جمہوری نظام میں پائی جانے والی خامیوں کے باوجود اس بات کا انھیں یقین تھا کہ ہندوستانیوں کے لیے یہی طرز حکومت سکون و امان کا سبب بن سکتی ہے۔ وہ قومی یکجہتی اور سیکولرزم کے علم بردار تھے۔ ان کے سیاسی نظریات کی جھلک ان کے لکھے ہوئے کئی مضامین میں صاف نظر آتی ہے۔ خصوصاً 'وہ جو پاؤں سے ووٹ ڈالتے ہیں'، 'جمہوریت کے تحفظ کا حلف'، 'اعتدال پسند کمیونسٹ'، 'ہندوستانی ادیب کے فرائض'، 'سیکولرزم اور جمہوریت' جیسے مضامین میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

ان تمام مضامین میں یہ بات عمومی طور پر نظر آئے گی کہ گوپال متل نے اپنے لیے جو مسلک وضع کیا تھا اس سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ دوٹوک اور بے باک رائے سے ہر جا واسطہ پڑتا ہے۔ غیر جذباتی اور غیر جانب دار ہو کر رائے دینا کچھ آسان نہیں ہوتا۔ یہاں دوست سے زیادہ دشمن پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے کچھ ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جو اس سے قبل توجہ کا مرکز نہیں بنے تھے۔ تحریک کی اشاعت کا عہد بھی وہی ہے۔ یہ اس وقت ترقی پسند تحریک کا عروج تھا اور جو اس تحریک سے وابستہ نہیں تھے وہ رجعت پسند اور قدامت پسند گردانے جاتے تھے۔ اس الزام کے خوف سے تخلیق کار اپنی نگارشات تحریک میں اشاعت کے لیے نہیں بھیجتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ گوپال متل کمیونسٹ مخالف تھے لہٰذا کمیونزم کے اصول یا خیال کی تشہیر سے وابستہ کوئی بھی محفل یا جماعت ان کی نگاہ میں معتوب ہو سکتی تھی۔ جوال مظفر حنفی:

''رسالہ تحریک نے اپنی کم و بیش اٹھائیس برسوں کی عمر میں ترقی پسند تحریک کا جم کر مقابلہ کیا۔ ابتدائی چند سال اس پر جتنے بھاری گزرے ہوں گے اس کا اندازہ آج اس لیے نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ تحریک اب اپنی آخری سانس لے رہا ہے۔'' (گوپال متل (1) مصنفات، ص 78)

میں نے پہلے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ اظہار رائے میں گوپال متل نے اعتدال کا دامن نہیں چھوڑا اور ان کے استدلال کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں چاہے ان کی رائے سیاست کے تعلق سے ہو یا ادب کی نسبت سے اپنے مشاہدے اور تجربے کو ایک توازن کے ساتھ پیش کیا۔ یہ ان کی بہت بڑی کامیابی اور خوبی بھی ہے۔ معروف ادیب و صحافی حیات اللہ انصاری نے گوپال متل کی انھیں صحافتی خوبیوں کو خراج عقیدت ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''میں 'تحریک' کا کافی عرصے سے مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ سب سے پہلے جس چیز نے میرے دل میں متل کی قدر پیدا کی وہ ہے ان کا تجزیہ اور استدلال یہ مخالف ہوں یا موافق دونوں حالتوں میں ان کا قلم استدلال کو پیش نظر رکھتا ہے۔ دوسری چیز جس نے مجھے متاثر کیا، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ بہت متاثر کیا وہ ہے ان کا تہہ دار مشاہدہ۔ جس میں جذبات تجربہ اور سب کی بہت توازن کے ساتھ آمیزش ہوتی ہے اور پھر اس نسخے سے جو چیز برآمد ہوتی ہے وہ خوبصورت شاہکار ہوتے ہیں۔''

(حوالہ گوپال متل، شخصیت اور فن، مرتبہ کمار پاشی، ص 212)

تحریک نے جہاں سے خیالات و نظریات کی ترجمانی کی وہیں گوپال متل کے سیاسی نظریے کی ترجمانی بھی کی ہے۔ انھوں نے کمیونزم اور ترقی پسند تحریک کے تعلق سے جو کچھ لکھا یا کہا ان کے نظریے کو سمجھنے میں کافی معاون ہے چند مثالیں 'تحریک' کے حوالے سے درج ہیں:

''جب زندگی میں تضاد ہے تو طبائع میں اختلاف کیوں نہ ہو اور اگر طبائع میں اختلاف ہے تو اس کا اظہار ادب میں کیوں نہ ہو؟ ادب تو بنا ہی تب ہے اگر ادیب کو دل کی بات کہنے کی کھلی آزادی حاصل ہے۔ ہم سرخ یا زرد دوستی نہیں کرتے ادیبوں پر اس قسم کی پابندی عائد کریں کہ وہ یہ لکھیں اور وہ نہ لکھیں۔'' (تحریک، دسمبر 1953)

''انسان کی فکر اور آزادی منشی پر کمیونزم جو پابندی لگاتا ہے اس کا سب سے بنیادی پہلو یہ ہے کہ یہ پابندی کوئی اتفاقی چیز نہیں بلکہ ایک منصوبہ کا جو پورے غور کے بعد پہلے سے طے کر لیا گیا ہے لازمی حصہ ہے

جو لوگ انسانی ذہن کو غلامی کی زنجیریں پہنا رہے ہیں ان کے متعلق صرف یہی کہہ دینا کافی نہیں کہ ان کا ضمیر کن بنیادوں پر بنایا جائے کی وجہ سے عالم سرشاری میں ہیں۔'' (تحریک، اپریل 1956)

'تحریک' سے ماخوذ بالا حوالے جو بھی اداریہ، ابتدائیہ اور بھی باتیں کے عنوان سے لکھی گئی ہیں جو باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں وہ یہ ہے کہ گوپال متل کے نزدیک انسانی فکر کی آزادی، ادیب کی ذمے داریاں غیر شخصی پسند اور ناپسند کا فیصلہ۔ وہ ہر صورت میں ادیب پر کسی اور نظریے کے لادنے کے خلاف ہیں جیسا کہ وہ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تحریک ادیب کی انفرادیت کو سلب کر لیتی ہے اسے ایک مخصوص دائرے کے گرد گھومنے پر مجبور کرتی ہے اور ایک طرح سے فکری غلامی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔

ان کی تصنیف ادب میں ترقی پسندی ایک ادبی تحریک یا سازش اس کی بہترین مثال ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہزار مخالفت کے باوجود انھیں ادیب کی سماجی ذمے داریوں کا احساس ضرور تھا اور اس کی ضرورت پر زور بھی دیتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ نظریات کو باہر سے لادنے کے حق میں ہرگز نہیں تھے اور پوری شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ادب عالیہ بحیثیت داخلی عمل سے پیدا ہوتا ہے اور یہ کہ ادب کو زندگی کا ترجمان بنانے کے لیے زندگی کا براہ راست مطالعہ اور ایک طرح کی غیر جانب داری بہت ضروری ہے۔ ادیب پر ہر طرح کے دباؤ کے خلاف تھے اور اس کی فکری آزادی کے پرچارک تھے۔

اس کے برعکس ان کے نزدیک جمہوری قدروں کی جو تصویر تھی وہ ملاحظہ ہو:

''جمہوریت کی شرط کسی خاص عقیدے یا نقطۂ نظر کو ماننا نہیں بلکہ نقطۂ نظر اور عقائد کے اختلاف کو تسلیم کرتے ہوئے رواداری کے اصول پر کاربند ہونا ہے۔ جمہوریت کی شرط یہ نہیں کہ اپنے نقطۂ نظر کو دوسروں پر ٹھونسا جائے بلکہ اپنے عقائد کی پابندی کرتے ہوئے دوسروں کے عقائد کو برداشت کرنا ہے۔'' (تحریک، اپریل 1958)

''جمہوریت کا یہ تصور بڑا ہی غلط ہے کہ اکثریت کو اپنی من مانی کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں تو یہ تصور اور بھی نقصان دہ ہے کیونکہ یہاں اکثریتیں اور اقلیتیں مذہب کی بنیاد پر مستقل حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ ان حالات میں اگر اقلیتوں کو ان کے مخصوص مفاد کے تحفظ کا

اطمینان دلا دیا جائے اور اس معاملے میں اکثریت کے بجائے اقلیت کے جذبے کا احترام محفوظ رکھا جائے تو جمہوریت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔" (تحریک، اپریل 1950)

"زور جمہوریت پر دیا جانا چاہیے۔ سیکولرازم پر نہیں۔ ایک جمہوری حکومت لازمی طور پر سیکولر ہوگی۔ لیکن سیکولر حکومت کے لیے جمہوری ہونا ضروری نہیں۔ اقلیتوں کی حفاظت جمہوری نظام میں یقینی ہے۔ لیکن ایک ایسے نظام حکومت میں جو سیکولر تو ہے لیکن جمہوری نہیں، یہ حفاظت اتنی یقینی نہیں رہتی۔ ہٹلر نے جرمنی میں جو نازی حکومت قائم کیا تھا وہ سیکولر تھی لیکن وہ نظام چونکہ جمہوری نہیں تھا اس لیے اس نے صرف یہودی اقلیت کے مدنی حقوق ہی پامال نہیں کیے بلکہ ان کے وجود کا ہی خاتمہ کردیا۔ اسی طرح روس اور چین میں کمیونسٹوں نے جو نظام حکومت قائم کیا وہ سیکولر تو ہے لیکن چونکہ جمہوری نہیں اس لیے اقلیتیں وہاں بھی پامال ہورہی ہیں۔" (تحریک، جولائی 1961)

حاصل گفتگو یہ کہ گوپال متل کے سیاسی نظریے کی بنیاد وہ فکر ہے جس کی روشنی میں وہ انسانی فلاح، اس کی بقا، اس کے نظریے کی حفاظت اور فکری آزادی چاہتے ہیں۔ جمہوری قدروں پر بھرپور یقین کے باوجود ایک طرح کا اضطراب ان کے یہاں موجود ہے۔ قائم اکثریت کے رویے اور اقلیت کے حقوق کی پامالی پر خاموش تماشائی نہ ہوتے۔ ان کے نزدیک ایک جمہوری نظام کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ آپ حکمراں طبقے کی جابرانہ کارروائیوں پر گرفت کرسکتے ہیں۔ ان سے جواب طلب کرسکتے ہیں اور جمہوری طریقے سے بدلے بھی لے سکتے ہیں اور آپ کی کوئی پکڑ نہیں۔ اس سے غلطیوں کا مداوا بھی ممکن ہے اور حکمراں طبقے کی جماعت کے لیے ہر وقت ایک خطرہ موجود رہتا ہے۔

گوپال متل کے نظریاتی اور سیاسی نقطۂ نظر کی ایک واضح تصویر کم از کم تحریک کے حوالے سے ابھر کر سامنے آتی ہے اور جو کچھ بھی سامنے آتا ہے اس میں ان کی بے باکی، اور دوٹوک گفتگو کا لہجہ خاصا نمایاں ہے۔ ایک صحافی کے لیے لازمی ہے کہ وہ بغیر کسی مصلحت، رواداری کے اپنی بات ڈنکے کی چوٹ پر کہے۔

آیئے ایک نظر ان کے ادبی نظریے پر بھی ڈالیں کہ ادب اور ادیب کے تعلق سے وہ کیا سوچتے ہیں۔ اردو کے تعلق سے ان کی کیا توقعات تھیں کیونکہ جب تک کسی تخلیق کار کے فکری نقطۂ نظر کو سمجھا نہ جائے ان کے تخلیقی جوہر کی شناخت ہی کہاں آسان نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا تخلیقی حسن اجاگر ہوتا ہے۔ فنکار کا اپنا ایک شعوری اور جمالیاتی احساس ہوتا ہے جسے بروئے کار لا کر وہ اپنی تخلیق میں برتتا ہے۔ 'تحریک' کے حوالے سے گوپال متل نے ادب اور ادیب کے تعلق سے اپنے جن خیالات کی وضاحت کی ہے وہ غور طلب ہیں۔ اس کے دوران میں جھانک کر دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ وہ ایک ڈگر سے ہٹ کر قدرے کھلا اور واضح تصور رکھتے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

"ہر چند کہ ادب کا بنیادی مقصد احساس جمال کی تسکین ہے اور یہ مقصد سماجی اہمیت اور افادیت سے خالی نہیں ہے۔ لیکن اگر ادب اس کے علاوہ اور مقصد بھی انجام دے تو اس سے کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں۔"

(تحریک، اپریل 1953)

"ادب کسی رقیب کو برداشت نہیں کرتا۔ اگر کوئی اسے اپنانا چاہتا ہے تو اُسے اس کا ہی ہو کر رہنا پڑے گا۔ اخلاص کی شرط کو پورا کرنے کے بعد اس بحث کی گنجائش خود ختم ہوجاتی ہے کہ کسی ادبی تحریک کا مقصد کیا ہو۔ اصل نکتہ یہی ہے کہ ادب کو ایک عقیدہ مان لیا جائے۔"

(تحریک، جنوری 1955)

"ادب کو زندگی کا ترجمان بنانے کے لیے زندگی کا براہ راست مطالعہ اور ایک طرح کی غیر جانبداری بہت ضروری ہے۔" (تحریک، مارچ 1955)

"ادب کے فرائض کا فیصلہ کرنے سے پہلے خود ادب کے مقصد کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ یہ بات آسان نہیں۔ لیکن ادب کی اس تعریف سے بہت کم لوگوں کو اختلاف ہوگا کہ اس کا مقصد احساس جمال کی تسکین ہے۔ ایسا ادب پیدا کرنا جو طہارت فکر کا آئینہ دار اور اس کے اظہار کا انداز بھی حسین و جمیل ہو سماجی اعتبار سے بھی بڑی افادیت رکھتا ہے۔ اس طرح ادیب نہ صرف اپنی شخصیت کا اظہار کرکے شخصی ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے بلکہ قوم کے جذبات لطیفہ سے اپیل کرکے بہتر سماجی ماحول کی تشکیل میں مدد بھی دیتا ہے۔" (تحریک، اپریل 1955)

"ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ادیب کا بھی اپنا ضمیر ہوتا ہے اس کی شخصیت کے تقاضے ہوتے ہیں جن کی وہ تکمیل چاہتا ہے۔ وہ ادب کے ذریعے صرف اپنی انفرادی شخصیت کا اظہار ہی نہیں چاہتا بلکہ صداقت کی تلاش بھی کرتا ہے۔ اب اگر اس تلاش کا ماحصل فلسفی اور سیاست داں کی تلاش سے مختلف ہوتا ہے تو ان دونوں گروہوں کو اس پر چیں بہ جبیں ہونے کی ضرورت نہیں۔"

(تحریک، ستمبر 1956)

"ادب بہتر زندگی کی امنگ کا مظہر ہے۔ اس اعتبار سے ادیبوں کا غیر مقلد ہونا قابل فہم ہے اور یہ بات بھی قابل فہم ہے کہ موجودہ صورت حال کے مقابلے میں سماجی تبدیلی کے حامی ہوں۔ جب بے اطمینانی زندگی کی بدصورتی کے خلاف بغاوت کی شکل میں نمودار ہوتی ہے تو یہ مقدس بن جاتی ہے۔ اس طرح یہ زندگی کی تعمیر کا باعث ہوتی ہے اور اس سے زندگی کے مجموعی حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔" (تحریک، فروری 1958)

یہ چند اقتباسات 'تحریک' کے شماروں سے نقل کیے گئے ہیں۔ ان عبارات سے متل صاحب کے ادبی اور ادیب سے متعلق ان کے رویے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کے نزدیک ادب کا بنیادی مقصد احساس جمال کی تسکین ہے۔ پھر بھی گریز نہیں اور تخلیق کے در پر وہ سماجی اہمیت سے انحراف ناممکن ہے۔

ادب کے اپنے کچھ تقاضے ہیں۔ ان کا احترام کیے بغیر ہم ادب سے اپنی غیر مشروط وابستگی قائم نہیں کرسکتے ہیں۔ زندگی کا مطالعہ شرط ہے بغیر زندگی کے نشیب و فراز اور اس کی حقیقت کو بغیر سمجھے ہم عمدہ ادب خلق نہیں کرسکتے۔ ساتھ ہی ساتھ ادب سے متعلق اپنی رائے قائم کرنے سے قبل لازمی ہے کہ آپ ادب کے تقاضوں کو سمجھیں اور یہ بھی غور کریں کہ ادب ان تقاضوں سے کتنا حد تک منحرف بھی ہے یا نہیں۔ ان کے نزدیک سماجی اعتبار سے وہی ادب قابل قدر ہے جو طہارت فکر کا آئینہ دار ہو۔ ادب کا تعلق یقینا ذات سے ہے لیکن اس کا دائرہ محدود نہیں۔ سماج کے تئیں بھی اس کی ذمے داریاں ہیں۔ ہم اسے سماجی نقطۂ نظر سے بھی سمجھنے اور دیکھنے کی کوشش کریں۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم ادب سے ذاتی مطالبہ نہ کریں۔ اسے فکری آزادی ملے وہ دوسرے کی افکار کی ترجمانی سے بچے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو ادیب کے ضمیر پر ضرب کاری لگتی ہے۔ وہ تخلیق کے سہارے اپنی ذات کی تکمیل چاہتا ہے۔ اور ہم سب پر اس کا احترام لازم ہے۔ اس بات پر ہرگز اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ آپ کی پسند کا خیال نہیں رکھتا یا نتائج آپ کی توقعات کے بالکل برعکس سامنے آتے ہیں۔ ادب زندگی کو تازگی، توانائی اور امنگ بخشتا ہے۔ اس کی پامالی ادب کی ہی نہیں ایک بہتر سماج کے تصور کی پامالی ہے۔ لہٰذا گوپال متل کے فکری رجحانات سے جو شکل ابھرتی ہے وہ ایک ذہین، ہوش مند، باخبر انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک غیر جانبدار شخصیت کی آتی ہے۔

■

Dr. Afsar Kazmi, Flat No. 6, M Khan Colony
Azad Nagar, Jamshedpur - 832110 (Jharkhand)
Mob.:09431522253

ریحان ناظر

دہلی کی اردو صحافت کا نقشِ ثانی
اکمل الاخبار

اردو روز اوّل سے ہی ایک عوامی زبان رہی ہے۔ لہٰذا اس زبان کی صحافت کے بانیوں نے بھی ابتدا سے عوامی جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی اور اسے ایک مفید اور موثر آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا۔ برطانوی حکومت کی چیرہ دستیوں اور بے انصافیوں کو بار بار بے نقاب کیا۔ فرقہ وارانہ اتحاد اور حریت کے جذبے کو پروان چڑھایا۔ یہ اردو صحافت کی خوش نصیبی تھی کہ اسے اپنے زمانۂ طفلی سے ہی آزادی کی قیمت کی ادائیگی کرنا پڑی جس سے اس کی نشوونما بڑی تیز رفتاری سے ہوئی اور تین دہائیوں کے اندر ہی اس کے اثرات کا یہ عالم تھا کہ غیر ملکی حکمراں اس سے خوف کھانے لگے۔ انھیں ان کی تحریروں میں بغاوت کے شعلے نظر آنے لگے چنانچہ 1857 کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد اردو صحافت کو اس کا خمیازہ اس طرح بھگتنا پڑا کہ مولوی محمد باقر (دہلی اردو اخبار کے ایڈیٹر) کو 77 سال کی پیرانہ سالی میں بنا کوئی مقدمہ چلائے توپ سے شہید کر دیا گیا۔ صادق الاخبار (دہلی) کے ایڈیٹر مولوی جمیل الدین ہجر کو تین سال قید کی سزا سنائی گئی۔ پیامِ آزادی (دہلی) کے ایڈیٹر مرزا بیدار بخت کے جسم پر سور کی چربی مل کر انھیں پھانسی دے دی گئی۔

سر ہنری کاٹن (Sir Henry Cotton) نے اپنی کتاب Indians and Home Memories میں لکھا ہے کہ انگریزوں نے جب واپس دہلی پر قبضہ کیا تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان سبھی لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا جن کے گھروں سے پیامِ آزادی کا ایک بھی شمارہ برآمد ہوا۔

دراصل اردو صحافت کا آغاز ایک ایسی غیر ملکی حکومت کے زمانے میں ہوا جو صحافت کو اپنے اقتدار کا دشمن سمجھتی تھی۔ یعنی 1822 میں جب اردو اور دیگر چند دیسی زبانوں کے اخباروں کا آغاز ہوا تو سر تھامس منرو جیسے روشن اور لبرل خیالات کے حامل شخص نے بھی ہندوستانی صحافت کو اس کے حقوق سے محروم رکھنے کو ضروری سمجھا۔ چنانچہ ایک موقع پر اس نے کہا۔

"ہم نے اپنی سلطنت کی بنیاد جن اصولوں پر استوار کی ہیں ان کی رو سے رعایا کو اخباروں کی آزادی نہ تو کبھی دی گئی ہے اور نہ کبھی دی جائے گی۔۔۔ اگر ساری رعایا ہماری ہم وطن ہوتی تو میں اخباروں کی انتہائی آزادی کو ترجیح دیتا لیکن چونکہ وہ ہماری ہم وطن نہیں ہے اس لیے اس سے زیادہ خطرناک اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔۔۔ آزاد اخبار نویسی کا پہلا فرض کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ملک کو بیرونی حکمرانوں سے نجات دلائی جائے۔"

(ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں: عتیق صدیقی، ص: 111)

لارڈ کیننگ نے بھی اخبارات پر بندش لگانے کی تجویز پیش کی اور کہا:

"ایک آزاد پریس اور اجنبی لوگوں کا اقتدار دو متضاد چیزیں ہیں اور یہ ایک ساتھ زندہ نہیں رہ سکتیں۔۔۔ ایک جابرانہ طرزِ حکومت ہی اگر اس ملک کے حالات کے تحت مناسب ہے اور ہمارے سامنے بھی ایک ممکن راستہ ہے اور اگر پریس کی بے لگام آزادی اور موجودہ طرزِ حکومت اس ملک میں ہمارے اقتدار کی برقراری سے موافقت نہیں رکھتی تو پھر پریس کی آزادی پر روک لگانی پڑے گی۔" (صحافت: ایم چلپتی راؤ، ص 86)

پریس کی آزادی پر روک لگائی گئی اور Gagging Act (قانون زبان بندی) کے نام سے ایک قانون نافذ کیا گیا جس کے تحت ہر چھاپہ خانے کے لیے لائسنس لینا ضروری کر دیا گیا۔ حکومت نے یہ اختیار حاصل کر لیا کہ وہ جس اخبار کو چاہے بند کر دے اور جس اخبار پر چاہے سنسرشپ لگا دے۔ بظاہر یہ سب زبانوں کے اخباروں کے لیے تھا لیکن دراصل اس کا بیشتر نزلہ اردو اور فارسی کے اخباروں پر گرا۔ مسٹر جے نٹراجن نے "تاریخ صحافت ہند" میں لکھا ہے کہ 1857 کا انقلاب برپا ہوتے ہی شمالی مغربی صوبہ جات کے اکثر اردو اخبارات بند ہو گئے۔ اس قانون کی سب سے زیادہ چوٹ دہلی کی اردو صحافت پر پڑی جو کچھ عرصے کے لیے معطل ہو گئی۔

1857 کی جنگِ آزادی کا مرکز و محور ہندوستان کا پایۂ تخت دہلی تھا اس لیے دہلی سے شائع ہونے والے اس وقت کے اردو اخبارات نے سب سے آگے بڑھ کر جنگِ آزادی میں حصہ لیا۔ بقول سید خورشید مصطفیٰ رضوی:

"اگر صرف دہلی کے اخبارات پر نظر ڈالیں تو ان میں انقلابی جذبات کا دریا موجزن دکھائی دے گا۔ دہلی سے بغاوت کے دوران چند اخبارات خاص طور پر نمایاں تھے مثلاً دہلی اردو اخبار، صادق الاخبار، سراج الاخبار وغیرہ۔"

(تاریخ جنگ آزادی 1857: خورشید مصطفیٰ رضوی، ص 344)

1857 کی ناکامی اور صحافیوں پر ڈھائے گئے مظالم کی وجہ سے دہلی کی اردو صحافت پر تاریکی کے بادل چھا گئے لیکن اس مشکل ترین دور میں بھی اردو صحافیوں نے اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے ایک بار پھر سے بڑی حکمت کے ساتھ مختلف انداز میں ہندوستانی عوام کو ابھارنے کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس ضمن میں پہلا نام سید فخر الدین کا ہے۔ انھوں نے 1866 میں دارالسلطنت دہلی سے "اکمل الاخبار" نامی ہفت روزہ نکالنا شروع کیا۔ یہ اخبار اکمل المطابع میں چھپتا تھا۔ اس اخبار کے ذریعے حصولِ آزادی کے نامکمل کام کو پورا کرنے کی ایک بار پھر سے ابتدا ہوئی۔ یہ اخبار چھاپہ خانوں کی صف میں تو شامل نہیں تھا۔ لیکن تحریکِ آزادی کے سفر کو دوبارہ سے آگے بڑھانے میں اس نے اہم کردار نبھایا۔ اس نے فرنگی حکام کی رعونت، بے انصافی اور ملکی انتخابات کے موضوعات پر جم کر کاری مواد شائع کیا۔ اس اخبار نے غیر ملکی حکومت کے سامراجی عزائم اور منصوبوں کو بے نقاب کرنے کے لیے طنز کا حربہ بھی استعمال کیا اور فرنگی نظام کی پالیسیوں پر سوالات بھی قائم کیے۔ کرسچن مشنریز کی سرگرمیوں کی مخالفت بھی اپنے انداز سے کی اور انگلستان اور ہندوستان میں حکومت کے نظام اور اس کے طریقۂ کار کے فرق کو بھی واضح کیا۔ غرض یہ کہ اس اخبار نے بے باکی اور بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وسیع پیمانے پر برطانوی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف لکھا۔

جنگِ آزادی 1857 کے بعد حکام ایسٹ انڈیا کمپنی کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ وہ اپنے مخالفوں کو پکڑتے، جیلوں میں بھیجتے اور قتل کے ساتھ پیش آتے تھے۔ لاتعداد مخبر تھے اور ان سے زیادہ خوشامدی لوگ تھے جو جھوٹی رپورٹیں کرا کر اپنے مخالفوں کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کراتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے اخباروں میں اس قسم کی خبریں شائع ہوتی تھیں تاکہ ہندوستانی عوام اس بات سے باخبر ہوں کہ برطانوی حکام ہندوستان کو آزاد کرانے اور جنگِ آزادی 1857 میں نمایاں کردار ادا کرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ 11 اکتوبر 1874 کو اکمل الاخبار نے ایسی ہی ایک خبر چھاپی جس میں سعادت خاں کو اندور میں مہاراجہ ہولکر کے رسالے میں

رسالدار تھے) کا جنگِ آزادی 1857 میں شریک ہونا ثابت ہوا تھا اس پر یہ جرم ثابت ہوا کہ اس نے یکم جولائی 1857 کو چند یورپین اور رعایائے سرکاری کو قتل کیا اور باغیوں کا سرگروہ رہا۔

"سعادت پر جو جرم سرگروہ ہونے باغیوں کا تھا وہ اس پر ثابت ہوگیا۔ دو گواہوں نے بیان دیا کہ ہم نے سعادت خان کو تاریخ یکم جولائی 1857 کو دیکھا تھا کہ باغیوں کو فساد کرنے کی ترغیب دیتا تھا اور خود رزیڈنسی کا جھنڈا کھڑا کیا تھا اور جب رزیڈنسی پر توپیں چلائی گئیں تھیں اس وقت سعادت خان موجود تھا۔ سعادت خان نے اپنی طرف سے یہ عذر پیش کیا کہ مجھ کو باغی لوگ اپنے ساتھ زبردستی لے گئے تھے۔ میں نے کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کی مگر اس کا یہ عذر منظور نہیں ہوا"

(اکمل الاخبار دہلی 11 اکتوبر 1874، جلد 9، نمبر 41)

ہندوستانی ریاستیں حکومت برطانیہ کے رحم و کرم پر تھیں۔ وہاں کے مشنری بھی آزاد تھے جہاں چاہتے جس ریاست میں بلا اجازت عیسائی مذہب کا پرچار کرتے اور ہندوستانی مذاہب کی تضحیک کرنے سے بھی باز نہیں آتے تھے ہندو اور مسلمانوں کو دھونس اور لالچ دے کر عیسائی بنا لیتے تھے لیکن کسی ریاست کی مجال نہیں تھی کہ ان کے خلاف کوئی قدم اٹھاتی چنانچہ 26 اگست 1868 کا اخبار اس بات کی تصدیق کرتا ہے:

"کشمیر پادری ڈاکٹر ایلمسلی صاحب بہادر کشمیر میں بے اجازت سرکار مہاراجہ والیٔ جموں کشمیر منادی کر کے لوگوں کو مذہب عیسائی قبول کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ ہر روز صبح کے وقت آدمیوں کو جمع کر کے انجیل شریف کا مضمون سناتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں کہ تم لوگوں کا دین خراب ہے انجیل پر ایمان لاؤ۔ اگر مہاراجہ صاحب اس طرف توجہ فرمائیں گے تو یقین ہے کہ پادری صاحب اس منادی سے باز آ جائیں گے۔"

(اکمل الاخبار دہلی 26 اگست 1868 بحوالہ تاریخ صحافت اردو جلد دوم، پہلا حصہ، امداد صابری، ص 220)

18 ویں صدی میں ہندوستان ایشیا کا ہرا بھرا باغ اور مشرق کا تاج گھر تصور کیا جاتا تھا لیکن برطانوی نظامِ حکومت کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے خشک سالی اور بھکمری کا شکار ہو گیا۔ ہندوستان کی صنعت بھی آہستہ آہستہ زوال پذیر ہوتی گئی۔ جس کی وجہ سے روزگار کا حصول ہندوستانیوں کے لیے ایک پیچیدہ مسئلہ بنتا گیا یہاں تک کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی معاشی پریشانیوں سے گھرا ہوا تھا۔ 5 جنوری 1869 کے اکمل الاخبار میں ایک انگریزی

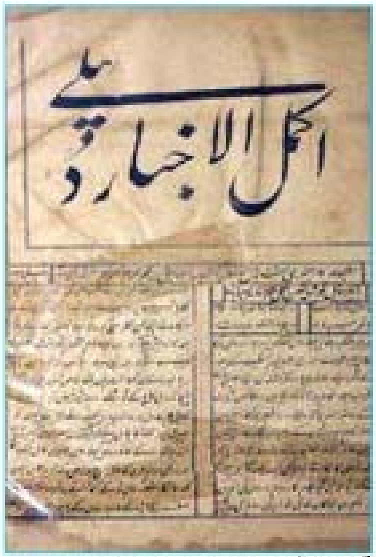

گریجویٹ کی فریاد کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"بھلا سرکار سے یہ تو کوئی پوچھے کہ اتنے ہندوستانیوں کو انگریزی پڑھا کر کیا کرے گی۔ اتنے ہندوستانی انگریزی پڑھ کر کیا کریں گے۔ بی اے، ایم اے یا بکھو اور کیا کر سکیں گے آپ ہی فرمایئے ہمارے لیے وجہ معاش کی کیسی قلت ہے... دنیا میں جو معزز وجوہ معاش کے ہیں ان میں دخل نہیں ہے۔ اب تک ہم نے کیا آپ کہیں گے سول کے عہدے ہیں لیکن آپ نے دیکھا بھی کتنے ہندوستانی انگریزی خواں عہدوں پر ہیں اتنے ہی کہ جس کی انگلیوں پر گن لیجیے... فرمایئے یہ تھوڑی مصیبت ہے۔ جس کا کچھ کر سکیں؟"

(اکمل الاخبار دہلی 5 جنوری 1870 بحوالہ ایضاً ص 222)

اکمل الاخبار ایک ایسا بے باک اخبار تھا اس دور میں جب ہندوستانی عوام انگریزی حکومت کے عتاب کا شکار تھے۔ طرح طرح کے ٹیکس لگا کر ہندوستان کو اور زیادہ مفلس بنایا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ گداگری کے دور میں بھی ایک نئے ٹیکس کی خبر پر اخبار کا ردِ عمل ملاحظہ ہو:

"ہائے ہائے ان غریبوں کی گزر اب کیا کون ہوگا جو رحم نہ کرے گا۔ سب جس ایسی تنگی ہے کہ بالکل غریب جلا ہوئے جاتے ہیں بلکہ کھانا ملنے کا ٹھکانا نہیں۔ سوا تنگ کی طرح لوگ جلبلاتے پھرتے ہیں... ہائے کیا غضب سے آگیا ہے اس پر کوئی نیا ٹیکس جاری ہونے والا ہے۔ وائے وقت اور وائے انصاف اور وائے قریب پہونچا کیا سبب ہے کہ انگلستان میں کوئی نیا ٹیکس جاری ہوتا ہے تو وہاں کے باشندوں سے رائے لی جاتی ہے اور وہاں تھوڑا بھی قحط ہوتا ہے تو اس کے واسطے سیکڑوں تدبیریں ہوتی ہیں اور اس کے برخلاف ہندوستان میں جو بات سرکار کرتی ہے ہندوستانیوں سے رائے نہیں پوچھتی"

(اکمل الاخبار دہلی 22 ستمبر 1868، جلد 3، نمبر 35)

دھوبوں پر تو الگ الگ قسم کے ٹیکس لگے ہوئے ہی تھے جب الٰہ آباد میں مُردوں پر ٹیکس عائد ہونے لگا تو اکمل الاخبار میں بھی اس کی مخالفت میں یہ خبر چھپی:

"الٰہ آباد کی میونسپل کمیٹی نے ہندوؤں کے مُردوں پر ٹیکس لگایا ہے یعنی جتنی لاشیں گنگا جمنا کے کنارے جلائی جائیں ان کے لیے فی لاش دو آنہ روپیہ لیا جائے۔ اس کے خلاف آواز بلند ہوئی۔ ٹیکس لگانا غلط ہے۔"

(اکمل الاخبار دہلی، 1870 بحوالہ تاریخ صحافت اردو، جلد دوم کا پہلا حصہ، ص 232)

مضمون بالا اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل ایک اردو اخبار کا فرنگی حکومت سے طرزِ تخاطب کیا تھا یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ اس دور کے اردو اخبارات نے کس طرح سامراجی قانون کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے میں اپنی بساط سے زیادہ حصہ لیا۔ اکمل الاخبار اس دور کا بہت اہم اخبار تھا اس اخبار نے انگریزی ملازمت کے طور طریقوں، ان کے مذہبی پروپیگنڈوں اور ناانصافیوں کے خلاف بھی قدم بہ قدم بے باکی سے لکھا۔

1857 کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہوگئی اور اس کے اختیارات تاج برطانیہ کو منتقل ہو گئے لیکن بقول گربچن چندن "ہندوستانی صحافت کے معتدل طبقوں نے حکمراں کے نام کی تبدیلی سے اپنے تصورات نہ بدلے"

اس سے دورِ صحافت کا آغاز نئی مشکلوں اور پابندیوں سے ہوا جس کی وجہ سے کئی اخبار ختم اور اشاعت بند ہو گئے لیکن یہ ایک وقتی مصلحت تھی آہستہ آہستہ اردو اخبارات نے عوامی شعور کے جوہر کو روشن کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیا۔

ہندوستان کی اجڑی ہوئی سلطنت کو آباد کرنے کے لیے اکمل الاخبار بھی ایک باشعور اور تعمیر پسند صحافت کے معمار کی حیثیت سے ابھرا۔ اس اخبار نے تمام تر مشکلات، سختیوں اور پابندیوں کے باوجود کسی نہ کسی طرح پرچمِ صحافت کو سربلند کرنے کی انتھک کوشش شروع کی اور 1857 کے مظالم کے بعد بھی برطانوی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف کھل کر اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر کو سچ کر دکھایا:

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
گر توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

■

Huda Fatima, Research Scholar, Dept of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

فضل حسنین

اردو طنزیہ و مزاحیہ شاعری پر طائرانہ نظر

اردو شاعری میں طنز و مزاح کی جھلک اردو کے پہلے شاعر امیر خسرو کے کلام خصوصاً کہہ مکرنی اور دوہے میں مل جاتی ہے۔ اگرچہ امیر خسرو سے منسوب بیشتر اردو کلام مشکوک ہیں کیونکہ خسرو کی بے پناہ مقبولیت کے سبب اس زمانے کے بعض دیگر شعرا بھی اپنا کلام خسرو سے منسوب کر دیا کرتے تھے کہ خسرو کے نام پر ان کا کلام تو مقبول ہو جائے گا لیکن ان کے کلام کے کسی اور معیار کا نام سامنے نہ آنے سے ہمیں اسے خسرو کا کلام ہی سمجھنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر ایک کہہ مکرنی پیش کرتا ہوں:

وہ آوے تب شادی ہووے۔ اس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگیں واکے بول۔ اے سکھی ساجن؟ نا سکھی ڈھول

دو سخنے بھی ملاحظہ فرمائیں:

گوشت کیوں نہ کھایا، ڈوم کیوں نہ گایا — گلا نہ تھا
جوتا کیوں نہ پہنا، سنبوسہ کیوں نہ کھایا — تلا نہ تھا

امیر خسرو کے بعد طنزیہ شاعری کا آغاز ہوتا ہے جس کے امام بلاشبہ میر محمد جعفر زٹلی کہے جا سکتے ہیں۔ حالانکہ انھیں بعض نقاد اور محقق کوئی بڑی اہمیت نہ دی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ خود میر محمد جعفر بھی شاید اپنے کلام کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے زٹلی تخلص اپنایا۔ زٹل کے معنی بکواس یا بے تکی بات ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں جسے شمالی ہند میں اردو کے فروغ کا پہلا دور کہا جا سکتا ہے، شاعری میں سماجی مسائل و مشکلات کا بے باکانہ بیان جس پرزور اور پرشور انداز میں جعفر زٹلی کے یہاں ملتا ہے کسی اور شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گا۔ مثال کے طور پر زٹلی کی نجگیاں جہاں آرا سے چند اشعار:

خان جہاں اتم بھلے بہادر: تھلی دلاری، بچیے منہ
ستی اوپر گرگی سواری: تھلی دلاری، بچیے منہ
تکہ کر دی ٹک حلالی: شاباش تیری ہمت کو
آ کر ہندوستان اجاڑی: تھلی دلاری، بچیے منہ
دکھن میں تھا گرہے جیتے، ہمیں کیوں اب تم ہتھیا
کس کارن تم ہمت ہاری: تھلی دلاری، بچیے منہ

آگے چل کر تو میر تقی میر کے یہاں طنز کا انداز ملاحظہ فرمائیں:

مکے گیا، مدینے گیا، کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا

ایک شعر اور ملاحظہ فرمائیں:

خوبی کی اپنی جنت کبھی ہی انکھیں لاگے
اس کی گلی کا ساکن ہرگز ادھر نہ جھانکے

> خود میر محمد جعفر بھی شاید اپنے کلام کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے "زٹلی" تخلص اپنایا زٹل کے معنی بکواس یا بے معنی بات ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں جسے شمالی ہند میں اردو کے فروغ کا پہلا دور کہا جا سکتا ہے، شاعری میں سماجی مسائل و مشکلات کا بے باکانہ بیان جس پرزور اور پرشور انداز میں جعفر زٹلی کے یہاں ملتا ہے کسی اور شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گا

لیکن جس طرح اردو نثر میں طنز و مزاح کی ابتدا غالب کے خطوط سے ہوتی ہے اسی طرح نظم یعنی شاعری میں بھی طنز و مزاح کا بھرپور استعمال غالب سے ہی شروع ہوتا ہے اور ان کے کلام میں طنزیہ و مزاحیہ اشعار کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں:

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

مؤخرالذکر شعر سے منسوب واقعہ یہ ہے کہ چونکہ بہادر شاہ ظفر نے شاعری میں ذوق کو اپنا استاد بنا لیا تھا اور یہ بات غالب کسی طرح ہضم نہیں کر پا رہے تھے۔ اس لیے بہادر شاہ ظفر کے بیٹے کی شادی کے موقع پر سہرا کہا تو مقطع میں ذوق پر چوٹ کرنے سے نہ چوکے۔ چونکہ ہم عصر شعرا غالب کے حسد کے جذبے سے واقف تھے۔ اس لیے

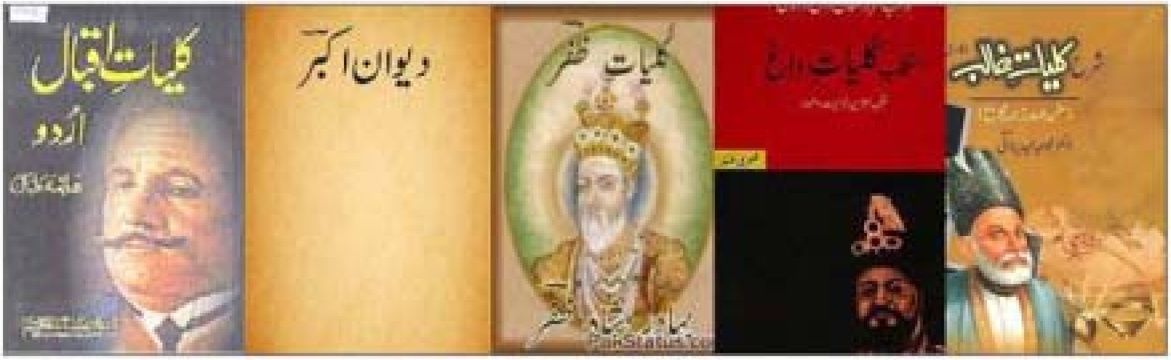

انھیں سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اشارہ کس کی طرف ہے، حتیٰ کہ بادشاہ سلامت کو بھی اپنے استاد پر ایسا طنز اچھا نہ لگا اور انھوں نے اس کا اظہار کرتے ہوئے ذوق سے جواب دینے کو کہا۔ ذوق نے اسی وقت جوابا سہرا لکھا اور غالب کے مقطع کا یوں جواب دیا:

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو ان کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

سہرا شام تک گلی گلی پھیل گیا اور صورتحال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے غالب نے "قطعہ درمعذرت" لکھا جس میں اپنی صفائی میں یہاں تک کہا:

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

داغ دہلوی کے یہاں بھی جگہ جگہ ظریفانہ رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر صرف دو شعر ملاحظہ فرمالیں:

یارب ہمیں دے عشق صنم اور زیادہ
کچھ تجھ سے نہیں مانگتے ہم اور زیادہ
خط ان کا بہت خوب، عبارت بہت اچھی
اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ

لیکن شاعری جب اکبر الہ آبادی تک پہنچی تو اکبر نے ظریفانہ شاعری کو بام عروج پر پہنچا دیا اور اب ان کا نام ادب میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے حوالے سے ہی جانا جاتا ہے حالانکہ اکبر نے اعلیٰ پائے کی سنجیدہ شاعری بھی کی ہے۔ اکبر کے چند ظریفانہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

تعلیم عورتوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ان سے بیگم نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

بحث مذہبی میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

اکبر نے صرف دوسروں پر ہی طنز نہیں کیا بلکہ خود کو بھی ہدف بنایا اور اپنے بیٹے عشرت حسین، جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لندن گئے تھے، انھیں بھی نہ بخشا:

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی
کیک کو چکھ کے سوئیوں کا مزا بھول گئے

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منھ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

اکبر پر ظریفانہ رنگ اس قدر غالب آگیا تھا کہ ان کی صحبت میں علامہ اقبال جیسے فلسفی شاعر نے بھی اس طرح کے اشعار کہہ ڈالے:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدِ نظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

علامہ اقبال سے قبل خواجہ الطاف حسین حالی جیسا گمبھیر شخص بھی اکبر کا "کھٹ مٹھا" قبول کرنے سے خود کو نہ بچا سکا۔ وہ اپنے مسدس 'مد و جزر اسلام' جسے مسدس حالی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، اس میں ایک بند یوں بھی کہہ گئے:

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے
عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے
مقرر جہاں نیک و بد کی جزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

اکبر نے ایک بار شبلی نعمانی کو کھانے کی دعوت دیتے ہوئے یہ لکھ کر رقعہ بھجوایا:

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی
بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اٹھاؤ آج کی رات
کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر ہے جو کچھ دال دلیا
سمجھو اس کو پلاؤ قلیا

جس پر شبلی نے یہ جواب دیا:

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں میں
لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی
جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں

واضح رہے کہ شبلی نے خود کو تیمور سے تشبیہ اس لیے دی کہ تیمور بادشاہ لنگڑا تھا۔ اسی لیے اس کا نام ہی 'تیمور لنگ' پڑ گیا۔ شبلی کے بیٹے کی بندوق حادثاتی طور پر چل جانے سے گولی شبلی کے ایک پیر میں لگ گئی جس کی وجہ سے انھیں پیر کٹوانا پڑا۔

ظفر نوح ناروی اکبر الہ آبادی کے قدر آئے

تو ان پر بھی یہ رنگ چڑھنے لگا۔ مثال کے طور پر ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

جدا رہیں تو جدائی سے دم نکلنے لگے
جو ایک جا پہ ہوں کمبخت زہر اگلنے لگیں
عجب سلگتی ہوئی لکڑیاں ہیں رشتے دار
الگ رہیں تو دھواں دیں، ملیں تو جلنے لگیں

ایک شعر سائل دہلوی کا بھی یاد آ گیا:

یہ مسجد ہے، وہ بت خانہ، تعجب اس پہ ہوتا ہے
جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے، اور یوں بھی

پنڈت ہری چند اختر کا انداز بھی دیکھتے چلیں:

ملے گی شیخ کو جنت ہمیں دوزخ عطا ہوگا
بس اتنی بات ہے جس کے لیے محشر بپا ہوگا
رہے دو دو فرشتے ساتھ اب انجام کیا ہوگا
کسی نے کچھ لکھا ہوگا، کسی نے کچھ لکھا ہوگا
بھروسہ کس قدر تجھ کو ہے اختر اس کی رحمت پر
اگر وہ شیخ صاحب کا خدا نکلا تو کیا ہوگا

اکبر الہ آبادی کے بعد متعدد شعرائے طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں قسمت آزمائی کی جن میں مجید لاہوری، سید ضمیر جعفری، ظریف لکھنوی، ماچس لکھنوی، ناظر خیامی اور ساغر خیامی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ مجید لاہوری کا یہ شعر بہت مشہور ہوا:

شکم کو کر بلند اتنا کہ ہر اک فیسٹ سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری غذا کیا ہے

اسی طرح ماچس لکھنوی کا یہ شعر بھی خاصا مقبول ہوا:

محشر میں گئے شیخ تو اعمال ندارد
جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

لیکن حقیقت یہی ہے کہ اکبر نے طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو جس بلندی تک پہنچا دیا تھا، اس سے آگے جانے کی توبات ہی چھوڑیے، کوئی اس منزل تک بھی نہ پہنچ سکا۔ راجہ مہدی علی خاں پیروڈی بہت اچھی کہتے تھے اور ڈرامائی نظمیں بھی کہتے تھے۔ ان کی ایک نظم "راجہ مہدی علی خاں، عورتوں کی عدالت میں" بہت مقبول ہوئی جس میں عصمت چغتائی گواہی دے رہی ہیں:

میرے شوہر سے ہے ظلم کی پرانی دوستی
قلم کے چکر میں شاہد کو بھی لایا تھا کبھی
ورنہ اس نے عمر بھر فلمیں نہ دیکھی تھیں کبھی
اور مردوں کی طرح یہ بھی بہت مکار ہے
منہ میں اس کے رام رام اور جیب میں تلوار ہے

ہاجرہ مسرور نے یہ بیان دیا:

جاتے جاتے یہ ستم بھی ایک دن یہ ڈھا گیا
میری ہمسائی کی مرغی کو پکا کر کھا گیا
مرغ کو یہ کہہ کے چھوڑا، بھاگ جا تو مرد ہے
زندہ رہ تو بھی ہماری قوم کا ایک فرد ہے

جیلانی بانو نے کہا:

ایکسرے فوٹو یہ اس شاعر کے دل کا تھا جناب
کیا کہوں یہ ایکسرے فوٹو بہت معیوب تھا
دل کے سو ٹکڑے تھے، ہر ٹکڑے میں اک محبوب تھا

دلاور فگار نے طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں اپنا ایک مقام ضرور بنایا۔ ان کی مشہور نظم 'بدایوں کی لاری' کے چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں:

جب چڑھ گئی ہر ایک سواری پہ سواری
اس وقت بریلی سے روانہ ہوئی لاری
سیدھی عدم آباد کو جاتی تھی یہ لاری
مخلوق کو خالق سے ملاتی تھی یہ لاری
ملتا تھا ٹکٹ بس میں شہیدوں کے جہاں کا
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

ویسے دلاور فگار کی شاہکار تخلیق وہی ہے جس میں ایک شاعر کو اس کا استاد سہرا اور مرثیہ ایک ہی صفحے پر لکھ کر دیتا ہے اور شاعر شادی میں سہرا پڑھتا ہے تو پہلا مصرعہ سہرے سے پڑھتا ہے اور دوسرا مصرعہ مرثیہ سے:

اچھے میاں کا عقد ہوا ہے بہار میں
کہہ دو کسی سے پھول بچھاوے مزار میں
روئے حسین پہ سہرے سے کیسی بہار ہے
اے موت آ بھی جا کہ ترا انتظار ہے

دولہا، دلہن شریف گھرانے میں ہیں پلے
لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
نوشاہ کو عروس بڑی ذی ہنر ملی
مرحوم کو حیات مگر مختصر ملی
یارب بنی کے ساتھ ہمیشہ بنا رہے
یہ کیا رہیں گے جب نہ رسولِ خدا رہے
نوشاہ کو عروج وہ ربِّ جلیل دے
اور اس کے وارثین کو صبرِ جمیل دے

دلاور فگار کے بعد رضا نقوی واہی اس صنف کی باگ ڈور سنبھالے رہے۔ ان کے کلام کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

"پروفیسر کا پروگرام" عنوان کی نظم کے چند اشعار:

کالج کے مدرس سے جو آپ کو ملنا
وہ پچھلے پہر اپنے نشیمن میں ملے گا
اور صبح کو وہ چند کتابوں کا مصنف
ناشر سے تقاضائے کمیشن میں ملے گا
اور دن میں وہ کالج میں پڑھانے سے زیادہ
مشاطگیِ زلف الیکشن میں ملے گا

'نقاد کا پروگرام'

نقاد سے ملنا ہے خطرناک کہ ہر دم
وہ حالتِ تجزیہ و تحلیل میں ملے گا
دن رات وہ اک خاص اکڑ خوں کی ادا سے
ذہنیتِ مشکوں کے فرنگل میں ملے گا
بس ایک ہی محور پہ وہ ناچے گا ہمیشہ
جب دیکھیے گرداب تغافل میں ملے گا

آج بھی مشاعروں میں بعض شعرائے کرام مزاحیہ کلام کے نام پر کچھ پڑھتے ضرور ہیں لیکن وہ محض لطیفہ گوئی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور یہ لطیفہ گوئی بھی اکثر پست درجے کی ہو جاتی ہے۔

■

Fazle Hasnain, A-7, Patrakar Colony,
Ashok Nagar, Allahabad-211001
Mob.: 07499178776

اکرم پرویز

عوض سعید

خاکے کے پیٹرن میں فکشن کی جمالیات

عوض سعید، حیدرآباد کے تخلیقی منظر نامے پر ظاہر ہونے والے چند اہم ناموں میں سے ایک ہے۔ عوض سعید نے نثر و نظم دونوں میں اپنی تخلیقی ہنرمندی کو روشن کیا ہے۔ نثر میں افسانے، خاکے اور ڈرامے شامل ہیں اور شاعری، نثری نظموں پر مشتمل ہے۔ ان کے ادبی کیریر کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ عوض سعید کے ابتدائی افسانوں کی قرأت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں کردار نگاری کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ 'سائے کے سفر' میں شامل تقریباً تمام افسانوں میں واقعہ کے بجائے کردار کو اولیت حاصل ہے۔ واقعہ کی تشکیل و تعمیر اور کہانی کے تدریج میں کردار بنیادی محرک ہے۔ 'سائے کے سفر' میں شامل تمام افسانے کرداری افسانے کہے جاسکتے ہیں۔ 'خون صد ہزار انجم' میں بھاری ہے، 'نانی اماں' میں نانی، 'کھلی کھڑکی' میں عبدالصمد، 'بے دل صاحب' میں بے دل صاحب، 'جنگل کا بھوت' کا حوالی، 'کونکر جل بجھی راکھ' میں وہ، 'ریت کے محل' میں کارٹونسٹ اور اس کی بیوی آشا، 'دوسری موت' میں جوزف اساسی کردار ہیں اور افسانہ انھی کرداروں کے اطراف قائم ہے۔ عوض سعید نے ان کرداروں کی داخلی اور خارجی شخصیت کو ابھارنے کے لیے مختلف واقعات و حادثات کا سہارا لیا ہے۔ کرداری افسانے، خاکے سے قریب ہوتے ہیں اور اس طرح کے افسانوں کی قرأت سے خاکے کا تاثر ابھرتا ہے۔ منٹو کا 'بابو گوپی ناتھ'، کرشن چندر کا 'کالو بھنگی'، اشفاق احمد کا 'گڈریا'، قدرت اللہ شہاب کا 'ماں جی'، بیدی کا 'لاجونتی' وغیرہ کرداری افسانے ہیں جہاں کردار ہی افسانے کی اصل ہیں اور افسانے کی واردات ان کے اطراف ہی قائم ہے۔ عوض سعید نے خاکے بھی لکھے ہیں۔ ان کے خاکوں کے اثرات افسانوں پر بھی ظاہر ہوتے ہیں:

میں نے آج تک وحید اختر کی زبان سے کسی شاعر یا ادیب کی تعریف نہیں سنی۔ ہاں مذمت ضرور سنی ہے۔ مذاق اڑاتے ہوئے ضرور دیکھا ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنے مضامین میں ان تمام ادیبوں، شاعروں کا ضرور احاطہ کرتے تھے جن کا وہ نجی محفلوں میں بارہا مذاق اڑاتا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی [کے] تنقیدی ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہوں۔[1]

یہ اقتباس عوض سعید کے خاکے 'وحید اختر' سے ماخوذ ہے۔ یہاں راوی عوض سعید ہے۔ اس پر کسی کو کسی طرح کا شاید اعتراض نہ ہو۔ ہاں ان کے بیانات پر تعریض کے پہلو نکل سکتے ہیں لیکن راوی اور مصنف دونوں ایک ہی ہیں کہ خاکہ کی شعریات میں راوی ہی مصنف ہوتا ہے لیکن افسانے کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ یہ اقتباس اس لیے نقل کیا گیا ہے تاکہ 'بے دل صاحب' سے اس کی مماثلت و مشابہت کو واضح کیا جاسکے۔ اگر اس اقتباس سے وحید اختر کا نام نکال کر بے دل صاحب کردیا جائے تو جملہ یوں ہوگا:

میں نے آج تک بے دل صاحب کی زبان سے کسی شاعر یا ادیب کی تعریف نہیں سنی ہاں مذمت ضرور سنی ہے۔ مذاق اڑاتے ہوئے ضرور دیکھا ہے۔

یوں قرأت کی ترجیحات میں تبدیلی خاکے کو افسانہ اور افسانے کو خاکہ کے طور پر قائم کرسکتی ہے۔ عوض سعید کے افسانوں کی پرچھائیں ہو یا خوشی، اس سے کوئی سروکار نہیں، ہاں البتہ یہ بات ان کے تعلق سے بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کے کرداری افسانے خاکوں سا مزہ دیتے ہیں۔ ان کی تخلیقی ہنرمندی، راوی کردار کا افسانوں کی رو سے مناسب استعمال، زبان میں طنزیہ اور مزاحیہ عناصر کا فن کارانہ امتزاج ان کے افسانوں کو خاکوں سے کافی قریب کردیتا ہے۔ شاید وہ کردار جو ان کے افسانوں میں جا بجا نظر آتے ہیں وہ اس معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں عوض سعید نے اپنی زندگی کو جیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے کہ:

عوض سعید ایک ایسا افسانہ نگار ہے جس کی کہانیاں پڑھنے والوں کو اسے ڈھونڈنے پر اکساتی ہیں اور جب ملنے پر بھی اس سے ملاقات نامکمل رہ جاتی ہے تو پھر اس کی تحریروں میں اسے دوبارہ تلاش کرنے کو جی چاہتا ہے۔[2]

اصل میں ان کے افسانوں میں ان کے فن کی عظمت اسی لیے قائم ہوتی ہے کہ وہ کردار کے خارجی کوائف و معمولات سے سروکار رکھتے ہیں۔ کردار کے ساتھ ساتھ راوی خواہ وہ واحد متکلم ہو یا واحد غائب اپنی حاضری درج کراتا ہے۔ یہ راوی عوض سعید ہے کہ جس پر قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا مگر راوی کردار میں عوض سعید کے نقوش ضرور تلاش کیے جاسکتے ہیں:

نانی اماں کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ وہ بچپن میں کافی حسین تھیں، ان کی جوانی اور حسن کے دور دور تک چرچے تھے۔ انھوں نے ایک کابلی پٹھان سے محبت کی تھی جو پہلی بڑی جنگ میں مارا گیا تھا۔ تب سے انھوں نے اپنی زندگی کی گاڑی کو دکھوں کی راہوں پر چھوڑ دیا تھا، وہ کئی دنوں تک اپنے محبوب کی یاد میں آنسو بہاتی رہیں۔[3]

مجھے بے دل صاحب کی ذات سے بڑی عقیدت تھی، گو کہ میری ان سے راہ و رسم کوئی زیادہ پرانی نہ تھی لیکن ان کے اخلاق و خلوص نے مجھے ان کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان کی باتوں میں شگفتگی جھلکنے کی ساری خوبیاں تھیں لیکن بدمزگی پیدا کرنے والا کوئی عنصر نہ تھا۔ ہاں "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کبھی کبھار میرے گلے میں جنگل کے کانٹے

کی طرح چپکتا لگتا۔"

ان دونوں اقتباس کا اساسی تفاوت ان کے راوی کردار سے قائم ہوتا ہے۔ 'نانی اماں' جہاں واحد غائب کے ذریعے بیان ہوتا ہے وہیں 'بہول صاحب' میں واحد متکلم کا استعمال ہوا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ دونوں افسانوں میں راوی مختلف ہیں بلکہ یہ عوض سعید کے فن کا خاصہ ہے۔ دونوں اقتباس سے راوی کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے یعنی اگر واحد متکلم بہول صاحب کے متعلق کوئی بھی بات کہتا تو اس کی بات اعتماد کا درجہ نہیں رکھتی بلکہ وہ راوی کردار کے تعصبات و ترجیحات سے علاقہ رکھتی ہے۔ دونوں اقتباس میں کردار کے تعلق سے چند مفروضات قائم کیے گئے ہیں۔ نانی اماں کی خوش سلیقگی اور ان کی محبت کے تعلق سے راوی کے چند بیانات مذکور ہیں۔ اسی طرح بہول صاحب کی ذات کے تعلق سے واحد متکلم گومگو کی کیفیت میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اصل میں افسانے کی شعریات میں Protagonist کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ عوض سعید کے افسانوں سے بیانیہ کی شعریات کے تفاعل کی شرح میں مدد ملتی ہے۔

'سمانے کا سفر' میں شامل افسانے جہاں کرداری ہیں اور خاکوں سے قریب تر ہیں، وہیں ان کے اختتامیہ میں ایک چونکانے والا رویہ مضمر ہے۔ منٹو کے تعلق سے یہ عام رائے ہے کہ وہ اپنے افسانوں کا خاتمہ اس طرح سے کرتا ہے۔ اس حوالے سے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ عوض سعید نے یہ فن منٹو سے سیکھا ہے کہ موپاساں (ممتاز شیریں نے منٹو کے فن پر موپاساں کے فن کے اثرات کی نشان دہی سب سے پہلے کی تھی) سے مگر یہ بات کہ ان کے ابتدائی افسانے قاری کو چونکاتے ہیں، درست ہے۔ بقول مجتبیٰ حسین:

اپنے ابتدائی افسانوں میں اس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ قاری کو چونکایا جائے۔"

دراصل عوض سعید کے ابتدائی افسانے کسی ایک خاص کردار کے اردگرد قائم ہوتے ہیں۔ ان کے بیانیہ میں کہیں مرکزی کردار کی شخصی کمزوریوں کو تو کہیں اس کی انسانی خوبیوں کو ابھارا گیا ہے۔ اختتام سے قبل قاری ان سے کسی طرح کی ہمدردی محسوس نہیں کرتا۔ لیکن جیسے ہی عوض سعید اپنے بیانیہ کا آخری جملہ لکھتے ہیں، قاری کو ان کے کرداروں سے لگاؤ ہو جاتا ہے اور یہ لگاؤ وقتی ہوتا ہے۔ کردار کو ابھارنے کے لیے واقعات کی ترتیب افسانے کی داخلی ساخت سے منسلک نہیں ہیں۔ اسے عوض سعید کے فن کی کمزوری بھی قرار دیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کرداروں کے انفرادی تشخص کو قائم کرنے کے لیے بیا واقعات کا سہارا لیا ہے۔ یہ راوی / مصنف کے اس موقف کا اظہار ہے کہ ہر انسان اپنے داخل کے اعتبار سے نیک ہے۔ اس کے اندر جو حقیقی اصل میں سماجی نظام کی تشکیل کردہ اخلاقیات سے بدی میں منقلب ہو جاتی ہے۔ اخلاقی طور پر عوض سعید کے اس موقف کا دل سے احترام کیا جا سکتا ہے لیکن افسانے میں مصنف کا دخول اسے فنی طور پر کمزور کرتا ہے اور یہ کمزوری عوض سعید کے ابتدائی افسانوں میں موجود ہے۔

عوض سعید کے بعد کے افسانوں میں ان کے ابتدائی افسانوں کے مقابلے بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ایک تو انھوں نے بعد کے افسانوں میں کرداروں کی تشکیل و تعمیر میں واقعات کو اہمیت دینی شروع کی۔ اس

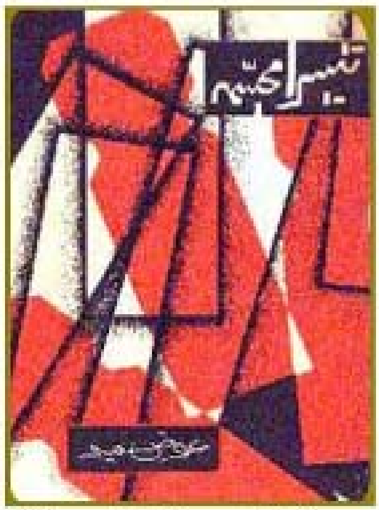

سے ان کے افسانوں سے خاکوں کا اثر بہت حد تک کم ہو گیا۔ دوسری یہ کہ راوی کو جس کردار سے دلچسپی ہوتی تھی اسی اعتبار سے واقعات کی ترتیب کے بجائے بیانیہ کی فطری ساخت کی طرف ان کی توجہ مبذول ہوئی جس سے کسی حد تک چونکانے والا عنصر بھی کم ہوا۔ عوض سعید کے افسانوں کی اس تبدیلی کا تعلق فن کے تئیں ان کی سنجیدگی سے ہے۔ انھوں نے اس کے لیے سخت ریاضت کی اور ان کی یہ ریاضت ان کے بعد کے افسانوں کی علامات و تجریات کو ابھارنے میں واقع ہوتی ہے۔ 'رات کا پنچھی'، 'وہ لڑکی'، 'تیسرا مجسمہ'، 'ایک زہریلی کہانی'، 'سمانے کا سفر'، 'جنازہ'، 'شال'، 'تعاقب'، 'گیہوں کے پھول'، 'قاتل'، 'بھیجر بھیجر آگ'، 'آدمی زمین و آسمان'، 'اس نسل کا آخری آدمی'، 'تیرگی'، 'مختلفہ'، 'بجھاوے'، 'دو گز زمین'، 'کنواں'، 'آدمی اور سمندر' وغیرہ ان کی خوبصورت کہانیوں میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ 'شال'، 'بھیجر بھیجر آگ' اور 'گیہوں کے پھول' کو تو ان کی شاہکار کہانیوں میں شامل کیا جانا چاہیے۔ یہ کہانیاں عوض سعید کے فن کی معراج ہیں۔ 'بھیجر بھیجر آگ' عوض سعید کی سب سے طویل کہانی ہے۔ اس کے بیانیہ کی تشکیل اسد، ماجرہ، ملتانی اور فرزانہ کے داخلی انتشار اور خارجی معمولات کے توسط سے ہوئی۔ یوں تو افسانہ راست بیانیہ سے سروکار رکھتا ہے تاہم اس کی داخلی ساخت کو ابھارنے کے لیے افسانہ نگار نے علامتوں اور استعاروں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ افسانے میں چار کردار ہیں۔ اگر ہم ان میں سے کسی بھی کردار کو بنیاد بنا کر اس افسانے کی تعبیر کریں تو افسانہ کے مختلف مفاہیم برآمد ہوں گے۔ مثلاً اس افسانے کی تعبیر کے لیے اسد کے کردار کو کلید بنایا جائے تو افسانہ ایک ایسے فرد کی روداد ہوگا جس میں تمام انسانی کمزوریاں ہیں۔ اسد ایک متوسط طبقے کا فرد ہے۔ اس کی شخصیت کی تشکیل میں سماج کے دوہرے معیار کا اہم رول ہے۔ اس کی ذات انسانی کمزوریوں سے مبرا نہیں ہے۔ مگر وہ کسی سے نفرت کرتا ہے تو اس کے اندر اسے معاف کرنے کا حوصلہ بھی ہے۔ اس کردار کو افسانے کے واقعات کی رو سے دیکھا جائے تو اس کی بیٹی Abortion کرا چکی ہے اور وہ اس کی شادی کے لیے فکر مند ہے اور اس کی زندگی، خاندان اور سماج میں مطابقت بٹھانے میں ہی صرف ہے۔ یعنی اسد متوسط طبقے کے فرد کا استعارہ ہے۔ اس کی بیوی اسے ایک ناکارہ مرد تصور کرتی ہے اور اس کے بارے میں اس طرح کی رائے رکھتی ہے:

شوہر [اسد] ایک مریل بیمار سا بد شکل آدمی جو چوری چھپے بھجن کی گولیاں کھاتا ہے۔ جو نشہ اس کے قریب نہیں آتا اور قریب آتا ہے تو یوں اترتا ہے جیسے وہ اسے ڈسنے لگی... اس نے برسوں پہلے اس زندگی سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ وہ کسی وقت بھی چیخ پکار کر کہہ سکتی تھی کہ اسے اسد سے محبت نہیں ہے... لیکن کبھی اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔"

ماجرہ نے کیوں زبان نہیں کھولی تھی اس کی وجہ در اصل سماج کی Patriarchy ہے جس کی رو سے عورت مرد کے زیر سایہ ہی پھل پھول سکتی ہے۔ خواہ وہ مرد شوہر ہو یا باپ یا کوئی دوسرا سرپرست۔ Patriarchy کے وجود کو تسلیم کر لینے کے باوجود کائنات کی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عورت، مرد کے وجود کے بنا ادھوری ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ مرد، عورت کے وجود کے بنا نامکمل ہے۔ ماجرہ نے کبھی نہیں اسد کو

چھوڑ دیا اور اپنی زندگی کا ایک نیا آغاز کیا؟ اصل میں یہ سب اس کے بس میں اتفاق نہیں وہ عمر کے جس دور میں ہے وہاں اس کے لیے سمجھوتہ کرنا ضروری تھا۔ غیر پر تو ہاجرہ کے تعلق سے کچھ باتیں ہوگئیں جو اس کے خارجی وجود کو سماں پر منکشف کرتی ہیں۔

متن کی تعبیر واقعات و کردار کے تفاعل کو کھولتی ہے اور اسے مختلف مفاہیم سے منور کرتی ہے۔ اسد ایک ناکارہ مرد ہے اور یہ اس کی بیوی کی اس کے تئیں رائے ہے۔ اسد کو اس کی بیوی کے خیالات کا علم نہیں یا شاید اسے اس کا علم ہو تبھی اس کی چڑچڑی طبیعت سے افسانہ نگار نے اجاگر کیا ہے۔ ہاجرہ مقبائی کی طرف ملتفت ہے اور اسد بھی مقبائی سے متاثر ہونے کے باوجود اسے کسی حد تک قبول کر چکا ہے۔ دونوں میاں بیوی اس بات سے قطعی طور پر باعلم ہیں کہ فرزانہ کی زندگی کو اطہر نے نہیں مقبائی نے خراب کیا تھا۔ انھیں تو مقبائی سے بس اتنی کدورت تھی کہ اطہر بطور بہنوئی ان کے گھر میں مقبائی کے توسط سے آیا تھا۔ اطہر بے چارہ تو ناحق بدنام ہو گیا سارا کھیل تو مقبائی کا کھیلا ہوا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہاجرہ بھی اس کی طرف ملتفت تھی۔ اسے ہاجرہ کے کردار کی کمزوری نہیں بلکہ اس کی جبلی خواہشات کی ناآسودگی کا احساس قرار دیا جانا چاہیے شاید اسی لیے وہ اسد صاحب کی غیر موجودگی میں فرصت سے اپنا سر دھلاتی تھی۔ اسد ان تمام کرداروں کے درمیان اپنے بوڑھے وجود کے ساتھ موجود ہے جس پر اپنے آپ کو ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں بھی Exist کرنے کا جبر ہے۔ نیز وہ خاندان کی کفالت کا واحد ذریعہ بھی ہے۔ اس افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ افسانہ کسی خاص موضوع یا فکر کو سامنے نہیں لاتا بلکہ کرداروں کے باہمی تعامل اور ان کی داخلی کیفیات ہر وقت جاذبیت کو ایک نئی شکل اور نیا روپ عطا کرتی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے افسانے کی قطعی اور حتمی تعبیر ممکن ہی نہیں نیز اس افسانے کے چاروں کردار چار مختلف ذہنی رویے کے غماز ہیں۔ عوض سعید نے اپنے ابتدائی افسانوں میں کردار نگاری کا جو مرقع پیش کیا یہ افسانہ اس کی نفی کرتا ہے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے واقعات کرداروں کی داخلیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ یہ افسانہ طویل ہوتے ہوئے بھی کہیں ذہن پر بار نہیں گزرتا اور قاری مکمل طور پر افسانے سے منسلک رہتا ہے۔

عوض سعید نے جدیدیت کے زیر اثر کہانیاں لکھی ہیں کہ نہیں اس پر قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ہاں البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کے چند افسانے اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک خاص علامتی اور تمثیلی انداز رکھتے ہیں۔ "وہ لڑکی"، "تیسرا بھنور"، "شال"، "لفظوں کی صلیب"، "حیثیت" اور "تجمد" وغیرہ اسی طرح کے افسانے ہیں۔ ان کہانیوں کا علامتی تفاعل اس وقت کے حاوی رجحان یعنی جدیدیت کے اثرات کی واضح نشاندہی کرتا ہے۔ عوض سعید کے فن کی تشریحات اور جدیدیت کے تعلق کے حوالے سے ایک بات قابل ذکر ہے کہ ان کے افسانے اس حد تک مبہم نہیں ہوتے کہ ان کی ترسیل ممکن ہی نہ ہو۔ یہ تو ان کے فن کا کمال ہے کہ ابہام نے ان کے افسانوں کو معنوی تہ داری عطا کی۔ ان کے یہاں شخصی علائم اور تمثیل کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔ ان کی یہ کوشش بھی نہیں رہی کہ افسانوں کو چیستاں بنا کر پیش کیا جائے۔ انھیں زبان پر گرفت بھی تھی لہذا اختلاط کا اسرار، رمز اور تجسس پیدا کرنے کے لیے وہ لفظی بازی گری کا سہارا نہیں

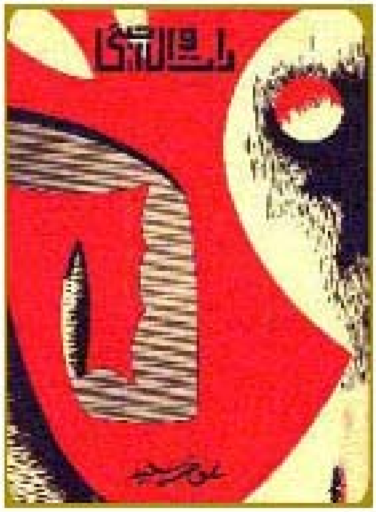

لیتے۔ آپ ان کے تمام افسانے پڑھ جایئے، شاید ہی کہیں انھوں نے اپنے افسانوں کا آغاز اور "جب" یا "اور جب" جیسے لفظوں سے کیا ہو۔ ان کا اسلوب متانت، سنجیدگی اور Commitment کا اشاریہ ہے۔ ان کے افسانوں میں زبان کی برجستگی اور روزمرہ کا ایک خاص طرح کی فضا خلق کرتے ہیں جو کردار اور واقعے کی مناسبت سے روشن ہوتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں آہنگی اور مزاح کا حسین امتزاج بھی نظر آتا ہے۔ ان کی نثر کا تخلیقی کردار جمالیاتی جمالیات کو روشن کرتا ہے:

کسی وقت وہ ایک مقامی اسکول میں پارٹ ٹائم ٹیچر تھا۔ لڑکوں کو اس نے جو بنیادی سبق پڑھایا تھا وہ یہ تھا کہ آدمی بنیادی طور پر جانور ہے۔ کبھی ایک آدمی دوسرے آدمی سے مل کر خوش نہیں ہوتا۔ نتیجتاً ہیڈ ماسٹر نے اسے یہ کہتے ہوئے اسکول سے ہمیشہ کے لیے چھٹی دے دی تھی کہ "ایک جانور دوسرے جانور کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔"[3]

وہ دور سے قرمزی کی ردائی کی طرح خوبصورت لگ رہی تھی۔[4]

جب سرد ہوا کی بے لگام لہر دور سے سیٹی بجاتی ہوئی اس کے جسم میں سرسراہٹ پیدا کرتی تو وہ مجبوراً اپنے کمرے میں چلی جاتی۔[5]

ابھی وہ دھوپ میں نہا بھی نہ پایا تھا کہ اس کے کانوں نے ایک زوردار طمانچے کی آواز سنی اور پھر کا ایک موٹی گالیوں کے ساتھ ایک شور بلند ہوا۔[10]

عشق کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ عشق بے نام ہوتی ہے۔ نام زندگی تک ہی رہتا ہے۔ جب سانس اکھڑ جاتی ہے تو سانس کے ساتھ نام بھی دفن ہو جاتا ہے اور عشق لاوارث ہو جاتی ہے۔[11]

عوض سعید ایک Committed فن کار ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسانی زندگی اور کائنات کے تفاعل کو نہایت فن کاری کے ساتھ منکشف کیا گیا ہے۔ عوض سعید نے اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنی سانچے میں خوبصورتی سے منتقل کیا ہے۔ فن ان کے نزدیک فکر سے زیادہ اہم ہے کہ متن محض فکری ترسیل سے سروکار نہیں رکھتا بلکہ اس کا معاملہ جمالیات سے بھی ہوتا ہے۔ شاید منٹو نے اسی لیے کہا تھا کہ "ادب ادب ہے یا سراسر بے ادبی"۔ اس میں کسی طرح کا مبالغہ نہیں کہ عوض سعید کے افسانے فن و فکر کے امتزاج سے روشن ہیں اور قاری کو جمالیاتی طور پر بھی محظوظ کرتے ہیں۔ تاہم ان کے فنی اور فکری معاملات کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے۔

حواشی:

1. مصحف سعید (مرتب)، کلیات عوض سعید (منتخب خاکے، تقسیم، مطبوعہ عوض سعید، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2009، ص:120
2. ایضاً، ص:11
3. عوض سعید، کلیات عوض سعید (افسانے، ناولٹ) مرتب مصحف سعید، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2009، ص:63
4. ایضاً، ص:86
5. اصحاف سعید (مرتب)، کلیات عوض سعید (منتخب خاکے، تقسیم، مطبوعہ عوض سعید، ص:23
6. عوض سعید، کلیات عوض سعید (افسانے، ناولٹ)، ص:246
7. ایضاً، ص:271
8. ایضاً، ص:193
9. ایضاً، ص:307
10. ایضاً، ص:307
11. ایضاً، ص:309

Akram Parvez 142, Satluj Hostel, JNU, New Delhi - 110067

محمد طلحہ ندوی

وہاب دانش کی غزلوں میں

'لب' کے استعاراتی پہلو

ایک بات آگے بڑھنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ مجاز جو کہ فن بلاغت کا اہم جزو ہے اس کا مختصر جائزہ لوں تا کہ استعاراتی علامت اور اسلوب سمجھنے میں ہمیں سہولت ہو سکے۔ مجاز سے مراد ہے وہ کلمہ جو اصل معنی یعنی موضوع لہ میں استعمال نہ کیا گیا ہو اور کوئی ایسا قرینہ بھی ہو جو پہلے یعنی اصل معنی مراد لینے سے روکتا ہو جیسے لفظ موتی کو لے کر جملہ وضع کریں کہ ان کے منہ سے موتی جھڑ رہے ہیں۔ اس جملے سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ موتی اپنے اصل معنی یعنی موضوع لہ کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے۔ بلکہ کلمات فصیحہ عمدہ و دلچسپ باتوں اور شیریں گفتاریوں کے معنی میں مستعمل ہوا ہے جو کہ اس کا غیر اصل معنی ہے اور اس کا قرینہ ہے کہ منہ سے موتیاں نہیں جھڑتیں بلکہ الفاظ نکلتے ہیں۔ لہٰذا مجاز کے لیے ضروری ہے کہ معنی موضوع لہ یعنی اصلی اور حقیقی معنی میں اور غیر موضوع لہ یعنی مجازی معنی کے درمیان کوئی علاقہ یا سبب موجود ہو۔ مجاز کی قسموں میں ایک استعارہ ہے۔ استعارہ میں لفظ اپنے لغوی معنی ترک کر کے لسانی معنی سیاق و سباق کے اعتبار سے مجازی معنی یعنی نئے معنی اختیار کرتا ہے۔

شاعری صرف جذبات و خیالات اور مشاہدات و تجربات کی ذاتی یا غرض ترجمانی نہیں بلکہ ایک فن ہے اور صناعی بھی۔ شاعر الفاظ کی مدد سے اپنے احساسات و تخیلات، اپنے تجربات و مشاہدات زندگی اور جذبات و امنگ کو خوبصورت زبان میں پیش کرتا ہے۔ زبان میں حسن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس میں تناسب، موزونیت کے ساتھ کچھ موسیقیت اور توازن کا بھی خیال رکھا گیا ہو۔ معنوی قوت بخشنے کے لیے استعارہ و پیکر کے ساتھ ان کے تلازمات اور علامتی استعارہ یا علامت کو ایسا برتا گیا ہو کہ موضوع اور ترسیل و ابلاغ ایک دوسرے میں ضم ہو کر کلام شاعری کی انتہائی بلندی پر فائز ہو کر فرحت و انبساط کے ساتھ ساتھ دعوت غور و فکر کا بھی سامان ہو اور ساتھ ہی قاری کو آسانی سے سمجھ پانے کی صلاحیت بھی ہو۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب شاعر الفاظ اور طرز ادا کے واسطے سے اپنے جذباتی اور تخیلی تجربے کو پیش کرنے میں انتہائی سچائی اور مہارت رکھتا ہو۔ کیونکہ شعر سے جو فرحت و انبساط حاصل ہوتا ہے وہ زیادہ تر جذباتی ہوتا ہے اور ایک حد تک ذہنی۔ ذہنی فرحت کا تعلق طرز بیان اور اسلوب سے ہے اور جذبات کا تعلق مضمون شعر سے۔ ان دونوں میں جذباتی فرحت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ ذاتی اہمیت مضمون شعر یعنی زندگی کے بنیادی اور حقیقی تجربات کو حاصل ہے۔ تشبیہات و استعارات اور طرز بیان ذریعۂ اظہار ہیں۔ اس تناظر میں وہاب دانش کی شاعری میں تشبیہاتی، استعاراتی اور اسلوبیاتی کلام کا جائزہ لیا جائے تو ان کے کلام کے محاسن و معائب کو دیکھنے اور ان کی شاعری کی قدر متعین کرنے میں مدد ملے گی۔ وہاب دانش نے اپنی نظموں اور غزلوں میں جو استعارے استعمال کیے ہیں ایسا لگتا ہے کہ انھیں فکر کی بھٹی میں تپا کر تخیل سے رنگین تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے جس کے ذروں کو دیکھنے اور ٹٹولنے کے لیے کافی سنجیدگی اور غور و خوض کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ ان کے استعارے معنویت سے بھرا ہیں۔ ان کی تخلیقات کے بطن کو پورے انہماک سے ٹٹولنے کے بعد کتنی معنوی تصویریں ابھر کر سامنے آتی ہیں جب قاری صوری اور معنوی تہہ داریوں سے اپنے کو ہم آہنگ پاتا ہے۔ ورنہ سرسری مطالعے سے کوئی بھی شخص ان کے کلام سے محظوظ نہیں ہو سکتا۔ وہاب دانش نے زندگی اور اس کے ارد گرد رونما ہونے والے حالات کے علاوہ زمانے کی نیرنگیوں کے ساتھ ساتھ مختلف انداز سے کائنات کے وسیع و عریض اور محدود گوشوں کا بہت گہرا مطالعہ بھی کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے مشاہدات و تجربات وسیع اور کشادہ ہونے کے ساتھ ساتھ شدید بھی ہو گئے ہیں۔ دانش اپنی فکر اور تخلیقاتی تجربوں کو منظر عام پر لانے کے لیے ایسی لفظیات کا استعمال کرتے ہیں کہ ان کی نظموں کا تجربہ عمومی نہ ہو کر انفرادی ہو جاتا ہے۔ لیکن اس انفرادیت کو گرفت میں لینے کی سعی کی جائے تو تجربہ عمومی احساس میں بدل جاتا ہے اور آفاقیت کی جہتیں وا ہو جاتی ہیں اور یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ہم پہلے سے متعین کی ہوئی قرأت کے بغیر فن پارے کو پڑھیں اور اس قرأت میں اپنے کل معانی دریافت کریں جو مخصوص قرأتوں کے ذریعے نکالے ہوئے معانی کے مطابق ٹھہریں۔ وہاب دانش کے کلام میں ادب کی تعمیر کی وہ آفاقی معنویت پنہاں ہے جسے مختلف قرأتوں کے ذریعے مطالعہ کی بدلتی ہوئی سطحوں اور متنوع پہلوؤں کی پرتوں کو جس زمانے میں کھولا جائے تو ان کے کلام اس وقت کے ہم آہنگ نظر آئیں گے۔ لہٰذا ان کے استعاراتی طرز ادا اور اسلوب کو دیکھنے کے لیے

دو اشعار پیش کر رہا ہوں:

ایک تلخی ہے جسے گھونٹا رہتا ہوں وہاب
یعنی ہر گز کسی کرب کا اظہار ہے اف
نشتر تو تحفۂ لب کے ہوا میں پگھل گئے
اک نوک ہے زباں سی جگر میں اتر گئی

پہلے شعر میں دانش نے اپنے ہر شعر کو قائم کر کہا ہے جو غم و تکلیف کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ تلخی سے مراد وہ افکار و حادثات زندگی ہیں جنھیں کھول کر بیان کرنے کے تجربات کو ”اف“ جیسے لفظ کے ذریعے سے اپنی ذاتی اور احساس کی پریشانی کو بیان کرنے کے لیے تلخی کا استعمال کیا ہے۔ لفظ ”اف“ میں طبیعت کے انقباض و اکتاہٹ کی کیفیت کو پیش کرنے میں دانش نے جو اسلوب تخلیق کیا ہے اسی کو اجتہادی اسلوب کہتے ہیں کیونکہ اس شعر میں دانش کی تخلیقی صلاحیت کا اشارہ ملتا ہے۔ شعر کو گرہ سے تعبیر کر کے اپنے کلام کے اندر کی تہہ داری کو بیان کرنا مقصود ہو سکتا ہے۔

دوسرے شعر میں لفظ ”لب“ کو استعمال کیا ہے۔ ان کے شعری کلام کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہاب دانش نے ”لب“ کو علامت یا استعاراتی علامت کے طور پر اپنے اشعار میں کافی استعمال کیا ہے۔ تحفۂ لب کے نشتر بھی کڑوی کسیلی باتیں ہی ہوا کرتی ہیں جو ظاہر یا تھیں تو ہوا اور فضا میں تحلیل ہو جاتی ہیں لیکن ان کے نشتر نہیں پگھلا کرتے۔ مستعار منہ کے بیان سے مستعار لہ کی صفت لاتا اور اس کے علاوہ کو برتنا ایک ایسا کہنہ مشق شاعر ہی کا عمل ہے جو فن شاعری کے پیچ و خم سے واقف ہونے کے ساتھ اپنی فنی اور ادبی تخلیق کو موثر انداز و اسلوب میں بیان کرنے کی مہارت و صلاحیت رکھتا ہو۔ باتوں کی کڑواہٹ اور نشتریت کبھی کبھی آدمی سہہ بھی لیتا ہے اور درگزر سے کام بھی لے لیتا ہے لیکن باتوں کے کچھ کانٹے دل و جگر میں ایسے لاشعوری طور پر سرایت کر جاتے ہیں کہ اس کی تلخی بھری چبھن ایک زمانے تک اس طرح تحت الشعور میں ٹیس مارتی رہتی ہے کہ بے زباں ہو کر بھی وہ کراہتی تلخی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ اسی طرح کے خیالوں کو حسین پیرائے میں دانش کے بیان کرنے کی ہنرمندی قابل داد ہے۔ وہاب دانش نے اپنے مجموعۂ کلام ”لب عماس“ کی نظموں اور اپنی غزلوں میں لب کا استعمال کثرت سے ہی نہیں بلکہ کئی جہتوں سے کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لب ان کی شاعرانہ ترسیل کا اشاریہ بھی ہے اور استعاراتی علامت بھی۔ اشاریہ اس لیے کہ کسی کیفیت یا احساس و جذبے کو رنگوں کی طرح پھیلنے اور فکر و خیال کو شاعرانہ پیکروں میں ڈھلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ علامت اس لیے کہ لفظ ”لب“ میں جتنے معنوی پہلو پنہاں ہیں وہ جزوی یا کلی طور پر بھی سرا لیے جا سکتے ہیں۔ اس مقالے میں ان کی غزلوں کے ان اشعار پر گفتگو کی گئی ہے جس میں لفظ ”لب“ استعمال ہوا ہے۔

شاعری اس خلاقانہ صلاحیت کا انداز ہو جاتا ہے جس سے لفظوں کے کثیر الجہتی تخلیقی استعمال سے جادو جگایا جا سکتا ہے۔ ”لب“ فارسی لفظ ہے اس کے معنی ہونٹ، کنارہ، طرف، جانب، ساحل، حاشیہ، منڈیر، نوک، لعاب دہن ہونٹوں کے اوپر کے بال، مونچھیں وغیرہ ہیں۔ یہ تو لغوی معانی ہوئے۔ اب یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ”لب“ ہماری شاعری میں کن کن معانی کی غمازی کرتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ لب کے متعلقات

باتوں کی کڑواہٹ اور نشتریت کبھی کبھی آدمی سہہ بھی لیتا ہے اور درگزر سے کام بھی لے لیتا ہے لیکن باتوں کے کچھ کانٹے دل و جگر میں ایسے لاشعوری طور پر سرایت کر جاتے ہیں کہ اس کی تلخی بھری چبھن ایک زمانے تک اس طرح تحت الشعور میں ٹیس مارتی رہتی ہے کہ بے زبان ہو کر بھی وہ کراہتی تلخی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ اسی طرح کے خیالوں کو حسین پیرائے میں دانش کے بیان کرنے کی ہنرمندی قابل داد ہے۔

ومتعلقات نیز اس کے صفات کیا ہیں۔ لب کے اہم علامات میں۔ بول، پیاس، مٹھاس، کڑواہٹ، نازکی، نرمی، تیکھا پن، طرز کلام، طرز گفتگو، طرز ادا، سانس، سرخی، سفیدی، سیاہی، کٹاس، خموشی، تری، تراوٹ، خشکی، زندگی، موت، لذت، دعا، بددعا، التجا، استدعا، بوسہ، تعریف، چوٹ، زبانی حملہ آوری، تبسم، تعجب، حیرت، حسرت، افسوس، خطاب، درد و الم، تقریر، غم، خوشی، ہنسی، مسکراہٹ، آہ و زاری، ترنم، تکلم، طنز، اشارہ، محبت، نفرت، نشتر، برہمی، مرہم، اہمیت، مس، چھونا، سناٹا، آرائش و زیبائش، آب و تاب، گلاب، پھول اور اظہار بیان وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں پر میں نے علامات ومتعلقات اور صفات کو صرف الفاظ کی شکل میں لکھا ہے۔ تفصیلی اور وضاحتی تحریریں اور مضمون کو تقسیم۔

وہاب دانش کے مجموعۂ کلام ”لب عماس“ کی نظموں اور دیگر شائع شدہ نظموں کو چھوڑ کر صرف غزل کے ان شعروں کو مختصراً پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جن میں ”لب یا ہونٹ“ کو بطور استعارہ و علامت پیش کرنے کی بلیغ اور شاعرانہ کوشش کی گئی ہے:

ہر روشنی کی بوند پہ لب رکھ چکی ہے رات
چڑھتے گئے زمیں کی طرف تیرگی کے ہاتھ
اٹھا اپنی سر آپ میرے لب پہ بس
ہونٹ پہ ہونٹ دھرے پیاس بجھا سب ہے بس
تھی آس اپنی شعلے دے پانی آئین
سوکھے ہونٹ ہتھیلی نم ہو آسانی آئین
نشتر تو تحفۂ لب کے ہوا میں پگھل گئے
اک نوک ہے زباں سی جگر میں اتر گئی
گرد خواہی کی دعا کس نے سجائی لب پہ
کھل اٹھا اک لمحہ میں دھول سے سرشار ہے الف
ستر ہونٹوں کی دعا ریت اترتی سر پہ
آسماں گیرو زمیں تاب، خدا شرمندہ
حادثے روز دعا کربلا خوانی تیام
لب انیسوں کی دعا لہو اداشرمندہ
گھر شب میں ترے لب تھے عمر بھر لب کے اسیر
دل مرے گرد چپ تیرے لمس سے باہر گزرے
تشنہ ویران زمینوں کے لبوں کی مٹی
نرم پانی کو ترستی ہی رہی کون سنے
اشک ٹپکائے تو ڈھل جائے لہو کا شوشہ
اس نے ہونٹوں سے تری آنکھ پہ خط کھینچا دیا

پہلے شعر میں تیرگی اور رات بھی جدید شاعری کا مستعمل استعارہ ہے جس کا استعمال شاعری میں تنہائی اور خوف کے لیے بھی کیا جاتا ہے لیکن رات اور رات کی تاریکی ظلم واستبداد کی علامت بھی بن جاتی ہے۔ وہاب دانش نے اپنے اندرونی کرب کو بیان کرنے کے لیے داخلی خارجی حسی کیفیات کی پیکر تراشی بہت ہی شاعرانہ انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ روشنی کی بوند نہیں ہوتی بلکہ کرن ہوتی ہے دانش محاورہ اور زبان کے موجودہ اور مستعمل اصناف میں رد و بدل کر کے اپنا تخلیقی اور اجتہادی رویہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ عمل کہیں رواں نظر آتا ہے تو کہیں ناروائی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ چونکہ شعر میں لب ہے اس لیے کرن کا استعمال بالکل صحیح نہیں ہوگا تو اسے

بوند میں بدل کر لب کے مناسب بنا دیا ہے۔ روشنی کی بوند کو رات کا لب جب تھوڑا تھوڑا کر کے چوسنے لگے تو اس کا وجود تاریکی میں مبدل ہو جائے گا یعنی اچھائیوں پر برائیوں اور مروت و محبت پر ظلم کا قبضہ ہو جائے گا تو ہر طرف ظلم کی تاریکی سماج کو اپنے شکنجوں میں کس کر انسان اور سماج کی اچھائیوں کو ختم کر دے گی۔

دوسرے شعر میں پانی کی موجودگی ہے۔ مانگنے کی

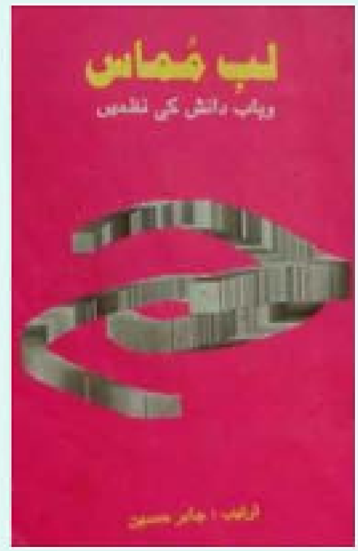

خواہش بھی مگر گزارش کے لیے لب کھولنے کی ہمت نہیں۔ ایک طرف عزت نفس کو بیان کرتا ہے تو دوسری طرف اس سے بڑھ کر اس خوف کو ظاہر کرتا ہے جو مانگنے سے پہلے نہ ملنے کا ہے۔ ضرورت مندی کو پیاس سے تعبیر کرتا اور پھر پیاس سے لب چپکے رہے ہوں ایسی ہیبت ناک بے بسی ہے جو اپنی ذات میں گھٹ کر اپنا گلا گھونٹ رہی ہے۔ حد درجہ پیاس کے عالم میں لب کا نہ کھلنا خودداری یا ہمت کے فقدان کی علامت بن جاتا ہے۔

تیسرے شعر میں نیلی آس، اللہ سے امید کا استعارہ ہے کیونکہ آسمان نیلا ہوتا ہے اور آسمان سے کنایتاً مراد اللہ تعالیٰ بھی ہوا کرتا ہے۔ انائی شعلے، خودداری یا انانیت کی آگ بھی مراد ہو سکتی ہے پانی آگین کہہ کر انسانوں کی بے بسی اور مجبوری کو اللہ کی مطلق حاکمیت کو ظاہر کرنے کا انداز نرالا ہے۔ سوکھے ہونٹ، انتہائی ضرورت مندی کا استعارہ ہے جھلی فہم سے استعارہ ضرورت کا پورا ہونا۔ جھلی کی نمی سے مبہم خیال تھوڑا کچھ بھی حصول پر خوشی کا اظہار کرنے کے طور پر ہے۔ ہوا سانی آگین۔ حادثات و مشکلات سے گھرے ہوئے انسان کے حسی اور بصری پیکر کو اس خوبصورتی سے پرونے کا فن دانش ہی کا حصہ ہے۔

چوتھے شعر میں لب پہ دعا کا سجانا دھول سے رنج والم اور بد دعوت کا استعارہ لانا اور اسکا بہ نواع بیان کے ساتھ ساتھ دھول سے زمین کا سرشار ہونا ایسا حسی اور بصری پیکر ہے جو قاری کے حس و شعور کو بیدار کر کے جھنجھوڑتا ہے۔ سبز ہونٹ، ریت کا اترنا، آسمان گیر، زمین جنب، کربلا خوانی اور لب انجمن، عجیب و غریب اور بالکل نامانوس ایسی ترکیبیں ہیں جو جدیدیت سے کافی متاثر نظر آتی ہیں اور معنوی تعقید اور گنجلک اور ابہام سی ہیں تاہم ذہنی ورزش کے بعد کچھ معنی کھلتے ہیں۔

آٹھواں شعر روایتی انداز کا ہے لیکن شاعر کا تخلیقی رویہ قابل تحسین ہے گنبد شب سے کر کے یا اندھیرے کا استعارہ اور اندھیرے میں تقابل نمس یعنی لب غماس Lip look کو لفظ اسیر سے بیان کرنا کیا کمال ہے کا نکیلی اسلوب نہیں کہا جا سکتا؟ دن میں متحمل حیات کی وجہ سے ہجر و فراق سے دوچار ہونا حقیقت زندگی کی عکاسی ہے۔ نویں شعر میں تخت ویران ہجر زمین کی مٹی میں جو پیڑی پڑ جاتی ہے اس پیڑی کو لبوں کی مٹی سے تعبیر کرنا، بے بضاعتی اور بے سروسامانی کا استعارہ اور اس پر بالائے ستم یہ کہ بکھلا اور اہم کٹ کی انتہا کے باوجود صحراب صحرا ہونا ایک الم ناک حقیقت و کیفیت ہے جس سے موجودہ دور کا دبا کچلا طبقہ دوچار ہے اس طبقے کو کچھ بھی سامان راحت نہ ملنے کو ترنم پانی کو ترستی ہی رہی کون سے استعاراتی اسلوب و انداز میں ہنرمندی کے ساتھ بیان کرنے کو ہی اچھی شاعری کہتے ہیں۔

آخری شعر میں زہر اگلتے ہونٹوں کے ذریعے تلخیص گوئی دل خراش باتوں سے جو قلب شق ہو کر آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ اس کیفیت اور ابھرنے والے زخم جو آنکھوں اور چہروں پر عیاں ہوتے ہیں اس کی تصویر اکیلا کرنا فنی مہارت اور شاعری کی معراج ہے۔ شعر محسوس کرنے کی چیز ہے۔ تشریح کی نہیں۔ ہونٹوں سے آنکھ پہ خط کھینچنا اور اس کے نتیجے میں لہو کا ٹپکنا پھر تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے سے آنسوؤں کی بارش سے لہو کا دھلنا معنی آفرینی اور حسن بیان دونوں کمال کی چیز ہے اور ان خیالوں کے لیے مناسب اور متناسب لفظوں اور ترکیبوں کا استعمال کر کے انفرادیت کا ثبوت دینا شاعر کا کمال مانا جاتا ہے۔

مذکورہ اشعار کے ذریعے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لب کے ذریعے مختلف النوع کرب، پیاس، زہر پینا، گی، التجا، استمداد اور عہد حاضر کی بے بسی و نا آسودگی اور حرماں نصیبی کے احساس کو بیان کرنے کے لیے وہاب دانش نے جو استعاراتی اسلوب اور طرز نگارش کو اپنایا ہے وہ ان کی فنی کمالات سے مملو ہے۔ پانچویں شعر میں سوالیہ کیفیت کو ایسے طلاقتی انداز میں برتا گیا ہے کہ سوال کا براہ راست جواب خود سوال میں پنہاں نظر آتا ہے۔ گرد راہ کی دعا لب پر سجنا اور ہر لمحہ زمین کا دھول سے سرشار ہونا اور اس

ہونٹوں سے آنکھ پہ خط کھینچنا اور اس کے نتیجے میں لہو کا ٹپکنا پھر تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے سے آنسوؤں کی بارش سے لہو کا دھلنا معنی آفرینی اور حسن بیان دونوں کمال کی چیز ہے اور ان خیالوں کے لیے مناسب اور متناسب لفظوں اور ترکیبوں کا استعمال کر کے انفرادیت کا ثبوت دینا شاعر کا کمال مانا جاتا ہے۔

سے اکتاہٹ کی کیفیت کو الف کے پیکر میں روح فرسا حالات و سانحات کے ایک طلاقتی منظر نامے کی شکل میں ہے۔ ذیل کے شعر میں دانش کا تیور قابل دید ہے ملاحظہ کریں:

ہونٹوں سے اس کتاب کی تحریر بھی پڑھی
چکھا چٹا زبان سے لفظوں کا زہر بھی

ان اشعار کے علاوہ 'لب غماس' کی نظموں میں لب اور ہونٹ کو وہاب نے مختلف انداز سے کتنے معنوں میں استعمال کیا ہے اور استعارہ یا طلاقتی استعارے کے استعمال میں ایسی فنی مہارت برتی ہے کہ تمام معنوی جہتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں ان کو الگ سے پیش کروں گا۔ وہاب دانش (1930-2004) غیر منقسم بہار کے بڑے اور صاحب اسلوب شعرا میں شمار ہوتے تھے اور رانچی جھارکھنڈ کے تین بڑے نامور شعرا وہاب دانش، صدیق مجیبی اور پرکاش فکری میں ایک تھے۔ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ 'لب غماس' 1999 میں جابر حسین نے ترتیب دے کر شائع کیا تھا جو کافی مقبول ہوا اس کے فکر و فن پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

■

Md Talha Hadwi, Tayyeba Mazhar kohinoor
Chowk Nazara Nagar Hindpiri, Ranchi - 834001
(Jharkhand)

اردو قصائد پر فارسی قصائد کے اثرات

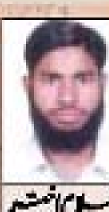

غلام اختر

قصیدے کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ بلکہ اس کی بابت اگر یہ کہا جائے تو بےجا نہ ہوگا کہ شاعری کی ابتدا ہی قصیدے سے ہوئی ہے۔ قصیدہ اس صنف کو کہتے ہیں جو کسی کی تعریف یا مذمت میں ہو لیکن عام طور پر جب مطلق قصیدہ کہا جاتا ہے تو اس سے مدحیہ قصیدہ مراد لیا جاتا ہے۔ قصیدے ہی کے ایک جز 'تشبیب' نے ترقی کر کے 'غزل' کی حیثیت سے ایک الگ مستقل صنف کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اصناف شاعری میں قصیدہ سب سے پرانی صنف ہے جس کی وجہ یہ رہی کہ شعرا شاعری کو بادشاہوں، امرا اور اہل ثروت سے حصول منفعت کے لیے ذریعے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ فکر ابتدا عربی شاعری میں تھی جو فارسی کے راستے اردو میں بھی آ گئی۔ چونکہ اردو کی پیدائش فارسی آب و ہوا میں ہوئی اس لیے غیر شعوری طور پر فارسی کی اول ترین صنف قصیدہ کے تمام تر متعلقات اردو قصائد کا حصہ بن گئے جو قصیدہ نگاری کے لیے لازم سمجھے جاتے ہیں۔ اردو شاعری کا فارسی سے متاثر ہونا اس لیے بھی قرین قیاس ہے کہ فارسی قدما متقدمین و متاخرین کی زبان تھی اور غالب کا اثر تو مقلدین و متاخرین پر ہوتا ہی ہے۔ اس لیے فارسی نے اردو کے علاوہ ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں پر بھی اثر ڈالا، لیکن ہمیں یہاں پر صرف اردو زبان پر بحث کرنا ہے۔ اب ہم ذیل میں اردو کے چند قصیدہ گو شعرا کے قصائد سے چند اشعار نقل کر کے فارسی قصائد سے اثر پذیری کی مختصر شرح پیش کرتے ہیں، ملاحظہ ہو!

قصیدہ گوئی میں مرزا محمد رفیع سودا (1706-07) کو امام تسلیم کر لیا گیا ہے اس لیے ہم سودا سے ہی شروع کرتے ہیں۔ سودا کے قصیدے کا یہ شعر بہت ہی مشہور ہے، اردو کے تقریباً سبھی طلبہ کی زبان پر رہتا ہے۔

سودا: اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل 1

اسی زمین میں انوری کا بھی ایک قصیدہ ہے:

انوری: جرم خورشید چو از حوت در آید بہ حمل
اشہب روز کند ادہم شب را ارجل 2

ترجمہ: سورج جب برج حوت سے برج حمل میں آتا ہے تو دن کے خاکستری رنگ کو اور رات کی تاریکی کو روشن کر دیتا ہے (اس سے موسم بہار مراد ہے)

عرفی کا بھی ایک قصیدہ اسی زمین میں ہے:

عرفی: چہرہ پرداز جہاں رشت کند چوں بہ عمل
شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل 3

ترجمہ: دنیا کا چہرہ آراستہ کرنے والا (محبوب) جب آرائش پر توجہ باندھ لیتا ہے (یعنی جدا ہو جاتا ہے) تو اس سے ماضی سیاہ اور مستقبل روشن ہو جاتا ہے۔

مطالعے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سودا، عرفی کی قصیدہ نگاری سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے عرفی کی مذکورہ زمین میں عرفی کا ایک مصرع بھی تضمین کیا ہے اور وہ یہ ہے:

سودا: تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی
اخگر از گلشن ہوا سبز شود در مشعل 4

ترجمہ: میں کہاں تک تشریح کروں، بقول عرفی "چنگاری ہوا کے فیض سے انگیٹھی میں سبز ہو جاتی ہے"

سودا کی قصیدہ نگاری میں خاقانی کی قصیدہ نگاری کی جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ خاقانی کے ایک قصیدے کا مطلع کچھ یوں ہے:

خاقانی: شارا شک من ہر شب شکر ریزی است پنہانی
کہ رحمت ساز شوقی ست از آن لو و پیشانی 5

ترجمہ: ہر شب میرے آنسوؤں کی قربانی پوشیدہ طور پر شکر ریزی ہے، کہ رحمت کو زلف و پیشانی سے ایک خاص رشتہ ہے۔

اسی زمین میں سودا نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک قصیدہ کہا ہے، اس کا مطلع یوں ہے:

سودا: ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی 6

خاقانی کی زمین میں سودا کی طرح مصحفی نے بھی قصیدہ کہا ہے۔ مثال میں قصیدے کے یہ اشعار دیکھیں!

مصحفی: عناصر کے سبب نت مدح کی ہے خانہ ویرانی
ہوئی ہے چار موجہ میں یہ کشتی آ کے طوفانی 7

اسی طرح خاقانی کی زمین میں سودا کے اور بھی قصائد ملتے ہیں، مثال میں ایک اور قصیدے کا تقابلی مختصر ملاحظہ کریں!

خاقانی: صبحا کہ جہاں علامت انصاف شد نہاں
ای دل کرانہ کن ز میان خانہ جہاں 8

ترجمہ: اے دل اس دنیا سے انصاف کی علامت پوشیدہ ہو گئی ہے (یعنی دنیا سے انصاف اٹھ گیا ہے) اس لیے اپنا خانہ جہاں لوگوں سے الگ کر لو۔

سودا: منکر خدا سے کیوں نہ تجھیں کی ہو زباں
جب شہر سے مرے ہو بلا اس قدر جہاں 9

سودا کے بعد قصیدہ نگاری میں سب سے بڑا نام مصحفی کا آتا ہے۔ ہم یہاں پر ان کے قصیدے سے بھی کچھ اشعار درج کرتے ہیں تاکہ ہمارا دعویٰ مدلل ہو سکے

جائے۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفی (پیدائش 1747 سے 1754 تک کے درمیان کسی سال) نے اپنی قصیدہ نگاری میں خاص طور سے عرفی، خاقانی اور ظہیری وغیرہ کی تقلید کی ہے۔ ان کی زمینوں میں قصائد کہے اور ان کے افکار کو اپنے قصائد میں ڈھالا ہے۔ مثال ملاحظہ فرمائیں!

عرفی کے نعتیہ قصیدے کا ایک شعر ہے:

عرفی: سپیدہ دم کہ زدم آتشیں بصبح شعور
شنیدم آیت لا تقنطوا ز عالم نور 10

ترجمہ: میں نے صبح کے وقت عقل کا چراغ بجھا دیا کہ میں نے عالم نور سے یہ آیت سنی ہے کہ "اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو"

اسی قصیدے کی متابعت میں مصحفی نے سلیمان شکوہ کی مدح میں دو قصیدے کہے جس کے مطلعے یہ ہیں۔

مصحفی: یہ عکس مہ سے ہے چھڑا زمیں پر نور
کہ فرش چادر ہے صحرا میں رشک ساعد حور 11
خطائی قلم نہیں کچھ یہ بخت کا ہے قصور
کہ مجھ سے طور تخلیق نہیں مزاج حضور 12

عرفی کی زمین میں مصحفی کے اور بھی قصیدے ہیں۔ اسی طرح مصحفی نے ظہیری کی تقلید میں بھی قصیدے کہے ہیں۔ مثال کے طور پر ظہیری کے قصیدے کا یہ مطلع دیکھیں!

ظہیری: ز سال و ماہ تو ام فرق نیست چو شد دل تنگ
کہ تنگ دست چہ نوروز و عید دارد چنگ 13

ترجمہ: میرا تنگ دل سال اور ماہ تو سے بہت پریشان ہوتا ہے کہ تنگ دست کے لیے کیا عید اور کیا نوروز۔

اور مصحفی کے دو قصیدوں کے یہ دو مطلعے:

مصحفی: نہیں اگرچہ یہ زمیں طبیعت کو وقت جنگ
ہوجاوے قلم پر بھی فصاحت کا عرصہ تنگ 14
(وقفہ بر ختم کے گھوڑے کا نام ہے)
ہے وہ چہرہ ترا نقش کہ تصویر فرنگ
دیکھ کر کیوں نہ تجھے عالم تصویر ہو دنگ 15

سودا و مصحفی کے علاوہ میر، انشا، ذوق، جرأت، غالب اور مومن کے یہاں بھی اس طرح کے نمونے ملتے ہیں۔ ہم اخیر میں صرف ایک اور قصیدہ گو شاعر شیخ ابراہیم ذوق (ب 1203ھ یا 1204ھ) کے قصیدے کا مطالعہ فارسی قصیدہ گو شعرا کی روشنی میں کرتے ہیں، ملاحظہ ہو!

ذوق نے اپنی قصیدہ نگاری میں فارسی قصیدہ گو شعرا میں خاص طور سے خاقانی اور انوری کی تقلید کی ہے۔ مثال کے طور پر قصیدے کا یہ شعر دیکھیں!

ذوق: نہ ہے تماشا اگر کچھ اسے قمری
عیاں ہو جائے سے قمری نکل جائے سری 16

انوری: برمن آمد خورشید نکیاں شکیر
بہ قد چو سرو بلند و بہ روئے چو بدر منیر 17

ترجمہ: رات کے پچھلے پہر میرے پہلو میں ایک شخص آیا جو حسن والوں میں سورج ہے، جو قد و قامت میں بلند سرو کی طرح ہے اور اس کا چہرہ بدر منیر (چودھویں رات کے روشن چاند) کی طرح ہے۔

اسی طرح ان کے قصیدے پر خاقانی کے اثرات ملاحظہ فرمائیں:

ذوق: واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم میں ہوا
مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا 18

خاقانی: از سر زلف تو بوئے سر بمہر آمد ہوا
جاناں بہ استقبال شکاگی عہد جاناں تا کجا 19

ترجمہ: تیری زلفوں کی خوشبو میرے پاس ماہ مہر میں آئی ہے جو اے جاناں کی آمد کا اعلان ساتے ہے کب تک تیرا ارادہ ہے۔ (مہر: ایران کے شمسی سال کا ساتواں مہینہ)

ذوق: ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی 20

خاقانی: چون صبح دم عید کند ناقہ کشائی
بکشای رگ خم کہ کند صبح نمائی 21

ترجمہ: جب عید کی صبح خوشبو بکھیرے تو جام کا منہ کھول دے کہ صبح نمائی ہو۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اردو قصائد پر فارسی قصائد کے گہرے اثرات پڑے ہیں، جن کو ہم نے صرف ایک ہی نقطہ نظر یعنی بحر اور شعری زمین کے حوالے سے دیکھا ہے۔ لیکن جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ، تراکیب، محاورے، ضرب الامثال، معانی و مفاہیم، صنعتیں، اصطلاحات، صنائع و بدائع لفظی و معنوی، افکار و نظریات، موضوعات اور طرز ادا وغیرہ ہر سطح پر اردو قصائد فارسی قصائد سے متاثر ہیں۔

حوالہ جات

1. صدیقی، عتیق احمد، قصائد سودا، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، 1976، ص 148
2. نفیسی، سعید (مرتب)، دیوان انوری، تہران: موسسہ انتشارات نگاہ، 1376 ش مطابق 1997 ص 253
3. وحیدی، جواہر (اہتمام دہنگی)، دیوان عرفی شیرازی، تہران: انتشارات کتابخانہ سنائی، 1369 ش، مطابق 1990 ص 82
4. صدیقی، عتیق احمد، قصائد سودا، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، 1976، ص 150
5. سجادی، ضیاء الدین، دیوان خاقانی شروانی، تہران: کتاب فروشی زوار، 1357 ش مطابق 1978 ص 410
6. صدیقی، عتیق احمد، قصائد سودا، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، 1976، ص 119
7. نقوی، نور الحسن (تصحیح)، کلیات مصحفی۔ جہم، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2013 ص 51
8. سجادی، ضیاء الدین، دیوان خاقانی شروانی، تہران: کتاب فروشی زوار، 1357 ش مطابق 1978 ص 312
9. صدیقی، عتیق احمد، قصائد سودا، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، 1976، ص 235
10. وحیدی، جواہر (اہتمام دہنگی)، دیوان عرفی شیرازی، تہران: انتشارات کتابخانہ سنائی، 1369 ش مطابق 1990 ص 47
11. نقوی، نور الحسن (تصحیح)، کلیات مصحفی۔ جہم، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2013 ص 189
12. نقوی، نور الحسن (تصحیح)، کلیات مصحفی۔ جہم، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2013 ص 205
13. طاہری، محمد رضا (مرتب)، دیوان ظہیری نیشاپوری، تہران: موسسہ انتشارات نگاہ، 1379 ش مطابق 2000 ص 384
14. نقوی، نور الحسن (تصحیح)، کلیات مصحفی۔ جہم، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2013 ص 235
15. نقوی، نور الحسن (تصحیح)، کلیات مصحفی۔ جہم، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2013 ص 125
16. علوی، تنویر احمد (مرتب)، کلیات ذوق، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2002 ص 300
17. نفیسی، سعید (مرتب)، دیوان انوری، تہران: موسسہ انتشارات نگاہ، 1376 ش مطابق 1997 ص 227
18. علوی، تنویر احمد (مرتب)، کلیات ذوق، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2002 ص 272
19. سجادی، ضیاء الدین، دیوان خاقانی شروانی، تہران: کتاب فروشی زوار، 1357 ش مطابق 1978 ص 19
20. علوی، تنویر احمد (مرتب)، کلیات ذوق، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2002 ص 332
21. سجادی، ضیاء الدین، دیوان خاقانی شروانی، تہران: کتاب فروشی زوار، 1357 ش مطابق 1978 ص 433

■

Mr.Ghulam Akhter, 8-E Mahanadi Hostel, JNU, New Delhi-110067

|| جاوید احمد مغل

عصمت کا معتوب افسانہ

'لحاف'

عصمت چغتائی نے عورت کے جنسی و نفسیاتی مسائل پر کہیں واضح اور کہیں اشاراتی اسلوب میں متعدد افسانے لکھے ہیں۔ ان افسانوں میں ان شادی شدہ عورتوں کے مسائل کو ابھارا گیا ہے جو ازدواجی زندگی کی چکی میں پستے پستے خاموشی سے دم توڑ دیتی ہیں اور ان شوخ و طرار لڑکیوں کی تمناؤں کا بیان بھی ملتا ہے جو جنسی و نفسیاتی خواہشوں میں اپنی زندگیاں تباہ کر لیتی ہیں اور سماج کے لیے بھی ایک مصیبت اور مسئلہ بن جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں لحاف اور ہم سفر اہم افسانے ہیں۔

عصمت چغتائی کا افسانہ لحاف کسی مہذب معاشرے میں تنہا رہ جانے والی عورت کی جنسی گھٹن اور اس کے سد باب کے لیے اختیار کردہ راستے کا بیانیہ ہے۔ لحاف افسانے کے مرکزی کردار بیگم جان کے حوالے سے مسلم گھرانوں کی خواتین کی شرافت اور اخلاقیات پر پڑے ہوئے اس پردے کی علامت ہے جو اپنے اندر جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے غیر فطری وسیلوں کو چھپائے ہوئے ہے۔ عصمت نے 'لحاف' 1940 کے آس پاس اس زمانے میں لکھا جب ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ کے نظریات جنس اور تحلیل نفسی کے اثرات اردو ادب پر بھی اپنا اثر قائم کر چکے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب عزیز احمد (ہوس) اور سعادت حسن منٹو (بو، دھواں اور ٹھنڈا گوشت) جیسے جنسی افسانے لکھ رہے تھے۔ افسانہ 'لحاف' میں لحاف کے اندر کی جنسی سچائیوں کو بے حد فنکارانہ جسارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار بیگم جان ایک ہم جنس پرست کردار کے طور پر سامنے آتی ہیں جو اپنی جنسی خواہشات کی عدم تکمیل کی وجہ سے ہم جنسیت (Lesbianism) کی عادی ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے لیے بیگم جان اپنی ملازمہ ربو کو استعمال کرتی ہیں۔ ان دونوں نسوانی کرداروں میں فاعل کون ہے اور مفعول کون؟ عصمت چغتائی اس حقیقت کو 'لحاف' کے اندر ہی چھپائے رکھتی ہیں۔ دراصل یہاں عصمت چغتائی نے ابہام سے کام لیا ہے۔ یہاں تک کہ عصمت نے ایک بار منٹو کے پوچھنے پر بھی یہ نہیں بتایا کہ لحاف کے اندر کیا ہو رہا تھا۔

عصمت چغتائی کے مطابق انھوں نے 'لحاف' علی گڑھ کی ایک عورت کی زندگی کے حقیقی واقعات کو دیکھ کر تحریر کیا۔ ایک ایسی تنہا عورت جسے دنیا کی تمام تر آسائشیں میسر تھیں لیکن اس کی زندگی میں کمی صرف یہی کہ وہ شوہر کی قربت سے محروم تھی۔ وہ کس قسم کی ذہنی اذیت میں مبتلا تھی عصمت نے افسانہ 'لحاف' کے ذریعے یہی بات بتانے کی سعی کی ہے۔

افسانے کا مرکزی کردار بیگم جان ہے جب افسانہ نگار نے اسے دیکھا تھا تو اس کی عمر تقریباً چالیس بیالیس سال ہوگی۔ لیکن وہ اس عمر میں بھی بے حد حسین ظاہر معلوم ہوتی تھی۔ اس کا رنگ سفید جلد چکنی، بال سیاہ، آنکھیں کالی، پلکیں موٹی موٹی، ابرو کمان جیسے اور ہونٹ ہر وقت سرخی سے رنگے رہتے تھے۔ عصمت چغتائی نے بیگم جان کے خد و خال کو ایک مصور کی طرح ابھارا ہے:

"ان کے جسم کی جلد بھی سفید اور چکنی تھی، معلوم ہوتا تھا کسی نے کس کر ٹانکے لگا دیئے ہوں۔ عموماً وہ اپنی پنڈلیاں کھجانے کے لیے کھولتیں تو میں چپکے چپکے ان کی چمک دیکھا کرتی۔ ان کا قد بہت لمبا تھا اور پھر گوشت ہونے کی وجہ سے وہ بہت ہی لمبی چوڑی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن بہت متناسب اور ڈھلا ہوا جسم تھا۔ بڑے بڑے چکنے اور سفید ہاتھ اور سڈول کمر۔"

ربو (نوکرانی) سے پنڈا کھجانا بیگم جان کے لیے ضروریات زندگی بن گیا تھا۔ جب دیکھو وہ بیگم جان کے سر یا پاؤں یا جسم دبا رہی ہوا کرتی تھی۔ اور جس دن بیگم جان نہاتی اس روز دو گھنٹے پہلے ہی تیل اور خوشبودار ابٹنوں کی مالش کروانا شروع ہو جاتی تھی۔

عصمت چغتائی بچپن سے ہی بیگم جان پر فدا تھیں۔ بیگم جان بھی افسانہ نگار سے بے حد پیار کرتی تھی۔ ایک دن اتفاق سے عصمت کی ماں ایک ہفتے کے لیے آگرہ جاتی ہیں اور انھیں بیگم جان کے پاس چھوڑ جاتی ہیں۔ عصمت کو قدرتی طور پر بیگم جان کے کمرے میں سونے کا موقع ملتا ہے۔ رات کو دس گیارہ بجے تک افسانہ نگار اور بیگم جان ایک دوسرے سے باتیں کرتی رہتی ہیں پھر عصمت چغتائی سونے کے لیے پلنگ پر چلی جاتی ہیں اور بیگم جان (ہرن کی طرح) ربو سے پیٹھ کھجواتی رہتی ہیں۔ مصنفہ کی رات کو جانے کب آنکھ کھلتی ہے اور انھیں ڈر سا محسوس ہونے لگتا ہے وہ کیا دیکھتی ہیں:

"کمرے میں گھپ اندھیرا اور اس اندھیرے میں بیگم جان کا لحاف ایسے ہل رہا تھا جیسے اس میں ہاتھی بند ہو۔ "بیگم جان....." میں نے ڈری ہوئی آواز نکالی، ہاتھی ہلنا بند ہو گیا، لحاف نیچے دب گیا۔

"کیا ہے.....سو رہو....." بیگم جان نے کہیں سے آواز دی۔

"ڈر لگ رہا ہے....." میں نے چوہے کی سی آواز سے کہا۔

"سو جاؤ.....ڈر کی کیا بات ہے.....آیت الکرسی پڑھ لو۔"

"اچھا....." میں نے جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھی۔ مگر یعلم ما بین.....پر ہر دفعہ آ کر اٹک گئی۔ حالانکہ مجھے اس وقت پوری آیت یاد ہے۔

"تمھارے پاس آ جاؤں بیگم جان....."

"سنتیں..... بیٹی..... سو رہو....." کسی نے اچٹتی سی کہا گیا۔
اور پھر دو آدمیوں کے کھسر پھسر کرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہائے رے یہ دوسرا کون؟ میں اور بھی ڈری۔
"بیگم جان..... چور ووَر تو نہیں....."
"سو جاؤ بیٹا..... کیسا چور....." ربّو کی آواز آئی۔
میں جلدی سے لحاف میں منہ ڈال کر سو گئی۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت افسانہ نگار لحاف کے اندر بیگم کی پُر اسرار سرگرمی دیکھ رہی تھی اس وقت اُن کا شعور اتنا پختہ نہیں تھا کہ وہ لحاف کے اندر کی سرگرمی کی حقیقت کو پوری طرح سمجھ پاتی۔ لیکن جب افسانہ نگار ان کے لحاف کو ہاتھی کی طرح جھولتا دیکھ کر بیگم جان کو پکارتی ہیں تو یہاں عصمت بڑی فنکاری سے ایک آواز بیگم جان کی سناتی ہیں جو اُن سے کہتی ہے، سو جاؤ ڈر کی کیا بات ہے آیت الکرسی پڑھ لو اور دوسری آواز ربّو کی آتی ہے جو بھی ان سے سو جانے کی تاکید کرتی ہیں۔ لحاف کے اندر دو کرداروں کی موجودگی کا صوتی اشارہ کر کے عصمت قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

صبح 'لحاف' بالکل معصوم نظر آتا ہے یعنی اس میں کوئی حرکت دکھائی نہیں دیتی ہے اور عصمت کے ذہن سے بھی رات کے خوف کا تصور غائب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ رات کو ڈر سے اٹھ اٹھ کر بھاگنا اور بڑبڑانا افسانہ نگار کے لیے عام بات تھی۔ وہ بچپن میں ایسا کیا کرتی تھی اور سب لوگ کہتے تھے کہ اسے بھوتوں کا سایہ ہے۔

ربّو ایک دن اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے گھر چلی جاتی ہے۔ بیگم جان کی مالش کرنے والا کوئی نہیں تھا اس لیے وہ سارا دن پریشان رہیں۔ اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا رہا۔ بیگم جان کو کسی اور کا چھونا بھی پسند نہیں۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا اور سارا دن اداس رہی۔ ربّو کو دوسرے دن آنا تھا لیکن وہ دوسرے دن بھی نہیں آئی اور بیگم جان کا مزاج کافی چڑچڑا ہو گیا۔ ربّو کی غیر موجودگی میں عصمت کو بیگم جان کے پاس سونے کا اتفاق ہوتا ہے۔ پچھلی رات کی طرح اس رات بھی دونوں کافی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ پھر رفتہ رفتہ عصمت کو ڈر سا محسوس ہونے لگا۔ وہ لکھتی ہیں:

"میرا دل چاہا کسی طرح بھاگوں اور انھوں نے زور سے بھینچا۔ میں پھنس گئی۔ بیگم جان زور زور سے ہنسنے لگیں..... ان کی آنکھوں کے پپوٹے اور وزنی ہو گئے۔ اوپر کے ہونٹ پر سیاہی گھری ہوئی تھی۔ باوجود سردی کے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ناک پر چمک رہی تھیں..... کمرے میں اندھیرا گھپ ہو رہا تھا۔ مجھے ایک نا معلوم ڈر سے دہشت سی ہونے لگی۔ بیگم جان کی گہری گہری آنکھیں۔ میں رونے لگی دل میں۔ وہ مجھے ایک مٹی کے کھلونے کی طرح بھینچ رہی تھیں۔ ان کے گرم گرم جسم سے میرا دل ہولانے لگا۔ مگر ان پر تو جیسے کوئی بھتنا سوار تھا اور میرے دماغ کا یہ حال کہ نہ چیخا جائے اور نہ رو سکوں۔ تھوڑی دیر کے بعد پست ہو کر نڈھال لیٹ گئیں۔ ان کا چہرہ پھیکا اور بدرونق ہو گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگیں۔ میں سمجھی کہ اب مریں یہ اور وہاں سے اٹھ کر سرپٹ بھاگی باہر....."

مذکورہ سطور میں عصمت چغتائی نے بیگم جان پر جنسی تسکین کے جذبے کے غلبے کو بیان کیا ہے۔ چونکہ اس رات ربّو بیگم جان کے پاس موجود نہیں تھی اس لیے بیگم جان افسانہ نگار کو ہی مشغول بنانے کی کوشش کرتی

"لحاف اگر کسی مرد افسانہ نگار نے لکھی ہوتی تو وہ کہانی شاید پڑھنے والے کو اس طرح نہ جھنجھوڑتی۔ کہانی چونکہ ایک خاتون نے لکھی تھی اور وہ بھی اس مخصوص اسٹائل میں اور خوبصورت الفاظ میں۔ اس لیے اس کا اثر تو زیادہ ہونا ہی تھا

ہیں۔ اور آخر کار جب کسی حد تک اُن کے جنسی جذبہ کی تسکین ہو جاتی ہے تو وہ نڈھال ہو کر لیٹ جاتی ہیں۔ دراصل جنسی معاملات کا ایسا بیان لحاف سے پہلے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں نہیں ملتا ہے۔ منٹو اور عزیز احمد نے بھی اس حد تک جنسی حقیقت نگاری سے پرہیز ہی کیا ہے۔ اور عدالت میں بھی عصمت پر لحاف کی بنیاد پر مقدمے کا باعث بنی۔

سعادت حسن منٹو "لحاف" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایک عرصہ پہلے جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا 'ادب لطیف' میں عصمت کا 'لحاف' شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے یاد ہے میں نے کرشن چندر سے کہا "افسانہ بہت اچھا ہے لیکن آخری جملہ بہت ہی غیر صناعانہ ہے۔ احمد ندیم کی جگہ اگر میں ایڈیٹر ہوتا تو اسے یقیناً حذف کر دیتا۔ چنانچہ جب افسانوں پر باتیں شروع ہوئیں تو میں نے عصمت سے کہا "آپ کا افسانہ 'لحاف' مجھے بہت پسند آیا..... لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس افسانے کے آخر میں آپ نے بیکار جملہ لکھ دیا کہ ایک انچ اٹھے ہوئے لحاف میں میں نے کیا دیکھا۔ کوئی مجھے لاکھ روپیہ بھی دے تو میں کبھی نہیں بتاؤں گی۔"

عصمت نے کہا "کیا عیب ہے اس جملے میں؟"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے عصمت کے چہرے پر وہی سمٹا ہوا حجاب نظر آیا جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہرے پر ناگفتنی شے کا نام سن کر نمودار ہوا کرتا ہے۔ مجھے سخت ناامیدی ہوئی۔ اس لیے کہ میں 'لحاف' کے تمام جزئیات کے متعلق اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ جب عصمت چلی گئی تو میں نے دل میں کہا "یہ تو کمبخت بالکل عورت نکلی۔"

اس افسانے میں عصمت چغتائی نے جس فنی مہارت اور نزاکت سے شریف گھرانوں کی جنسی بے راہ روی کو پیش کیا ہے وہ کسی مرد افسانہ نگار کے بس کی بات نہیں تھی۔ کرشن چندر نے اسی افسانہ 'لحاف' کو ذہن میں رکھتے ہوئے مجموعہ 'چوٹیں' کے دیباچے میں لکھا تھا:

"عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں۔"

اسی طرح فکشن نگار کشمیری لال ذاکر بھی افسانہ 'لحاف' کے مطالعے سے گہرے اثرات مرتب ہونے پر انھوں نے اپنے ایک مضمون 'عصمت چغتائی: کہانی بولتی ہے' میں لکھا ہے:

"لحاف اگر کسی مرد افسانہ نگار نے لکھی ہوتی تو وہ کہانی شاید پڑھنے والے کو اس طرح نہ جھنجھوڑتی۔ کہانی چونکہ ایک خاتون نے لکھی تھی اور وہ بھی اس مخصوص اسٹائل میں اور خوبصورت الفاظ میں۔ اس لیے اس کا اثر تو زیادہ ہونا ہی تھا۔ لیکن اس کہانی کا مجھ پر بڑا عجیب و غریب اثر ہوا۔ میں نے کئی برسوں تک سردیوں میں لحاف استعمال کرنا چھوڑ رکھا اور کمبلوں کو ہی استعمال کرتا رہا۔"

کلی طور پر افسانہ "لحاف" میں عصمت چغتائی نے ہمارے سماج میں پنپنے والے مسئلہ ہم جنس کو موضوع بنا کر معاشرے کی ایک ایسی بدترین برائی سے پردہ اٹھایا ہے، جہاں بیگم جان اور ربّو جیسی ہزاروں عورتیں اس دلدل میں دھنس رہی ہیں اور پھر عصمت نے ظاہری و خارجی عریانی سے دامن بچاتے ہوئے اپنی ساری فنکارانہ بصیرتیں دونوں خاتون کرداروں کی داخلی کیفیات پر صرف کی ہیں۔

■

Javed Ahmed Mughal C/O Dr.Mohd Reyaz Ahmed, Deptt. of urdu University of Jammu - 180006, Mob:, 09419592453
Email: mlitr.00139@gmail.com

اردو غزل اور ماحولیاتی سائنس

ڈاکٹر محمد عادل

انسان جب اس عالم وجود میں آیا تو اس نے ایک ہرے بھرے ماحول کو اپنے گرد و پیش میں پایا اور اس ماحول میں ہی اس نے زندگی کو جینے کا سلیقہ اور ہنر بھی سیکھا۔ عہد قدیم کا انسان ہو یا دور جدید کا — ہر لمحہ وہ ماحولیات سے فیض یاب ہوتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ لکھنا، پڑھنا اور بولنا نہیں جانتا تھا تو اپنے اطراف کے ماحول کو دیکھتا اور مشاہدہ کرتا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار ماحول کے ذریعے سے کرتا تھا۔ اس بات کے شاہد آثار قدیمہ کے وہ دستاویز ہیں جس میں اس نے پتھروں اور چٹانوں پر اپنے ماحولیاتی نظام کی تصویر کشی کی ہے۔ لیکن جب اس نے لکھنا، پڑھنا اور بولنا سیکھ لیا تو وہ ماحول کی ان چیزوں کو اپنی زبان و کلام میں بہ خوبی استعمال کرنے لگا۔ اس کے ثبوت وہ محاورے اور الفاظ ہیں جو اس نے ماحول سے اخذ کیے ہیں۔

گویا انسان نے جو کچھ سیکھا، سمجھا یا دریافت کیا ہے وہ سب اس کو اپنے ماحول سے فراہم ہوا ہے۔

اردو شاعری کا جہاں تک تعلق ہے تو اس میں کوئی ایسی صنف سخن نہیں جس میں ماحولیات کی کیفیت اور اس کی ترجمانی نہ ملتی ہو۔ قصائد کی بات کریں تو اس میں مناظر قدرت کے اشعار ملتے ہیں، مرثیہ بھی ایک پہلو کے مضمون کو سو رنگ سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، مثنویوں میں بھی قدرت و فطرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اس میں بہار و خزاں، گرمی و سردی، صبح و شام، جنگل و بیابان، کوہ و صحرا، سبزہ زار وغیرہ کے مناظر صاف طور سے نظر آتے ہیں۔ غزلوں کا دامن بھی اس سے اچھوتا نہیں ہے اس میں بھی تشبیہات، تلمیحات، حسن تعلیل، علامتوں اور استعاروں کے آئینے میں ماحولیات کی ترجمانی ملتی ہے۔ بالخصوص دور جدید کی غزلوں نے تو اس کو اپنا لازمہ سا بنا رکھا ہے۔ دراصل شاعر جو تخلیق کرتا ہے جو وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول میں دیکھتا ہے۔

ہزاروں سال سے زمین انسان اور جانوروں کا مسکن بنی ہوئی ہے اور ارتقا کی بہت سی منزلوں سے گزرتے ہوئے آج کے ترقی یافتہ دور میں پہنچ گئی ہے۔ زمین کے ماضی کا مطالعہ کرنے سے ہم کو زمین پر آئی تبدیلیوں کے بارے میں پتا چلتا ہے۔

سائنسدانوں کے مطابق کائنات کا وجود ایک بڑے دھماکے (Big Bang) کے بعد وجود میں آیا۔ دھماکے کے بعد ایک ذرہ ہر جگہ پھیل گیا اور خلا میں دور دور تک پھیل گیا۔ ہمارا نظام شمسی بھی اسی طرح بنا ہے۔ ماہرین کے مطابق سورج کے چکر کاٹنے والے ہمارے نظام شمسی کے سیارے عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، یورینس، نیپچون، پلوٹو بھی سورج کے ہی ٹکڑے ہیں جو ایک طاقت اور ہلچل کے سبب ٹوٹ کر سورج سے نکلے ہیں۔ ہماری زمین نظام شمسی کا ایک اکلوتا سیارہ ہے۔ اس کا اکلوتا پن یہ ہے کہ اس میں زندگی کے لیے مناسب حالات موجود ہیں۔ ہمارا ماحول فطری طور سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے ماحول میں چاروں طرف جاندار اور غیر جاندار چیزیں شامل ہیں اس کے علاوہ اس میں طبعی عوامل مثلاً روشنی، درجہ حرارت، دباؤ، پانی، رطوبت (نمی)، ہوا، بارش اور موسم وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اس لیے ہمارے اطراف کی طبعی اور حیاتی دنیا ہی ہمارا ماحول کہلاتی ہے۔ یعنی جو بھی جاندار اور بے جان حیاتیات و جمادات سے متعلق چیزیں ہیں، ان سب کا مجموعی نام ماحول (Environment) ہے۔

زمین پر مختلف قسموں کے جانداروں کے ارتقا (Evolution) اور بقا (Survival) کے لیے مناسب حالات پائے جاتے ہیں۔ زمین کا درجہ حرارت نہ زیادہ گرم ہے اور نہ زیادہ سرد جتنا کہ زہرہ اور عطارد پر اور مشتری اور دوسرے سیاروں پر ہے۔

ہمارا ماحولیاتی نظام یعنی ماحول کے چار بنیادی عناصر کرۂ باد (Atmosphere)، کرۂ جمادات (Lithoshphere)، کرۂ آب (Hydrosphere)، اور کرۂ حیات (Biosphere) پر مشتمل ہے۔

کرۂ باد (Atmosphere) زمین کے اطراف میں پائے جانے والا گیسوں کا ایک غلاف ہے جس نے زمین کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے جو زمین کو سورج کی

الٹراوائلٹ کرنوں سے حفاظت کرتا ہے۔ یہ ایک اہم کرہ ہے کیوں کہ موسم میں تبدیلیاں اسی کرہ کے سبب ہوتی ہیں۔ ماحول کے چاروں عناصر میں اس کا شمار سب سے زیادہ تغیر پذیر عناصر میں ہوتا ہے۔ کرۂ باد میں طرح طرح کی گیسیں پائی جاتی ہیں جس میں سب سے زیادہ نائٹروجن کا حصہ ہے۔ یہ زمین سے 20 کلومیٹر کی بلندی پر ہے۔

کرۂ جمادات (Lithosphere) زمین کی سب سے اوپری پرت کو کہتے ہیں۔ یہ سلیکن اور المونیم سے مل کر بنا ہے۔ اس سے ملا ہوا نیچے کا حصہ سلیکن اور میگنیشیم سے مل کر بنا ہوا ہے۔ اس میں ہی مختلف قسم کے ایندھن کے ذخیرے پائے جاتے ہیں۔ اس کی مختلف پرتوں میں مختلف چٹانیں ہیں۔ جب کرۂ زمین کے اوپر یہ پتلی پرت کی شکل میں نظر آتا ہے۔

کرۂ آب (Hydrosphere): زمین کے گرد پانی کا ایک بہت بڑا گھیرا ہے جو سمندر، دریا، جھیل اور دوسرے آبی ذخیروں سے مل کر بنا ہے جس کو کرۂ آب (Hydrosphere) کہا جاتا ہے۔ زمین کا 70 فی صد حصہ پانی سے بھرا ہوا ہے۔ جس کا اثر موسم کی تبدیلیوں اور جانداروں کی زندگی پر بھی ہوتا ہے۔

کرۂ حیات (Biosphere) کو سب سے بڑا ماحولیاتی نظام (Eco-System) کہا جاتا ہے۔ دراصل ماحولیات کے مختلف موضوعات کا تعلق کرۂ حیات سے ہی ہے۔ کیوں کہ اس کا مطلب زندگی دینے والا کرہ ہے۔ کرۂ حیات کے سبب جاندار اور بے جان عوامل کے درمیان مسلسل تعاملات کی وجہ سے غذا اور توانائی کی منتقلی ہوتی رہتی ہے۔ ہمارا زندگی کرۂ حیات کرۂ جمادات (Lithosphere)، کرۂ آب (Hydrosphere) اور کرۂ باد (Atmosphere) پر منحصر ہے۔ ان سب کروں میں زندگی کا وجود موجود ہے اور ان کے اندر جاندار پائے جاتے ہیں۔ ماحول میں یہ اہم ترین عنصر ہے۔ زمین کے علاوہ دوسرے کسی سیارے پر کرۂ حیات کے امکانات نہیں ملتے ہیں۔ کیوں کہ وہاں پر نہ تو پانی ہے اور نہ ہی ہوا کا وجود ہے۔ اسی کے سبب وہاں کرۂ آب اور کرۂ باد کا بھی وجود نہیں ملتا ہے۔ زمین پر موجود تمام جاندار زندہ رہنے کے لیے اپنے اردگرد کے ماحول پر بھروسہ کرتے ہیں اس میں حیاتی (Biotic) اور غیر حیاتی (Abiotic) سب ہی چیزیں شامل ہیں۔ یہ وہ فطری ماحول ہے جس میں جاندار اپنے اطراف کی چیزوں کے ساتھ ہم آہنگی اور تعلق قائم کرتے ہیں۔

لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ انسان اپنے مفاد کی خاطر اس قدرتی ماحول کے ساتھ کھلواڑ کر رہا ہے۔ انسانی اعمال کے نتیجے میں ہزاروں سال سے مخلوقات کی پرورش کرنے والی یہ زمین آج بربادی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس زمین کی پرتیں ڈھیلی ہوتی جا رہی ہیں، مٹی کی زرخیزی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہوائیں لطیف سے کثیف ہوتی جا رہی ہیں، دریا اور سمندر کا پانی آلودہ ہوتا جا رہا ہے، بہت سے پرندے، جانور اور نباتات کا وجود ختم ہوتا جا رہا ہے۔

ماحولیات کے عناصر میں بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ کرۂ جمادات، کرۂ آب، کرۂ باد اور کرۂ حیات

آلودہ ہو چکے ہیں۔ کرۂ باد میں شگاف ہو چکا ہے جس کے سبب سورج کی مضر کرنیں زمین تک آ رہی ہیں اور زمین کے درجہ حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

برج نرائن چکبست کا یہ شعر مکمل طور سے ماحولیات کے ماضی، حال اور مستقبل کی تبدیلیوں کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

ہمارا ماحول زمین، پانی اور فضا سے مل کر بنا ہے اس لیے اچھا ماحول وہی ہے جس میں یہ تینوں عنصر صاف اور اپنی قدرتی حالت میں ہوں۔ اس ماحولیاتی نظام میں کسی زیادتی یا کمی کے سبب اگر کوئی بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اسے 'ماحولیاتی آلودگی' کہا جاتا ہے۔ انسان اپنے مفاد کی خاطر قدرت کے ساتھ کھلواڑ کر رہا ہے۔ یہ ماحول کو شہر بسانے، صنعت اور راحت کے لیے استعمال کر کے اس کو نقصانات پہنچا رہا ہے۔ جنگلی جانوروں کے اندھا دھند شکار سے کچھ جانور ختم ہو گئے ہیں اور کچھ جانور ختم ہوتے جا رہے ہیں اس وجہ سے مٹی کے کٹاؤ میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ساتھ ہی ہرے بھرے علاقے ریگستانوں میں تبدیل ہونے لگے ہیں مثال کے طور پر صحارا ریگستان بننے کی مختلف وجوہات رومن لوگوں کے ذریعے شیروں کو پکڑنا یا شکار کرنا ہے جس کے سبب وہاں سبزی خور جانوروں کی تعداد بڑھنے سے وہاں جنگلات ختم ہونے لگے اور وہ علاقہ ریگستان میں تبدیل ہو گیا۔

کاربن مونو آکسائیڈ کے خون میں شامل ہونے سے انسانی دل و دماغ پر مضر اثرات پڑتے ہیں اس سے انسان کند ذہن، سست اور تھکا ہوا رہتا ہے۔ سلفر ڈائی آکسائیڈ کے سبب حلق میں خراش، آنکھوں میں جلن اور سانس میں گھٹن محسوس ہونے لگتی ہے۔ نائٹروجن ڈائی آکسائیڈ نظامِ سانس کی نلیوں اور پھیپھڑوں میں ورم جیسی بیماریاں پیدا کرتی ہے۔

احمد فراز اس ماحولیاتی آلودگی کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

اب وہاں خاک اڑاتی ہے صبا
پھول ہی پھول جہاں تھے پہلے

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقیوں نے جہاں ہمارے لیے آسانیوں کی راہ ہموار کی ہے وہیں اس کے مضر اثرات بھی رونما ہوئے ہیں جس نے ہمارے ماحول اور ہماری صحت کو بربادی کی راہ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ فیکٹریوں سے نکلنے والی زہریلی گیسوں، سڑکوں پر آنے جانے والی موٹر گاڑیوں نے فضائی آلودگی میں اضافہ کیا ہے۔ اس فضائی آلودگی کے لیے "کاربن مونو آکسائیڈ، گندھک، نائٹروجن کے آکسائیڈ، ہائیڈرو کاربن" کے 72% ذمے دار ہیں۔ اس آلودگی کے سبب بہت سی بیماریاں پیدا ہوئی ہیں۔ مثلاً پھیپھڑوں اور خون کی بیماریاں، سانس کی بیماریاں، سردی، کھانسی اور الرجی۔ کاربن مونو

آکسائیڈ کے خون میں شامل ہونے سے انسانی دل و دماغ پر مضر اثرات پڑتے ہیں اس سے انسان کند ذہن، سست اور تھکا ہوا رہتا ہے۔ سلفر ڈائی آکسائیڈ کے سبب حلق میں خراش، آنکھوں میں جلن اور سانس میں گھٹن محسوس ہونے لگتی ہے۔ نائٹروجن ڈائی آکسائیڈ نظام تنفس کی نالیوں اور پھیپھڑوں میں ورم جیسی بیماریاں پیدا کرتی ہے۔ فضا میں آلودہ ہائیڈروکاربن کینسر کی بیماری کے موجب بنتے ہیں۔

اس آلودگی کے سبب ہم نے اپنی زمین اور اوزون کی پرت کو متاثر کیا ہے کلورو فلورو کاربن کی وجہ سے اوزون کی پرت میں کمی واقع ہوئی ہے۔ جس کے سبب سورج کی مضر شعاعیں براہِ راست زمین پر آنے سے جلدی کینسر کی بیماریاں رونما ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تیزابی بارش نے بھی برے اثرات پیدا کیے ہیں۔ جو بارش کے پانی میں ان زہریلی گیسوں کے ملنے سے وجود میں آئی ہے۔

اسی بارش سے سبزیاں، انسان، پیڑ پودے، مچھلیاں بھی متاثر ہوئی ہیں۔

اس ماحولیاتی آلودگی کے سبب انسان کی زندگی بری طرح متاثر ہوئی ہے جس کی وجہ سے انسان اپنی جسمانی کی طاقت کھوتا جا رہا ہے وہ کم عمری اور نوجوانی میں بوڑھا نظر آنے لگا ہے اور اس کی زندگی سست کر چھوٹی ہو گئی ہے۔ ایک حساس شاعر بھلا کیسے اپنے ماحول سے بے خبر رہ سکتا ہے۔ ساز دہلوی اپنی غزل کے ایک شعر میں اس ماحولیاتی آلودگی کی ترجمانی کچھ اس طرح کرتے ہیں:

زندگی کم ہے جوانی تو بہت ہی کم ہے
اس پہ آلودہ ہوا کس کو جواں چھوڑتی ہے

پانی قدرت کی طرف سے عطا کیا گیا ایک انمول تحفہ ہے۔ تمام جاندار کی زندگی کا دار و مدار پانی پر ہے۔ جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ بڑی بڑی قومیں (Civilisations) دریاؤں اور سمندروں کے کنارے آباد تھیں جس سے پانی کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

سمندر کا پانی آفتاب کی گرمی سے بھاپ بن کر بلندی پر جا کر بادل بن جاتا ہے اور ہوا کی نمی میں بھی اضافہ کرتا ہے اگر "WATER CYCLE" کا یہ نظام قائم نہ ہو تو بادل تشکیل نہ ہوں اور نہ ہی ہوا کی نمی میں اضافہ ہو۔

اس عمل کے بغیر نہ تو بادل بن سکتے ہیں اور نہ ہی بارش ہو سکتی ہے اور موسم کی تبدیلی کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انسان، نباتات، حیوانات کی زندگی بھی متاثر ہوگی۔

الغرض سمندر کا وجود اگر زمین پر نہ ہو تو پوری ہری بھری دنیا ایک ویران اور بے جان صحرا میں تبدیل ہو کر رہ جائے گی۔

احمد فراز اس سائنسی حقیقت کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

دل کو کیا روئیں کہ جب سوکھ گئی ہوں آنکھیں
شہر ویراں ہے کہ دریاؤں میں پانی کم ہے

شاعر کہتا ہے کہ شہر کی ویرانی کا سبب کہیں دریاؤں میں پانی کم ہونے کی وجہ سے تو نہیں ہے۔ اسی ضمن میں غالب کچھ اس طرح شعر کہتے ہیں:

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

شہری پھیلاؤ (Urbanization)، بڑھتی ہوئی آبادی اور صنعتی نظام نے ماحولیات کی آلودگی کے ساتھ ساتھ سمندر اور زمین میں موجود پینے کے پانی کے ذخیروں کو بھی متاثر کیا ہے جس کے سبب آج پینے لائق پانی کی دستیابی کا مسئلہ در پیش ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان کی کوششیں بھی اس کے لیے بڑے اقدامات کر رہی ہیں سال رواں 2015-16 کو پانی کے تحفظ (Water Conservation) سال کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ بات ہم کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ پینے کے پانی کا تحفظ کرنا زندگی کے لیے لازم ہے۔ دنیا میں تین چوتھائی اور تقریباً 70 فی صد حصے میں سمندر ہونے کے باوجود اس کے کھارے ہونے کی وجہ سے اس کے پانی کو پینے کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔

شہروں میں لوگوں کو مجبور ہو کر پینے کے پانی کے لیے ایک اچھی خاصی رقم خرچ کرنی پڑ رہی ہے۔

بشیر بدر بڑے ہی الگ انداز میں سمندر اور پینے کے پانی کے درمیان موجود فرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ اس انداز میں کہتے ہیں:

میری آنکھیں بھی مچھلیاں ہیں بہت
میں سمندر ہوں پینے کا پانی نہیں

جھیلوں میں مچھلیوں کی آبادی میں تیزی سے کمی واقع ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہاں پر ہونے والی بارش میں تیزابیت زیادہ ہے۔ کیوں کہ تیزابی بارش کی صورت میں مچھلیاں میں انڈے دینے کی اور ان کے بچوں کے زندہ رہنے کی صلاحیت کافی گھٹ جاتی ہے۔

فیکٹریوں اور ملوں سے ٹھوس اور سیال مادے جب نالیوں کے ذریعے دریاؤں میں جا ملتے ہیں یا زرعی مقاصد کے لیے ڈالی گئی کھاد، جراثیم کش کی ہوئی جراثیم کش دوائیاں اور فضا میں پائے جانے والے مرکبات بارش کے پانی کے ساتھ بہہ کر دریاؤں میں شامل ہوتے ہیں تو ان کا پانی آلودہ ہو جاتا ہے۔

یہ پانی نہ شہریوں کے استعمال کے لائق رہتا ہے اور نہ اس کو آبپاشی اور دیگر صنعتوں کے لیے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ اگر آلودہ پانی کو پینے کے استعمال میں لایا جائے تو کئی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں جن میں ہیضہ، ٹائیفائیڈ، جگر اور پیٹ کی بیماریاں قابل ذکر ہیں۔ اس پانی میں مچھلیوں کے علاوہ آبی پودوں اور جانوروں کا زندہ رہنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ تحقیق کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں سمندری پانی کے آلودہ ہونے کی وجہ سے دنیا بھر میں تقریباً ایک ہزار آبی پودوں اور جانداروں کی نسلیں ناپید ہو گئی ہیں۔

بھوپالی ماہرین کے مطابق پانی کے جہازوں سے نکلنے والی گندگی پر مشتمل دھواں آئے دن تیزابی بارش برسانے کی وجہ بنتا ہے۔ سائنس دانوں نے اس بات کا پتہ لگایا ہے کہ فضا میں میتھین (Methane) گیس سے

متاثر ہونے والی تیزابی بارش گہرائی میں پائے جانے والے کئی جانداروں کے ناپید ہونے کا سبب بنی ہے۔ غزل کا یہ شعر اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہوا نظر آتا ہے:

مچھلیوں میں زہر کیسے آ رہا ہے رات دن
آج پانی میں ذرا اترا تو اندازہ ہوا

(وفا نقوی)

آبادی میں اضافہ ہونے کے سبب شہروں کی وسعت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی شہر خوب پھیلنے لگے اور جنگلات سمٹنے لگے۔ پیڑ پودوں کی بے تحاشہ کٹائی ہونے لگی۔ لیکن انسان یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ پیڑوں پر نہیں بلکہ اپنے پیروں پر کلہاڑی چلا رہا ہے۔ اپنے قدرتی ماحول اور زندگی کو بربادی کی راہ پر گامزن کر رہا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس نے اپنے لالچ کی خاطر پیڑ پودوں کے مفاد کو در کنار کر دیا۔ اس نے جس تیزی سے جنگلات کا خاتمہ کیا اتنی رفتار سے پیڑ پودوں کو نہیں لگایا۔ ماحول سے آلودگی دور کرنے کے لیے آج زیادہ سے زیادہ درخت لگانے کی ضرورت ہے کیونکہ ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے کے لیے جنگلات بے حد لازمی ہیں۔ دراصل جنگلات ایک ایسا قدرتی سرمایہ ہیں جس سے انسان کو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ پھر بھی ترقی اور جدیدیت کی حمایت کرنے کا دعویٰ کرنے والے افراد آج اس کی کٹائی کر رہے ہیں۔

ایک وقت ہوا کرتا تھا جب زمین کا 70 فی صد یعنی 12 ارب 80 کروڑ ہیکٹیر جنگلات سے بھرا ہوا تھا جو آج سکڑ کر صرف 16 فی صد 2 ارب ہیکٹیر ہی رہ گیا ہے۔ ماہرین کے مطابق جنگلات کی اندھا دھند کٹائی کے سبب بارش کی مقدار، زیر زمین پانی کی سطح اور پانی کے دیگر قدرتی ذخیروں میں کمی آئی ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر سیلاب، خشک سالی، زمین کا کھسکنا (Land Slide) جیسے حالات رونما ہونے لگے ہیں۔

ماہرین نباتات و جنگلات کے مطابق 50 ٹن وزن کا ایک صحت مند درخت اگر 50 سال تک زندہ رہتا ہے تو وہ 2 لاکھ 50 ہزار روپیوں کی قیمت کی آکسیجن، 20 ہزار روپیوں کی پروٹین، 2 لاکھ 5 ہزار روپیوں کے برابر مٹی کا تحفظ، 3 لاکھ روپیوں کے برابر آبی کنٹرول 2 لاکھ 50 ہزار کے برابر پرندوں کی حفاظت اور ساتھ ہی کیڑوں، مکوڑوں کو بھی محفوظ رکھتا ہے۔ اگر درخت سے حاصل شدہ پھل، پھول، لکڑی اور جڑی بوٹیوں سے حاصل شدہ آمدنی کا اندازہ لگایا جائے تو ایک درخت ہم کو تقریباً 18 لاکھ روپیوں کا فائدہ پہنچاتا ہے۔

اردو غزل کے ایک شاعر نے درختوں کے اس نقصان اور ماحول کی بربادی کو ایک عظیم حادثے سے منسوب کیا ہے:

اک حادثہ عظیم ہوا ہے زمین پر
کیسا گھنا درخت گرا ہے زمین پر

(بلال نقوی)

اس بات کی وضاحت یہ شعر بھی کرتا ہوا نظر آتا ہے:

درخت کاٹنے والوں نے یہ نہیں سوچا
کہ اپنی موت کا سامان کر رہے ہیں ہم

(وفا نقوی)

درخت زمین کے محافظ ہوتے ہیں ان کی جڑیں پانی کو

افسوس کا مقام ہے کہ اس نے اپنے لالچ کی خاطر پیڑ پودوں کے مفاد کو در کنار کر دیا اس نے جس تیزی سے جنگلات کا خاتمہ کیا اتنی رفتار سے پیڑ پودوں کو نہیں لگایا ماحول سے آلودگی دور کرنے کے لیے آج زیادہ سے زیادہ درخت لگانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے کے لیے جنگلات بے حد لازمی ہیں۔ در اصل جنگلات ایک ایسا قدرتی سرمایہ ہیں جس سے انسان کو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ پھر بھی ترقی اور جدیدیت کی حمایت کرنے کا دعویٰ کرنے والے افراد آج اس کی کٹائی کر رہے ہیں۔

جذب کر لیتی ہیں اور وہ دور دور تک پھیل کر مٹی کے کٹاؤ کو روکتی ہیں۔ اور وہ مٹی کی زرخیزی کو برقرار رکھتے ہیں۔ جس زمین پر پیڑ پودے اور ہریالی نہیں ہوتی اس کی زرخیزی میں کمی واقع ہونے لگتی ہے ساتھ ہی سیلاب اور بارش کے پانی کے سبب مٹی کے کٹاؤ کے امکانات بڑھتے گئے ہیں۔

وفا نقوی اپنے ایک شعر میں اس کی ترجمانی کچھ اس طرح کرتے ہیں:

تو نہ تھا جب تک یہاں آب رواں خوب ہوا
اب کے برسات میں مٹی کا زیاں خوب ہوا

آج درختوں کی کٹائی کے سبب ہمارا قدرتی ماحول بربادی کی دہلیز پر کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ کرۂ ارض مسلسل گرم ہوتا جا رہا ہے۔ ماحول کی آلودگی کے سبب کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دوسری خطرناک گیسیں سورج کی کرنوں سے پیدا ہونے والی گرمی کو کرۂ ارض تک لانے کا سبب بنتی ہیں اور وہ اس گرمی کو واپس Atmosphere میں جانے سے روک لیتی ہیں۔

جس کے نتیجے میں زمین کا درجہ حرارت بڑھنے لگتا ہے۔ اس عمل کو Global warming کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ گلوبل وارمنگ کے اثرات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ ان نتیجے کے اثرات سمندر کے درجہ حرارت میں اضافہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ جو موسم کی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں بارش کا کم ہونا، قحط یا خشک سالی جیسے بڑے مسائل ہیں۔

ناصر کاظمی اور عباس تابش کے یہ اشعار ماحولیات کی ان دشواریوں کو پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

پیاسی دھرتی جلتی ہے
سوکھ گئے بہتے دریا
زمین لوگوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگ آسماں دیکھا نہ جائے
بھری برسات خالی جا رہی ہے
سرابر رواں دیکھا نہ جائے

(ناصر کاظمی)

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

(عباس تابش)

اس کے علاوہ بشیر بدر اس موضوع کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

زمیں سے آگے زمیں توڑ کر نکلتی ہے
عجیب گھٹن ان بادلوں سے بھری ہے
خاک ہو جائے گی زمیں اک دن
آسمانوں کی آسانی میں

(بشیر بدر)

الغرض آج ہم جس دور میں اپنی زندگی گزر بسر کر رہے ہیں اس میں ماحولیاتی آلودگی کی زیادتی ایک اہم مسئلہ ہے اور کوئی بھی حساس طبیعت یا شاعر اس موضوع سے گریز نہیں کر سکتا۔

کتابیات

(1) ماحولیات (محمد حسن خان) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
(2) ماحولیاتی سائنس (ماحولیات کے بنیادی تصورات) ڈاکٹر شاداب حسن خان (ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ)

■

Er. Mohd Adil, Bilal House, H No.4/114, Jagjeevan Colony Nagiah Mallah Civil Line, Aligarh - 202002 (UP)

'برج بانو' کا عاشق کنھیالال کپور

ثمر جہاں

اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان کو مختلف ادوار میں الگ الگ ناموں سے پکارا گیا۔ کسی نے اسے ہندی کہا، کسی نے ہندوی تو کہیں ریختہ کے نام سے پکارا گیا۔ عہد شاہجہاں میں اسے 'اردوئے معلی' کہہ کر سراہا گیا۔ ولی نے اس زبان کی آبیاری کا بیڑا اٹھایا۔ میر نے سوز و گداز سے نوازا۔ غالب اور مومن نے اس زبان کو چاشنی عطا کی۔ حالی اور سرسید کی اصلاحی تحریک نے اسے سماجی زندگی کا آئینہ بنایا۔ اقبال اور چکبست نے اس زبان میں حب الوطنی کے گیت گائے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور پریم چند نے حقیقت نگاری کے بیج بوئے۔ رشید احمد صدیقی اور پطرس نے مزاح و شگفتگی کے موتیوں سے اس کے دامن کو بھر دیا۔ اسی کاروان ادب میں ایک اہم نام کنھیالال کپور (1910 تا 1980) کا ہے۔ جو ادب میں بحیثیت ایک طنز و مزاح نگار کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اس زبان کی سرپرستی اس زمانے میں کی جب اسے جلاوطن کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

اردو کے خلاف زور و شور کا پروپیگنڈہ شروع ہوا اسے صرف مسلمانوں کی زبان قرار دے کر ہند کی سرزمین سے جدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس زبان کی سرپرستی کرنے والوں میں کچھ ایسے ادیب بھی شامل تھے جو اس فیصلے کے سخت خلاف تھے۔ جن کا تعلق کسی خاص مذہب یا قوم سے نہیں تھا۔ وہ صرف ہندوستانی تھے اور گنگا جمنی تہذیب کے پروردہ اس زبان اردو پر مر مٹنے والے تھے۔ ان میں ایک کنھیالال کپور بھی شامل ہیں۔

کنھیالال کپور کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ وہ بیک وقت طنز و مزاح نگار کے علاوہ، خاکہ نگار، کالم نگار، ہندی و پنجابی زبان کے مصنف انگریزی زبان میں متعدد مضامین کے خالق اور پیروڈی نگار بھی ہیں۔ یہ پاکستان کے ضلع لائل پور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے کیا اور تقسیم ہند کے بعد موگا (پنجاب) کے ڈی ایم کالج میں بحیثیت لیکچرار مقرر ہوئے اور تاحیات انگریزی زبان میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ کپور کو اردو زبان سے گہری لگاؤ تھا اس جذبے کو وہ تاعمر نبھاتے رہے۔

اردو زبان کے حق میں 'برج بانو' نام سے لکھا ان کا مضمون ایک شاہکار ہے جو اردو زبان سے ان کے والہانہ لگاؤ کو واضح کرتا ہے۔ مزاحیہ اسلوب کے سہارے انھوں نے سماج میں اردو کے مخالفین پر طنز کے وار کیے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اردو زبان سے کس قدر محبت تھی۔

اقتباس دیکھیے!

"یہ برج بانو کی داستان ہے۔ برج بانو کون ہے؟ آج کل کہاں ہے؟ اس کے عجیب و غریب نام کی وجہ کیا ہے؟ کوشش کروں گا کہ آپ کو برج بانو سے روشناس کراؤں۔ برج بانو ایک خوبصورت عورت ہے جو پاکستان سے میرے ساتھ آئی ہے وہ آج کل کہاں ہے میرے گھر میں رو رہی ہے.... اسے برج بانو کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کی ماں ہندو اور باپ مسلمان تھا"

...آپ کہیں گے یہ عورت لوگوں سے عشق کرتی ہے۔ آپ نے غلط سمجھا یہ لوگوں سے عشق نہیں کرتی، لوگ اس سے عشق کرنے پر مجبور ہیں۔ دراصل اس عورت کی زبان میں کچھ ایسی جادوئی کیفیت اور کشش ہے کہ جو شخص بھی اس کی باتوں کو سنتا ہے۔ دل و جان سے اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ آپ میری ہی مثال لیجیے۔

..... حکومت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم.....

حکومت قانون بنا سکتی ہے۔ لیکن عوام کے فطری رجحانات کو نہیں بدل سکتی۔ جب تک ہندوستان میں گنگی والے، سکندر، ایبر اور چنا زور گرم بیچنے والے موجود ہیں۔ حکومت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔" (مجموعہ 'گرد کارواں' ص 11)

اس اقتباس میں کپور نے سادہ مزاحیہ اسلوب کے سہارے ہندوستان کی سرزمین کو اردو زبان کی جائے پیدائش (ماں) قرار دے کر حکومت کے ان کارکنوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو اردو کی مخالفت پر کمربستہ تھے۔ مصنف نے واضح کیا ہے کہ یہ زبان ہندوستانی عوام کی زبان ہے مختلف مذاہب کے لوگوں کے دلوں میں بسی ہے۔ جس کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین میں پیوست ہیں جنھیں علاحدہ کیا جانا ممکن نہیں ہے۔ بے شک اس زبان کی آبیاری میں مسلمانوں کا بڑا حصہ ہے۔

اس زبان کی مٹھاس اور قوت کشش سے متاثر ہو کر غیر مسلموں نے اس کی سرپرستی کی ہے۔ یہ ہندوستانی ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اسی لیے اس کے وجود کو مٹایا نہیں جا سکتا۔

طنز و مزاح کی تعریف میں کہا جاتا ہے کہ یہ ادب کی ایک نازک صنف سخن ہے۔ جس کا مقصد ہندوی معاشرتی زندگی سے وابستہ غیر ہموار رویوں کو تنقید کا نشانہ بنا کر مزاحیہ اسلوب میں پیش کرنا اور تخریب سے تعمیر کی طرف رجوع کرتے ہوئے قاری کے ذہن میں مثبت فکر سے اصلاح معاشرہ کا تصور قائم کرتا ہے۔ یہاں ادیب کو بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ ذرا سی لغزش سے تحریر کا اعتدال و توازن بگڑ جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ کپور کی تصانیف اس صنف کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔

کپور کے ادبی سفر کا آغاز 'پیروڈی' سے ہوا جو انھوں نے کرشن چندر کے افسانے 'پرانے' پر 'غالب جدید' نام

سے لکھی جسے بعد میں کرشن چندر اور مہندر ناتھ کی ایما پر تلف کر دیا۔ اس کے بعد 'چیچی شاعری' کے عنوان سے ان کی پہلی پیروڈی 1938 میں ادب لطیف میں شائع ہوئی۔ جس میں جدید شاعری پر گہرا طنز کیا گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے طنزی پیروڈیاں بھی لکھی ہیں۔

کنہیا لال کپور کے 9 مضامین کے مجموعے شائع ہوئے ہیں جن کے نام ہیں۔ سنگ و خشت (1942) چنگ و رباب' (1944) شیشہ و تیشہ (1946) نوک نشتر (1949) بال و پر (1954) نرم گرم (1957) گرد کارواں (1960) دیکل سحر (1965) نئے شگوفے (1988) ہیں۔ (یہ مجموعہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔) اس کے علاوہ دوست احباب کی تخلیقات پر پیش لفظ بھی لکھے ہیں۔

ان مجموعوں میں انھوں نے کہیں سیاسی لیڈروں کی مفاد پرستی سے عوام کی مفلوک الحالی پر طنز کے سنگ و خشت (اینٹ و پتھر) برسائے ہیں۔ 'شیشہ و تیشہ' میں ادیبوں کی ناقدری سے پریشان ہیں تو دوسری عالمی جنگ کی برکتوں کا ذکر چنگ و رباب (ساز) بجا کر کیا ہے۔ آزاد ہندوستان میں مجبور عوام کی ہجرت کے باعث پیدا شدہ مسائل پر نوک نشتر لگائے ہیں۔ تو سیاسی لیڈروں کی تالیوں کو بال و پر کا نام دیا ہے۔ نرم بھی گرم ہو کر ادب کے گرتے معیار کو ظاہر کیا ہے۔ گرد کارواں میں اپنے استاد پطرس بخاری کا خاکہ لکھ کر انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

کپور نے کسی بھی رجحان یا نظریے کی پیروی کیے بغیر ادب کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کی تخلیقات میں ادبی، سماجی و سیاسی شعور کو با آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کے معاصرین میں رشید احمد صدیقی، احمد شاہ بخاری، عظیم بیگ چغتائی، کرشن چندر کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان سب کے مقابل کپور نے خوب لکھا ہے۔ ان کا مشاہدہ اور دائرہ فکر اپنے معاصرین کے بمقابل وسیع ہے۔

کنہیا لال کپور کی ابتدائی تحریروں میں شوخی و ظرافت کے گل بوٹے قاری کو تھوڑی دیر کے لیے شگفتگی و طمانیت کی فضاؤں میں لے جا کر سکون و راحت فراہم کرتے ہیں۔ دیکھیے یہ چند مثالیں!

1. منکر نکیر اور مسٹر انکم ٹیکس کے انسپکٹروں میں یہی فرق ہے کہ منکر نکیر مرنے کے بعد حساب مانگتے ہیں اور موخر الذکر مرنے سے پہلے۔ بلکہ یہ کہ منکر نکیر صرف ایک بار مانگتے ہیں، جبکہ انکم ٹیکس کے افسر بار بار۔ (مضمون انکم ٹیکس، مجموعہ شیشہ و تیشہ ص 86)

2. تمام ہندوستانی ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں مثلاً اچھوت ہندوؤں سے ڈرتے ہیں، ہندو مسلمانوں سے اور مسلمان انگریزوں سے (بلیک اینڈ وائٹ مجموعہ شیشہ و تیشہ ص 45)

3. تیسری جماعت ان افراد کی ہے جو اخبار بینی کے لیے لائبریریوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس جماعت میں زیادہ تر ریٹائرڈ کلرک اور سال خوردہ کلرک ہوتے ہیں۔ یہ اصحاب اصل میں اخبار پڑھتے نہیں بلکہ وقت کاٹنے آتے ہیں۔ لائبریری کے کھلنے کے وقت سے ایک آدھ گھنٹہ پہلے ہی لائبریری کا طواف شروع کر دیتے ہیں۔ (مضمون اخبار بینی مجموعہ سنگ و خشت ص 101)

کپور نے کسی بھی رجحان یا نظریے کی پیروی کیے بغیر ادب کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان کی تخلیقات میں ادبی، سماجی و سیاسی شعور کو با آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کے معاصرین میں رشید احمد صدیقی، احمد شاہ بخاری، عظیم بیگ چغتائی، کرشن چندر کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان سب کے مقابل کپور نے خوب لکھا ہے۔ ان کا مشاہدہ اور دائرہ فکر اپنے معاصرین کے بمقابل وسیع ہے۔

مزاحیہ اسلوب کے یہ دلکش نمونے ہیں۔ قاری کے دل و ذہن کو تھوڑی دیر کے لیے قہقہوں کی انجمن میں لے جاتے ہیں جہاں فکر و غم کی فضا سے دور، فرحت و انبساط کی وادیوں میں اس کی طبیعت کھل کھل اٹھتی ہے۔

کپور نے اپنی تخلیقی و ذہنی بصیرت سے سماج کی ناہمواریوں، اخلاقی قدروں کے زوال اور تقسیم ہند کے باعث وجود میں آنے والے ان گنت مسائل پر ایسے نشتر لگائے ہیں جن کی چبھن سے قاری کا نہ صرف ضمیر ہی تلملا اٹھتا ہے بلکہ اس کی روح تک کانپ اٹھتی ہے۔

صبح آزادی کی فضا اپنے ساتھ رنج و غم کی تاریک سیاہی بھی لے کر آئی۔ ہندوستان کے بٹوارے کی خبر نے مذہبی تفریق کی بنیاد ڈال دی تھی۔ ہر طرف خوف و دہشت کے سائے تھے۔ لوگ تحفظ پانے کے لیے ہجرت کرنے پر مجبور تھے۔ کپور اس وقت لاہور میں رہائش پذیر تھے۔ انھیں بھی نہ چاہتے ہوئے بارونق شہر لاہور چھوڑنا پڑا اور پنجاب کے ایک صحرائی قصبہ موگا (اردو ادب کی فضا سے دور) میں پناہ لی۔ یہیں حکومت ہند کی ملازمت اختیار کی اور تاحیات یہیں رہ کر اردو ادب کی خدمت انجام دیتے رہے۔ مضمون 'ہجرت کے فائدے' میں انھوں نے طنز کے گہرے نشتر لگائے ہیں۔

"ہجرت کرنے سے پہلے میں انسان تھا اب پناہ گزین یعنی شرنارتھی ہوں اور اہل ذوق اچھی طرح سے جانتے ہیں جو مزہ شرنارتھی ہونے میں ہے وہ انسان ہونے میں نہیں.... اس لفظ یا لیبل کی بدولت مجھے ملازمت ملی، رہنے کو مکان ملا، اس کی اگرچہ چھت ٹپکتی ہے اور دیواریں جھکی ہیں لیکن مجھے اس کا کرایہ ادا کرنا نہیں پڑتا۔ تین مہینے مفت راشن، پہننے کے کپڑے، رضائیاں اور کمبل ملے۔ ملازمت حاصل کرنے میں جتنی مدد مجھے اس لیبل سے ملی شاید ہی کسی شخص کو (اگر وہ شرنارتھی نہ ہو) ملی ہو۔" (مجموعہ نوک نشتر ص 90)

درج بالا اقتباس میں کپور نے انسانی جذبے سے عاری حکومت کے ان ٹھیکیداروں پر طنز کے تیر برسائے ہیں جو انسان کی پہچان ہندوستانی اور پاکستانی کے روپ میں کر رہے تھے۔ لوگ اپنی آبائی سرزمین سے جدا ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ہجرت کرنے والوں کے مکان شرنارتھیوں (رفیوجیوں) کو دیے گئے۔ ساتھ ہی ملازمت اور کپڑے بھی مفت دیے گئے۔ حکومت کی اس پالیسی سے مصنف کا دل احساس غم سے تڑپ اٹھتا ہے۔ اسی کرب کے اظہار کے لیے وہ طنز کا سہارا لیتا ہے۔ کپور تقسیم ہند کے سخت خلاف تھے۔

آزاد ہندوستان کی بدحالی کو دیکھ کر کپور کا حساس ذہن بے چین ہو اٹھتا ہے انھوں نے ہندوستان کے جن صوبوں یا شہروں کی سیاحت کی وہاں انھیں بھوک، غربت، افلاس، لاچارگی کے منظر دیکھنے کو ملے۔ جنت نشان کشمیر کے دل فریب مناظر سے لطف اندوز ہونے کے بجائے ان کی نظر وہاں کے غربت زدہ عوام کے مسائل کی جانب اٹھتی ہے۔

کنہیا لال کپور نے کچھ ایسے مسائل پر قلم اٹھایا ہے جو آج بھی ہمارے سماج کے لیے اہم ہیں۔ نوجوان تعلیم یافتہ لڑکوں کی بے روزگاری جو اچھی نوکری پانے کے لیے در بدر بھٹکنے پر مجبور ہیں۔ سفارش نہ ہونے کے باعث ان کی سب ڈگریاں بے معنی ہیں۔ کپور نے نادر منی کے روپ میں سماج کے ٹھیکیداروں کے نادر سلوک کا خوب مذاق اڑایا ہے۔

مضمون 'جانشین' میں راوی نادر منی حصول معاش کی

خاطر ایک امیدوار کا بھیس بدل کر انٹرویو دینے کے لیے بورڈ ممبران کے سامنے حاضر ہوتے ہیں۔

انٹرویو بورڈ کا ایک ممبر: تعلیم؟ قابلیت؟ سفارش؟

نادر منی: فرسٹ کلاس ایم۔اے ہوں۔ یونیورسٹی میں فرسٹ رہا ہوں۔

دوسرا ممبر: سفارش؟

نادر منی: سفارش کوئی نہیں۔

تیسرا ممبر: (قہقہہ لگا کر) سفارش کوئی نہیں اور ملازمت کرنے آئے ہیں!

پہلا ممبر: کسی وزیر کے رشتہ دار ہو؟

نادر منی: نہیں

دوسرا ممبر: کسی ایم ایل اے کے داماد ہو؟

نادر منی: نہیں

پہلا ممبر: نوجوان تم نے درخواست دے کر خواہ مخواہ اپنا اور ہمارا دونوں کا وقت ضائع کیا ہے۔ تم جا سکتے ہو تمہیں حشر تک کوئی ملازمت نہیں ملے گی۔

(مجموعہ بال و پر ص 64،65)

اس طرح اسلوب سے واضح ہوتا ہے کہ بحیثیت معلم جہاں وہ بچوں کی ذہنی تربیت کرتے رہے، انھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے، اور ایک قابل شہری بننے کا درس دیتے ہیں، وہیں وہ سماج کے ناقص نظام سے بھی نالاں تھے، جس کا اظہار وہ اپنی تحریروں میں برملا کرتے نظر آتے ہیں۔

کپور تخلیق کار ہونے کے باعث ادب اور سماج کے رشتے سے خوب واقف تھے۔ آزادی کے بعد ایک ایسا دور بھی آیا، جب بہت سارے ادیب فلمی دنیا کی چکا چوند روشنی، سستی شہرت، زیادہ پیسوں کے لالچ میں فلموں کی طرف راغب ہو گئے یہ وہ ادیب تھے جو تخلیقی ادب کی عظمت سے منہ موڑ کر صرف اپنے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کپور ایسے ادیبوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

کپور کا سماجی شعور کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور بھی نکھرا ہوا ہے۔ انھوں نے حکومت کے ذریعے لگائے گئے ان گنت ٹیکسوں پر بھی سخت نکتہ چینی کی ہے۔ جہاں سیاسی لوگ اپنے مفاد کی خاطر معمولی سی معمولی چیزوں پر ٹیکس لگا کر آمدنی کا ذریعہ بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ایک اوسط درجے کا شہری حکومت کے ٹیکس سے پناہ مانگتا ہے۔ مضمون 'وزیر ٹیکس' میں وہ مزاحیہ اسلوب اختیار کر کے حکومت کا مذاق اڑاتے ہیں۔

"کوئی ایسی چیز بتایئے جسے ہر شخص استعمال کرتا ہو اس پر ٹیکس لگایا جائے تو معقول آمدنی ہو سکتی ہے......

ایک چیز کا مجھے پتہ چل گیا ہے باقی آپ بتایئے۔

وہ کونسی چیز ہے۔

برف!

"برف؟"

"ہاں بھئی گرمی کے موسم میں ہر شخص برف استعمال کرتا ہے۔

خوب بہت خوب انھوں نے وزیر ٹیکس کی ذہانت کی داد دیتے ہوئے کہا۔

اچھا اب آپ بتایئے آپ نے کیا سوچا ہے؟

میرے خیال میں ابھی بہت سی چیزیں باقی

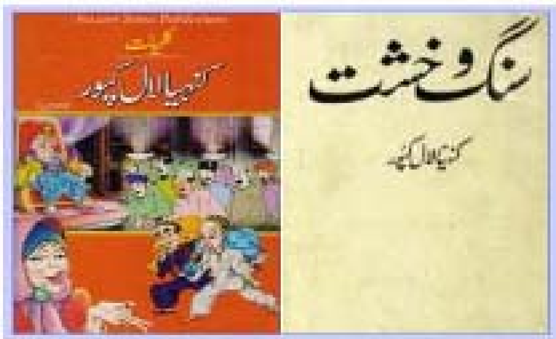

ہیں۔ مثال کے طور پر شراب!

آپ کا مطلب ہے وہسکی شراب؟

ہاں ہاں!

اس پر ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا"

کیوں؟

اس لیے کہ...... شراب تو ہم پیتے ہیں۔

خضاب!

خضاب پر ٹیکس لگانا ٹھیک نہیں رہے گا۔ والد محترم خضاب لگاتے ہیں۔ خضاب کے علاوہ کوئی اور چیز بتایئے۔

کپور کی یہ سیاسی بصیرت آج کے معاشرے میں بھی معنویت رکھتی ہے۔ اب سے برسوں پہلے کپور کے لکھے مضامین 'کامریڈ کا الوداعی خطبہ' 'کامریڈ شیخ چلی' جو ہندوستان دیکھے میں حکومت کے اہل کاروں پر طنز کیا گیا ہے۔ ان کی تخلیقات موجودہ ادبی، سماجی و سیاسی تناظر میں بھی درست نظر آتی ہیں۔

کپور کے فن کے حوالے سے ڈاکٹر شاہد دہلوی لکھتے ہیں۔

"زبان، اسلوب اور موضوع ہر چیز کے اعتبار سے جذبات و خیالات کو پیش کرنے میں قادر نظر آتے ہیں۔ ان کے مضامین کو پڑھ کر اگر ایک طرف چہرے پر شگفتگی پیدا ہوتی ہے، تبسم آ جاتا ہے تو دوسری طرف ان کے طنز کے گہرے نشتر ٹھیک شہ رگ میں اتر تے چلے جاتے ہیں۔" (اردو کے منتخب مزاحیہ اسلوب کپور نمبر ص 25)

کپور کی جادو بیانی کا زور صرف مضامین تک ہی محدود نہیں رہا۔ بلکہ انھوں نے اردو کے طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاروں میں ایک منفرد مقام بنایا۔ جب وہ ڈی ایم کالج موگا (پنجاب) سے ریٹائر ہوئے تو روزنامہ 'ہند سماچار گروپ' سے منسلک ہو گئے اور 'میں دیکھتا چلا گیا' کے عنوان سے کالم لکھنا شروع کیا۔ پہلے صرف سنڈے ایڈیشن کے لیے لکھتے تھے۔ لیکن بعد میں مدیر اعلیٰ کے زور دینے پر روزانہ کالم لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سلسلہ 1978 سے لے کر 1980 وفات تک قائم رہا۔ انھوں نے کم و بیش آٹھ سو کالم لکھے اعتبار سے یہ بھی، جہاں ان کے لیے ذریعہ معاش کی وجہ بنی (پرائیویٹ کالج میں ہونے کی وجہ سے پنشن نہیں تھی) وہیں انھیں شہرت و عظمت کے بام عروج تک لے گئی۔

کپور نے اپنے عزیز دوستوں کے خاکے بھی لکھے ہیں جن میں 'بجھاں گرنتھ' کے نام سے دیوندر ستیارتھی کا 'پیر و مرشد' کے نام سے اپنے استاد احمد شاہ بخاری کا اور 'شریارئی' کے عنوان سے کرشن چندر کا خاکہ اہم ہے۔

کپور کی زندگی کا مطالعہ کریں تو یہ جان کر حیرانی ہوتی ہے کہ انگریزی ادب کا معلم، جس کی مادری زبان پنجابی ہے۔ وہ 42 برس تک ادب کی تخلیق میں ہی اپنا زیادہ وقت صرف کرتا رہا، جس نے صحرا میں بیٹھ کر بھی اس زبان کی حفاظت کی۔ اس کے تحفظ اور بقا کے رشتے کو نبھایا۔ کسی ادبی مرتبے کا لالچ کیے بغیر۔ کپور نے اردو زبان و ادب سے بے لوث محبت کی اور ایک صحت مند ہندوستانی سماج کی تعمیر کو اپنی تخلیقات کا محور بنایا۔

کپور ان خوش نصیب ادیبوں میں سے رہے جن کو زندگی ہی میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ 1975 میں صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد نے انھیں 'غالب ایوارڈ' سے نوازا۔ بلاشبہ کنہیا لال کپور ایک عظیم فنکار تھے۔ ادب میں ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔

■

Dr. Samar Jahan, 2051, Gali Kucha Nahar Khan Kucha, Daryaganj, New Delhi - 110002

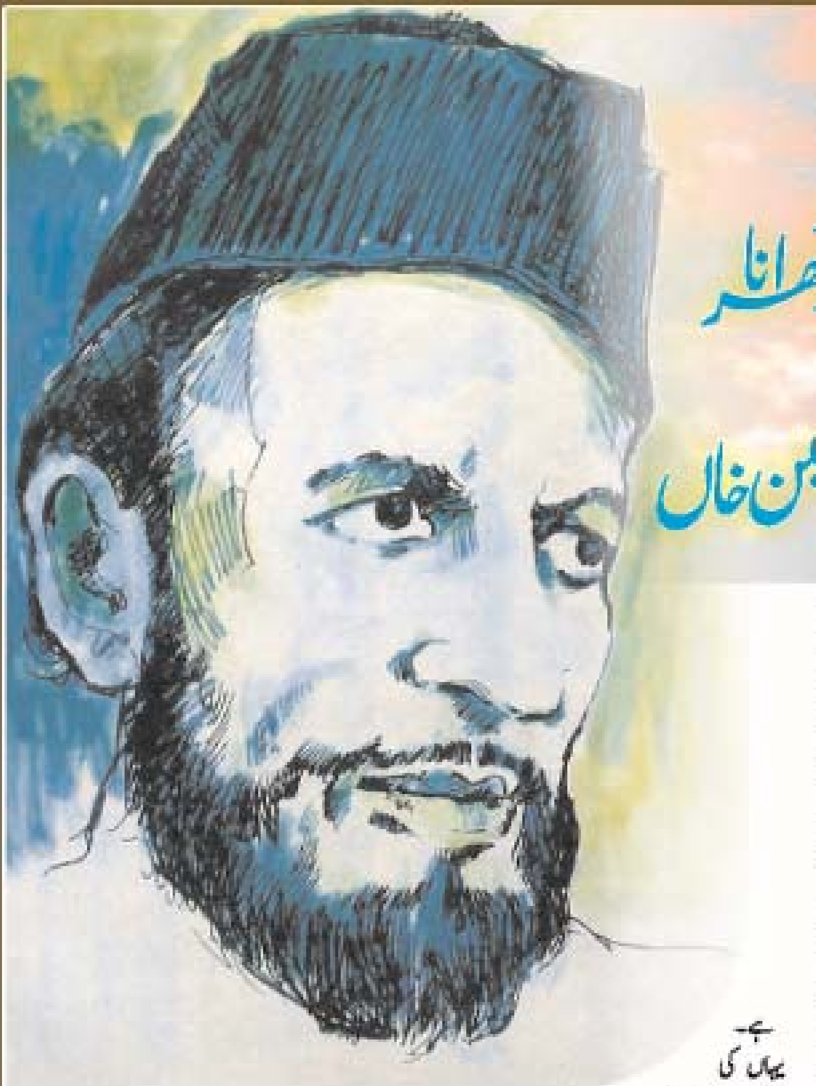

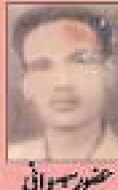

حضور سہسوانی

سہسوان رام پور گھرانا اور استاد مشتاق حسین خاں

موسیقی فنونِ لطیفہ میں سے ایک فن ہے۔ ایک ایسا فن جو سب سے قدیم اور مقبول ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اب سے ہزاروں برس پہلے حضرت داؤد علیہ السلام (جن پر کتاب الٰہی زبور نازل ہوئی تھی) کو قدرت نے ایسی آواز اور غنائیت عطا کی تھی کہ جب آپ گاتے تھے تو اس کے اثر اور سحر سے پتھر پگھلنے اور پہاڑ جھومنے لگتے تھے۔ موسیقار نامی ایک پرندے کا ذکر بھی کتابوں میں ملتا ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی چونچ میں بہت سے سوراخ ہوتے ہیں۔ جن میں سے طرح طرح کی راگنیاں اور چنگاریاں نکلتی ہیں۔ ققنس اسی کو کہتے ہیں۔

ابوعبدالرحمٰن خلیل ابن احمد الفراہیدی البصری 100ھ میں عمان میں پیدا ہوئے اور 170ھ میں وہیں وفات پائی۔ آپ کو علم عروض کے علاوہ علم موسیقی سے بھی کامل واقفیت تھی۔ آپ کی دو تصانیف جس میں "کتاب النغم" علم موسیقی پر تھی کتاب ہذا میں انھوں نے مختلف راگ، راگنیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے موسیقی کی تعریف اور اس کے اثرات کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ حضرت امیر خسرو کو بھی کئی راگ راگنیوں کا موجد بتایا جاتا ہے۔ ستار کے دو تاروں میں تیسرے تار کا اضافہ بھی خسرو ہی نے کیا جس سے اس کی آواز نہ صرف بڑھی بلکہ زیادہ پُرکشش ہوگئی۔ واجد علی شاہ اختر کے مطابق خسرو کے ایجاد کردہ راگ، ترانہ، چھند، پربند، گیت، قول، خیال، قلبانہ، نقش نگار ہیں اور سازوں میں ڈھول، طبلہ، بینا، جیسے متعدد سازوں کی ایجاد کا شرف انھیں حاصل ہے۔ لیکن ان کے تیسرے تار کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔

ہمارے بھارت میں یہ فن ابتدا ہی سے مقبول رہا ہے۔ یہاں کی اکثریت میں گانا عبادت میں شامل ہے۔ جو یہاں مختلف گھرانوں مثلاً گوالیار گھرانا، کیرانہ گھرانا، بنارس گھرانا، آگرہ گھرانا، پٹیالہ گھرانا، مرادآباد گھرانا، دلی گھرانا، جے پور گھرانا، اجاڑہ (راجستھان) گھرانا، اور سہسوان رام پور گھرانے میں بٹا ہوا ہے۔ مضمون ہذا میں اسی گھرانے کے عظیم موسیقار استاد مشتاق حسین خاں کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ہی ان کی موسیقی پر ان کے خیالات و تجربات نیز گھرانے کے دیگر فنکاروں کا بھی تفصیلی ذکر شامل ہے۔

قدرت نے فنِ موسیقی کو ایسی ہمہ گیری و عمومیت بخشی ہے کہ رند ہو یا متقی، عورت ہو یا مرد، بوڑھا ہو یا جوان، خواہ بچہ غرض کسی نقطۂ خیال اور کسی نوعیت کا انسان اس سے خالی نہ ملے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک شخص کھل کر نہیں گاتا۔ مگر وہ اکثر گنگناتا ضرور ہے۔ انسان تو انسان جو فطرتاً صاحب نطق ہے اس کا کسی ایسی چیز سے وابستہ ہونا جس کا تعلق آواز اور بولنے سے ہو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ انسان تو حیوان ناطق ہے مگر پرندے اس تعریف میں نہ آتے ہوئے بھی موسیقی سے کلیتاً الگ نہیں ہیں۔ کوئل کی کوکو، پپیہے کی پی پی، اور چڑیوں کا ایک خاص انداز سے چہچہانا یقیناً موسیقی کی ایک شاخ ہے۔ دوسرے حیوانات بھی اپنی اپنی مخصوص نوعیتوں کی آواز کے سبب احاطۂ موسیقی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ موجوں کے شور، جھرنوں کی رم جھم، بادِ نسیم کی سرسراہٹ اور ماں کی لوری میں بھی موسیقی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا انوکھا ایک ایسا عجیب فن ہے جو آگ لگا دے، جو مینہ برسا دے، کوئی بھی فن ہو اس میں وابستگانِ فن کے مدارج

کیچڑ باؤ دا اور تان سین کی اس بھارت ماتا کے سپوت تھے۔ آج بھی یہ موسیقاروں سے خالی نہیں ہے۔ یہاں اس وقت بھی بڑے بڑے موسیقار موجود ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ یہاں انیسویں صدی کے ایک ایسے ہی موسیقار کا ذکر مقصود ہے جو مسلمہ طور پر ہمارے وطن کا موسیقارِ اعظم کہا جانے کا مستحق ہے اور وہ ہیں مشتاق حسین خاں، جن کا وطن رام پور سمجھا جاتا رہا ہے۔ جبکہ آپ سہسوان (بدایوں) کے باشندے ہیں۔ جہاں 1879 میں ایک سنگیت گھرانے میں آپ کا جنم ہوا۔ جب آپ دس سال کے سن کو پہنچے تو اپنے والد کلن خاں سے موسیقی کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ جو اس فن کے بڑے ماہر تھے۔ تعلیم کا یہ سلسلہ چودہ برس کی عمر تک جاری رہا۔ 1893 میں چچازاد بھائی استاد عنایت حسین خاں کے پاس نیپال چلے گئے۔ جہاں ان سے اور ان کے بھائی محمد حسین خاں بین کار اور حیدر خاں اور ان کے صاحب زادے فدا حسین خاں (جو مشہور موسیقار نثار حسین خاں کے والد تھے) اڑھائی برس تک سیکھتے رہے۔ بعد ازاں سہسوان چلے آئے اور اپنے پھوپھی زاد بھائی امداد حسین خاں سے (جو بڑے گوالیاری کے شاگرد تھے) علم موسیقی حاصل کیا۔ کچھ مدت کے بعد اپنی ننھیال اترولی (علی گڑھ) جا کر اپنے ماموں پھمن خاں اور محبوب خاں وغیرہ سے (جو اس دور کے نامی گائک تھے) اکیس برس کی عمر تک تعلیم حاصل کی۔ پھر جب عنایت حسین خاں ظفر جنگ بہادر کے بلاوے پر حیدرآباد چلے گئے تو خان صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ وہاں دس برس تک نہایت لگن کے ساتھ اپنے فن کا عمل کرتے رہے اور اس دس سالہ مدت کے دوران ان کے فن کی تکمیل کے سلسلے میں ایک ایسا انقلاب رونما ہوا کہ جس نے انھیں بوکھلا کر رکھ دیا۔ جب ان کا ریاض دس بارہ گھنٹے سے تجاوز کر گیا تو ان کی آواز گویا بالکل ختم ہو گئی۔ حتیٰ کہ بھی کوشش کرتے مگر آواز گلے سے باہر نہ آتی۔ وہ مایوس ہو گئے اور ان کے چہار جانب ناامیدی کے اندھیرے پھیل گئے مگر ان کے استاد اس تغیر سے ذرا بھی پریشان نہ ہوئے انھوں نے ہدایت کی کہ ریاض اتنی ہی دیر کرتے رہو خواہ آواز قطعی نہ نکلے۔ ان کا کہنا تھا کہ اب جو آواز کھلے گی تو وہ زندگی بھر خراب نہیں ہوگی۔ لہٰذا خان صاحب اسی تندہی اور لگن سے ریاض کرتے رہے۔ چند دنوں کے بعد آواز یک بیک کھل گئی اور ان کا ریاض بارہ گھنٹے سے بڑھتے بڑھتے بیس گھنٹے تک جا پہنچا۔ جب سے

ان کی آواز کی سحر انگیزی نے ہر سامع کو مسحور کردیا ہر کسی پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی۔ اور سب اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہوگئے اور اس وقت گویا نیند سے جاگے جب روشن دان کے راستے پانی کی بوچھار کمرے میں آنے لگی۔ اب کیا تھا خان صاحب کا چہرہ وفورِ مسرت سے کھل اٹھا اور حاضرین کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔ خان صاحب کو اس وقت جتنی خوشی ہوئی ہوگی۔ اسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، الفاظ کی صورت میں اس کا اظہار ممکن نہیں۔ کیونکہ آج انھوں نے اپنے فن کی معراج پالی تھی۔ اس واقعہ کے لگ بھگ بیس برس بعد 1954 میں دوسری بار کملا رٹریٹ کانپور میں آپ کو میگھ ملہار گانے کا اتفاق ہوا۔ اس سنگیت سبھا میں ملک کے نامور فن کار شریک تھے۔

آخر تک خان صاحب کی آواز نے کبھی دھوکا نہیں دیا۔

اب ان کی تعلیم تقریباً مکمل ہو چکی تھی اور وہ حیدرآباد سے رامپور آ کر نواب حامد علی خاں صاحب کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نواب رضا علی خاں صاحب کے مسند نشیں ہونے پر بھی خان صاحب وہاں ملازم رہے۔ درباری گائکوں میں انھیں فوقیت حاصل تھی۔

نواب رضا علی خاں ہی کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ساون کے مہینے میں جب بارش کی آمد آمد تھی۔ نواب صاحب موصوف نے حسبِ سابق بیگمات کی ساونی منانے کا اہتمام کرایا۔ جملہ بیگمات، کنیزیں، خواجہ سرا اور فوج کے گنتی ہی جوانوں کے ساتھ نواب صاحب اپنے ایک باغ میں تشریف لے گئے۔ درختوں پر جھولے ڈال دیے گئے اور بارش کی بوچھار کا انتظار کیا جانے لگا۔ بادل کسی حسین معشوق کی طرح آتے اور گزر جاتے مگر بارش نہیں ہوئی۔ اس طرح آٹھ دن بیت گئے۔ نویں روز نواب صاحب نے خان صاحب کو بلا کر میگھ راگ گانے کا حکم دیا۔ تاکہ پانی برس سکے۔ خان صاحب یہ سن کر گھبرا گئے۔ کیوں کہ آج ان کے فن کا امتحان تھا اور اس امتحان میں کامیابی کی انھیں امید موہوم بھی نہیں تھی اور وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے میگھ راگ الاپنے سے بادل کے سوتے کھل جائیں گے۔ لہٰذا انھوں نے بصد احترام عرض کیا۔ حضور کی تعمیل ارشاد سے خادم انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن در اصل وہ اس کا اہل نہیں۔ مگر نواب صاحب نہیں مانے۔ ساز منگائے گئے۔ دیگر درباری گویے اور اہلِ دربار اکٹھا ہوئے اور ایک کمرے میں محفلِ سرود کا اہتمام کیا گیا۔ خان صاحب اس وقت حد درجہ متاثر تھے۔ ان کی آنکھیں بار بار آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں اور وہ عالم خیال میں اللہ تبارک تعالیٰ سے اس امتحان کی کامیابی کے لیے گڑگڑا رہے تھے۔ کچھ وقت کے بعد خان صاحب میگھ ملہار گانے بیٹھے۔ حاضرین نے آج ان کا رنگ بالکل بدلا ہوا پایا۔ آواز کی شفافیت اور جادو بیت حد کو تجاوز کر گئی۔ اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔ ان کی آواز کی سحر انگیزی نے ہر سامع کو مسحور کر دیا۔ ہر کسی پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور سب اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو گئے اور اس وقت گویا نیند سے جاگے جب روشن دان کے راستے پانی کی بوچھار کمرے میں آنے لگی۔ اب کیا تھا خان صاحب کا چہرہ وفورِ مسرت سے کھل اٹھا اور حاضرین کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔ خان صاحب کو اس وقت جتنی خوشی ہوئی ہوگی۔ اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ کی صورت میں اس کا اظہار ممکن نہیں۔ کیونکہ آج انھوں نے اپنے فن کی معراج پالی تھی۔ اس واقعہ کے لگ بھگ بیس برس بعد 1954 میں دوسری بار کملا رٹریٹ کانپور میں آپ کو میگھ ملہار گانے کا اتفاق ہوا۔ اس سنگیت سبھا میں ملک کے نامور فن کار شریک تھے۔ خان صاحب چونکہ سینئر تھے۔ آپ کا نمبر سب کے بعد آیا۔ کچھ نے اس خیال سے کہ موصوف کو شرمندہ کیا جا سکے۔ میگھ ملہار گانے کو کہا کہ

دوالا ہیں سے گے اور بارش نہیں ہوگی تو نتیجہ ان کی تباہی ہوگی۔

چونکہ خان صاحب کے ایک بار رامپور میں میگھ ملہار گانے سے بارش کے ہوجانے سے وہ اس مرتبہ بھی مایوس نہیں تھے۔ تاہم یہاں عزت و وقار کا سوال تھا اور ان کے فن کی پرکھ کا معاملہ تھا۔ اس فرمائش پر وہ سوچ کے اتھاہ ساگر میں ڈوب گئے اور چند گھڑی خاموش التجا جات کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لیے دل ہی دل میں گڑگڑا اٹھے اور پھر اللہ کا نام لے کر الاپ شروع کی۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ تارے جھلملا رہے تھے۔ لیکن ادھر آپ گاتے رہے اور اُدھر خدا جانے کہاں سے بادل کے ٹکڑے آسمان کو گھیرتے رہے اور جب آپ نقطۂ عروج پر پہنچے تو یکا یک زور کی بارش ہونے لگی۔ ہال میں جھومتے ہوئے لوگوں کو بارش کا علم اس وقت ہوا۔ جب گارڈن میں بیٹھا ہوا مالی اور چوکیدار بارش سے بچنے کے لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کے علاوہ چند بار اور بھی آپ نے میگھ ملہار کا مظاہرہ کیا۔ جس میں ہر مرتبہ اسی قسم کی صورتیں پیدا ہوئیں اور وہ ہر بار کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

نواب صاحب کے روبرو میگھ راگ کا مظاہرہ کرکے خان صاحب نے رامپور کے درباری گویوں میں ہی اولیت حاصل نہیں کی۔ ان کے دل میں بھی اپنی قدر و قیمت بڑھالی۔ لیکن اب بھی آپ اپنی طرف سے مطمئن نہیں تھے۔ لہٰذا دو برس تک بین کار سے (جو محمد شاہ رنگیلے کے دربار کے ماہر فن نعمت خاں سدارنگ کی اولاد میں سے تھے) اور جو نواب حامد علی خاں کے استاد تھے۔ دُھرپد وغیرہ کی تعلیم لیتے رہے۔

1925 میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والی میوزک کانفرنس میں آپ نے پہلی بار شرکت کی۔ اس کانفرنس میں جملہ ریاستوں سے چیدہ چیدہ فنکار آئے اور اودھ کے تمام رؤسا شرکت پذیر تھے۔ جملہ فنکاروں نے اپنا فن پیش کیا۔ مگر کامیابی کا سہرا صرف خان صاحب کے سر رہا۔ اور آپ کو ایک گولڈ میڈل اور توصیف نامہ پیش کیا گیا۔ 1926 میں لکھنؤ کی دوسری کانفرنس میں شمولیت کی جس میں آپ کے گائن کو بہت سراہا گیا اور انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ کچھ دنوں بعد وہ پٹنہ بلائے گئے جہاں سے سنگیت بھوشن کا خطاب حاصل کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی کی ایک سبھا جس میں طلبا کے علاوہ کئی سو افراد شریک تھے۔ آپ کو فخرِ موسیقی کا خطاب پیش کیا گیا۔ اسی اثنا میں کلکتہ کی ایک کانفرنس میں حصہ لے کر شیرِ موسیقی کا خطاب پایا۔ انجمن اربابِ ذوق حیدرآباد نے آپ کو شیشی فن کے اعزاز سے نوازا۔ 1953 میں سال کے بہترین سنگیت کار تسلیم کیے گئے۔ چنانچہ شری راجندر پرساد (صدر جمہوریہ) نے ایک ہزار روپے ایک کشمیری دو شالہ، ایک طلائی تمغہ اور ایک سند عطا کی۔ 1957 میں دوسری بار صدر محترم نے خان صاحب کو ملک کا بہترین موسیقار چن کر راشٹرپتی بھون میں پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا۔ جو اس وقت تک کسی میوزیشین کو نہیں دیا گیا تھا۔ اس طرح خان صاحب یہ اعزاز پانے والے ملک کے پہلے سنگیت کار تھے۔

ویسے بھارتیہ سنگیت کے صدیوں پرانے اتہاس پر نظر ڈالی جائے تو خاں صاحب ایسے دوسرے یا تیسرے فنکار ہیں۔ جس نے اپنی ریاضت، محنت، لگن اور سُر سادھنا سے وہ کمال کر دکھایا جو بظاہر ممکن معلوم نہیں ہوتا۔ تم تاریخ کے پنّوں میں اپنا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے درج کرالیا۔ اور سہسوان رامپور گھرانے کو گوالیار گھرانے کے برابر لا کھڑا کیا اور خود گویا تان سین کے قریب جا پہنچے۔ گوالیار گھرانا جو میاں تان سین کی وجہ سے غیر معمولی شہرت کا حامل رہا ہے۔ دیگر تمام گھرانوں پر سبقت بھی رکھتا ہے۔ تان سین جو اکبری دربار کے مخصوص گویے تھے اور جن کے دیپک راگ گانے سے دیپ جل اٹھتے تھے۔ دوسرا بیجو باورا تھا کہ جس کے بارے میں سنا گیا ہے کہ وہ جب دریا کے کنارے راگ چھیڑتا تھا تو اس کا پانی اچھلنے لگتا تھا (واللہ اعلم) اور پھر خان صاحب جنھوں نے نواب کے روبرو اور کلارڈسٹ کانپور میں جہاں نامور موسیقاروں اور اہل ذوق حضرات کی موجودگی نیز اس کے بعد بھی کئی موقعوں پر اپنی میگھ ملہار گائیکی سے مینہ برسا دیا تھا۔

آپ نے سب سے پہلے دلی ریڈیو اسٹیشن سے اپنا سنگیت پیش کیا۔ اس کے بعد ملک بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے آپ کا پروگرام وقتاً فوقتاً نشر ہوتا رہا۔ آپ کے ریکارڈ ملک بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے پیش کیے جاتے رہے۔ اور دلی ریڈیو اسٹیشن سے ہر ماہ اپنے فنی کمالات کے اظہار کا موقع ملتا رہا اور مقبولیت دن بدن بڑھتی چلی گئی۔

ریڈیو پر ایک فنکار کو زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے کا وقت دیا جاسکتا ہے۔ ملک میں ایسے فنکار جنھیں اتنا طویل پروگرام پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہو۔ کم ہی ہوتے ہیں۔ خان صاحب کو ان گنے چنے فنکاروں میں اولیت حاصل رہی۔ آپ ملک کے چھوٹے بڑے مقامات پر اپنے فن کا جادو جگا کر داد تحسین حاصل کرتے رہے۔ رامپور سے ملازمت چھوڑنے کے بعد آپ کو وہاں سے پنشن ملتی رہی اور نواب صاحب آپ کو اکثر یاد فرماتے رہے۔ اس فن سے موصوف کی وابستگی کا زمانہ پون صدی پر محیط ہے۔ آپ دس سال کی عمر سے اس فن سے جڑ گئے تھے اور آپ نے پچاسی سال کی عمر پائی۔ خان صاحب کے متعلق فن ہونے کے سبب بھارتی کلا کیندر نئی دلی نے تین برس تک آپ کی خدمات حاصل کیں۔ جہاں ملک بھر کے لوگ آپ سے تعلیم لیتے رہے۔ موصوف کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔ جن کا تعلق زیادہ تر حیدرآباد، رامپور، سہسوان، دلی، کلکتہ اور کاٹھیور سے ہے۔

چند معروف شاگردوں کے نام، اشتیاق حسین خاں (ریڈیو سنگر)، اسحاق حسین خاں (نواب رامپور کے مخصوص گویے)، اشفاق حسین خاں (ریڈیو سنگر)، مجید و نیازی (میوزک پروڈیوسر لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن)، غلام حسین خان (ریڈیو سنگر)، جعفر حسین خاں (مشہور قوال)، افضل حسین نظامی (ریڈیو سنگر)، غلام تقی خاں، غلام صادق خاں (ریڈیو سنگر)، نینال دیوی، مہارانی کپور تھلہ، ملو گھرانے، سخاوت حسین خاں، مقبول حسین خاں وغیرہ۔

سازوں کے بارے میں خان صاحب کا کہنا تھا کہ ہر ساز کی آواز انسان کو مسحور کرسکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ کسی مشاق

کے ہاتھ میں ہو۔ بربط (سرنگی) کو آپ نے سب سے مشکل ساز مانا ہے۔ اس گھرانے میں ہارمونیم وادک، سارنگی نواز اور طبلہ وادک ہوتے ہی تھیں آج بھی ہیں۔ قانون نامی ساز جس کے بارے میں کم ہی لوگ جانتے ہوں گے بلکہ اب یہ شاید کہیں نہیں بجایا جاتا۔ قدرت اللہ خاں اسے بجانے میں ماہر تھے۔ اپنی اسی مہارت کے سبب وہ تاحیات مہاراجہ بڑودہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ بربط نواز استاد رحمت حسین خاں اپنے فن کے ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے۔ ممبئی میں منعقد ایک ہارمونیم وادکی مقابلے میں حصہ لے کر انوار حسین خاں نے سرمئی ایوارڈ حاصل کیا۔ اپنی ہارمونیم وادکی ہی کی بدولت انھوں نے فلم انڈسٹری تک رسائی حاصل کی اور 'انور عثمان' کی سنگیت کار جوڑی بنا کر بارہ تیرہ فلموں میں سنگیت دیا جس میں فلم 'ہزار ہاتھ والا' کا سنگیت بہت ہٹ ہوا۔ غلام سراج خاں اور غلام عزیز خاں (ڈگی) وغیرہ طبلہ وادکی اور گائیکی کے لیے ملک ہی میں نہیں بیرون ملک بھی اپنی پہچان بنائے ہوئے ہیں۔

خان صاحب کے بقول گائیکی میں بنیادی چیز سُر ہے جسے سنگیت کی اصطلاح میں ایشور کہا جاتا ہے۔ اگر کلاکار کا سُر سچا ہے تو وہ سننے والوں کے دلوں پر ضرور اثر کرے گا۔ لیکن اگر سُر سچا نہیں ہے تو گائک سامعین کو متاثر کرنے سے عاری رہے گا اور اس کے فن کو بے جان کہا جائے گا۔

موصوف کسی ایک راگ پر ہی قادر نہیں تھے۔ بلکہ آپ ہوری، دھرپد، سادرا، دھمال، خیال، ٹھمری کے علاوہ منڈول اور کلیان بھی گا لیتے تھے اور راگ میگھ ملہار گائیکی میں تو ید طولیٰ رکھتے تھے۔ معروف سنگیت کار نوشاد کے بقول استاد موصوف کو راگ بھیروں کی گائیکی میں بھی مہارت حاصل تھی۔

آپ کا کہنا تھا کہ یوں تو صحیح طور پر کسی ایک راگ کو بھی گانا آسان نہیں لیکن جتنا مشکل 'خیال' ہے اتنا کوئی دوسرا راگ نہیں ہے۔ جس نے خیال گا لیا وہ ہر راگ کو بخوبی گا سکتا ہے اور موسیقار کہلانے کا مستحق ہے — اسی مشکل راگ کو اپنے چہیتوں کی جنم بھومی پر مشتاق صاحب کے شاگرد استاد غلام صادق خاں نے 4 جنوری 2014 کی شام میں نئی عید گاہ سینٹر دہلی میں اپنے اڑتالیس سالہ بیٹے غلام عباس خاں اور اٹھارہ سالہ پوتے غلام حسن خاں کے ساتھ گا کر گویا ایک اتہاس رقم کر دیا۔ تین پیڑھیوں کا ایک ہی منچ پر کسی ایک راگ کی گائیکی میں اس طرح ساتھ گانے کا شاید یہ پہلا ہی اتفاق ہے۔

استاد موصوف نے انکشاف کیا کہ ملک میں ایسے موسیقار چند ہی بچے ہیں جو خیال گانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ موصوف کو اس راگ پر انتہائی قدرت حاصل تھی اور یہ راگ تو خان صاحب کے علاوہ کسی دوسرے فنکار کو ان کے دور میں گیا۔ اس کے بعد سے آج تک بھی گاتے نہیں سنا گیا۔ آپ کے خیال کے مطابق وہی شخص اچھا موسیقار بن سکتا ہے جسے استاد کامل کا فیض حاصل

خان صاحب کے بقول گائیکی میں بنیادی چیز سُر ہے جسے سنگیت کی اصطلاح میں ایشور کہا جاتا ہے۔ اگر کلاکار کا سُر سچا ہے تو وہ سننے والوں کے دلوں پر ضرور اثر کرے گا لیکن اگر سُر سچا نہیں ہے تو گائک سامعین کو متاثر کرنے سے عاری رہے گا اور اس کے فن کو بے جان کہا جائے گا

موصوف کسی ایک راگ پر ہی قادر نہیں تھے۔ بلکہ آپ ہوری، دھرپد، سادرا، دھمال، خیال، ٹھمری کے علاوہ منڈول اور کلیان بھی گا لیتے تھے اور راگ میگھ ملہار گائیکی میں تو ید طولیٰ رکھتے تھے۔ معروف سنگیت کار نوشاد کے بقول استاد موصوف کو راگ بھیروں کی گائیکی میں بھی مہارت حاصل تھی۔

ہو جس کی آواز میں سُر ہو۔ جو لے پر قدرت رکھتا ہو اور جسے راگوں سے پوری واقفیت حاصل ہو جس کا ریاض بھرپور ہو۔ موصوف نے جن جن فنکاروں سے اس فن لطیف کو حاصل کیا وہ سب کے سب اس فن کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ آپ آواز کے اتار چڑھاؤ پر جیسی قدرت رکھتے تھے ایسی بھی اور کسی میں نہیں پائی گئی۔ آواز کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ اتنی زیادہ دیر تک قائم رکھتے تھے کہ اس پر حیرت ہوتی تھی۔ خان صاحب کے گانے کی خوبی یہ تھی کہ سامع پر محویت طاری ہو جاتی تھی اور وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا تھا۔ اکثر موسیقاروں کی طرح آپ نے بھی کچھ راگ راگنیاں ایجاد کیں۔ جن میں راگ سُر ساگر قابل ذکر ہے۔ مگر آپ پرانے راگ راگنیوں ہی کے قائل تھے۔ جدید موسیقی کو آپ برسات میں اُگ آنے والے خودرو پودوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے جس طرح ان پودوں کی بہار چند روزہ ہوتی ہے بالکل اسی طرح جدید موسیقی (جسے عرف عام میں فلمی موسیقی کہا جاتا ہے) چار دن کی چاندنی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ ساتھ ہی کہا فلمی گیتوں میں جو گیت راگوں پر آدھارت ہوتے ہیں ان میں کچھ دم ضرور ہوتا ہے۔

یوں تو آپ کا تعلق سدا رنگ سے بھی پیدا ہو گیا تھا لیکن درحقیقت آپ تان سین ہی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ گائیکی کو سہسوان رام پور گھرانا جس کی تاریخ تقریباً ڈھائی سو سال پرانی ہے۔ آپ سے پہلے صرف رام پور گھرانا کہلاتا تھا۔ لفظ سہسوان آپ ہی کی ذات اور فن کی بدولت جڑ سکا۔ آپ اس گھرانے کے نمائندہ فنکار مانے جاتے ہیں۔

دنیائے موسیقی کے اس نامور فنکار نے 1964 میں پچاسی برس کی عمر میں موت کو لبیک کہا اور اپنی کبھی نہ بھلائے جانے والی یادیں چھوڑ گیا۔ خان صاحب کا انتقال دہلی میں ہوا مگر ان کی وصیت کے مطابق آبائی وطن سہسوان میں سرکاری اعزاز کے ساتھ انھیں کے تعمیر کردہ امام باڑہ کے صحن میں دفن کیا گیا۔ جہاں ہر سال برسی کے موقع پر قوالیوں کا پروگرام ہوتا رہا ہے۔ 2013 میں پہلی بار ان کے بیٹے غلام تقی خاں، غلام رسول خاں، غلام عزیز خاں، غلام سراج خاں اور فیروز نیازی وغیرہ نے انھیں کے ایجاد کردہ راگ سُر ساگر کے تحت محفل سرود کا اہتمام کیا جس کا سلسلہ جاری ہے۔

سہسوان رام پور گھرانے کے موسیقاروں میں استاد مشتاق حسین خاں کے علاوہ غلام صادق خاں، نثار حسین خاں، ہفتو گھرانے کو پدم بھوشن، حفیظ اللہ خاں، راشد حسین خاں کو پدم شری اور ممتاز فنکار غلام مصطفیٰ خاں کو پہلے پدم بھوشن و حال ہی میں 'پدم وبھوشن' سمان سے نوازا گیا ہے۔ چھیاسی سالہ خاں صاحب کے شاگردوں میں منا ڈے، آشا بھونسلے، گیتا دت، ہری ہرن، اسیت کمار اور سونو نگم شامل ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ شاستریہ سنگیت میں پتھر پگھلانے کی قوت ہے۔ مہدی حسن خاں، آسکر و گریمی ایوارڈ یافتہ سنگیت کار اے آر رحمان کا کسی نہ کسی طور اسی گھرانے سے تعلق ہے۔

■

Huzoor Sahaswani, Raz Manzil, Choudhry Mohalla, Sahaswan Budaun - 243638 (UP)

علی عباس

سنت کبیر اور دادو دیال کے کلام میں

انسان دوستی کا پیغام

انسان دوستی کے لیے بنیادی مقصد انسان ہوتا ہے۔ اس میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ انسان کا رشتہ کس ذات، مذہب، مسلک یا فرقے سے ہے۔ اس کے بنیادی تقاضوں میں سب سے پہلے انسان ہونے کی شرط ہے۔

تمام مذہب و مسلک اور ذات پات، اونچ نیچ کی سطح سے اگر بلند ہو کر ہم دیکھیں تو انسان دوستی ہی وہ آلہ ہے جو لوگوں کے دلوں سے نفرت و تعصب کو نکال کر محبت و اخوت کی شمع روشن کر سکتی ہے۔ انسان دوستی کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے اخلاقیات کا تصور پیدا ہو اور اس کے اثر سے جو سماج تشکیل پذیر ہو وہ تمام بنی نوع انسان کے لیے ایک خوبصورت اور معطر گلدستہ بن جائے۔ اخلاقیات کا تصور اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ یہی وہ واحد ذریعہ ہو سکتی ہے جو انسان کی لامتناہی خواہشات کے برعکس ایک کھلی اور آزادانہ الفت و محبت کی فضا میں سانس لینے کے قابل ہو سکتا ہے۔ انسان دوستی کی آفاقیت اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتی جب تک انسان اس زمین و آسمان کے درمیان موجود ان گنت حسین نظاروں سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہو۔ قدرت کے نظریے کی بھرپور قدر دانی ہی انسان دوستی کی بنیاد ہے۔

یقیناً جب سے دنیا میں انسانوں کا وجود ہوا ہے اس وقت سے ہی انسان دو کیفیتوں سے ابھر کر آ رہا ہے اور آج تک ہے۔ وہ دونوں کیفیتیں کبھی خود غرضی کی طرف، کبھی دوسروں کی بھلائی کی طرف، کبھی نیکی اور ثواب کی طرف تو کبھی بدی اور گناہ کی طرف لے جاتی ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جس پر یہ دونوں کیفیتیں اثر انداز نہ ہوئی ہوں۔ یہ دونوں ہی اپنی اپنی طرف انسانوں کو کھینچتی ہیں اور انسان اپنی اندرونی دنیا کی کش مکش سے مستقل جنگ آزما رہتا ہے۔ جو اس جنگ میں بدی کو نہ دبا سکا وہ اس دنیا کا سب سے بڑا شکست خوردہ انسان ہے اور جس نے اپنے اندر کی بدی کو شکست دے دی وہ انسانیت کی تاریخ کا سب سے بڑا فاتح بن جاتا ہے۔ یہ جیت اس لیے سب سے بڑی فتح کہی جاتی ہے کہ اس میں محض اس کی جیت نہیں بلکہ ساری انسانی دنیا کی بھلائی اور اس کی بہبود کی فتح ہے۔ اس اندرونی کش مکش کی فتح و شکست کا معیار اس انسان کے اپنے ذاتی شعور اور عقل پر منحصر ہوتا ہے۔ جو جس درجے تک حق و باطل کو دیکھتا جاتا ہے اسی اعتبار سے اس کی بصیرت میں وسعت اور اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر اس کے اندر سے اپنا پرایا، ذات پات، مذہب و مسلک اور اونچ نیچ سب کچھ نکل کر صرف ایک اپنے پن کا احساس ہوتا ہے اور وہی اپنا پن انسان دوستی ہے۔

سارے مذاہب کا بنیادی نظریہ بھی یہی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں:

"اللہ کہتا ہے کہ جب بھی میرے بندے تم سے میری بابت پوچھیں تو کہہ دو کہ میں حقیقتاً ان کے بہت ہی پاس ہوں، جب کبھی کوئی بندہ مجھے پکارتا ہے تو میں اس کا جواب دیتا ہوں، اس لیے لوگوں کو اللہ پر یقین کرنا چاہیے اور اللہ کا ہی حکم ماننا چاہیے، تاکہ وہ ٹھیک ٹھیک راستہ جان سکیں۔"[1]

"جس کسی نے اپنے آپ کو اللہ کی مرضی پر چھوڑ دیا اور جو دوسروں کے ساتھ نیکی کرتا ہے، اسے اپنے رب سے پھل ملے گا۔ اسے نہ کسی بات کا ڈر ہے اور نہ کسی طرح کا غم ہوگا۔"[2]

"سچ سچ تمہارے یہ سب الگ الگ مذہب یا قومیں ایک ہی مذہب اور ایک ہی قوم (امت واحدہ) ہیں اور تمہارا، سب کا ایک ہی رب ہے اس لیے اسی ایک اللہ کی عبادت کرو لیکن لوگوں نے آپس میں اپنے دین کے الگ الگ ٹکڑے کر ڈالے اور ہر گروہ جو کچھ کہ اس کے اپنے پاس ہے اسی میں پھولا ہے۔ یہ بڑی نا سمجھی ہے۔"[3]

سری کرشن جی نے گیتا میں کہا ہے کہ:

"جو جس راستے سے چل کر ایشور تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے ایشور انہیں اسی راستے سے ملتے ہیں لوگ الگ الگ طرف سے چل کر بھی اسی ایک ایشور تک پہنچتے ہیں۔ جس طرح ایک گول چکر کے چاروں طرف کھڑے ہوئے آدمی الگ الگ طرف کو چل کر بھی ایک ہی کیندر تک پہنچتے ہیں۔"[4]

"ایسے ہی قرآن کا 'رب' رگ وید کا ساری دنیا کا پالنے والا 'رئی' ہے... ایسے ہی 'لا الہ الا اللہ' پارسی میں 'نیست ایزد مگر یزداں' موجود ہے۔"[5]

سام وید کے کین اپنشد میں لکھا ہے:

"جس نے یہ سمجھا کہ ایشور جانا جا سکتا ہے وہ اسے نہیں جانتا، جو یہ جانتا ہے کہ ایشور نہیں جانا جا سکتا وہی جانتا ہے۔ اسے جاننے کا دعویٰ کرنے والے اصل میں اسے نہیں جانتے اسے وہی جانتے ہیں جو جاننے کا دعویٰ نہیں کرتے۔"[6]

جہاں تک رسولوں، پیغمبروں اور اوتاروں کا ذکر ہے اس کے بارے میں بھی مختلف مذاہب کی کتابوں میں ایک جیسا ہی خیال ملتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے۔"7

"اور جو رسول بھیجا گیا ہے وہ اسی قوم کی زبان میں پیغام دے کر بھیجا گیا ہے تا کہ انھیں صاف صاف سمجھا سکے۔"8

خدا کی نورانیت کے حوالے قرآن میں کہا گیا ہے کہ:

"اللہ زمین اور آسمانوں کا نور ہے۔"

گیتا میں خدا کے نور ہونے کی بابت کہا گیا ہے کہ:

"اگر آسمان میں ایک ہزار سورجوں کی روشنی ایک ساتھ چمک اٹھے تب بھی وہ اس ایشور کی جوت کے شاید ہی برابر ہو سکے۔"9

مولانا روم نے اپنے صوفیانہ انداز میں بھی اسی خیال کی ترجمانی کی ہے:

ترجمہ "نبی رحمت نے کہا ہے کہ اللہ کہتا ہے کہ میں اوپر یا نیچے زمین میں یا آسمان یا عرش پر کہیں نہیں سما سکتا۔ پر میں مومن کے دل میں رہتا ہوں جو مجھے ڈھونڈھنا چاہے اسے چاہیے کہ وہیں تلاش کرے۔"10

ذکر کیا جا چکا ہے کہ اسلام اور دیگر مذاہب عالم کے بنیادی نظریات اور ان کی اخلاقی تعلیمات کس حد تک ایک دوسرے سے گہرا رشتہ اور کتنی یکسانیت رکھتے ہیں۔ پھر بھی آج لوگ مذہب و مسلک کے نام پر ٹکڑوں میں کیوں بٹے ہیں؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ دنیا کا پیدا کرنے والا اور اس کا چلانے والا ایک ہی ہے اور اس کے سوا کوئی اور طاقت نہیں ہے۔ تو اس کی یہ مخلوق اسی پیدا کرنے والے کے نام پر تفرقوں کے بڑے بڑے طوفان کیوں کھڑے کر رہی ہے؟ شاید جو لوگ اپنے آپ کو ایک خدا کا ماننے والا بتاتے ہیں وہ سچ مچ اس پر پوری طرح ایمان نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے کوتاہ علم اور کم فہم لوگوں کو صحیح تعلیم اور روحانی روشنی دینے کے لیے صوفی، سنت، فقیر اور دوسرے روحانی پیشوا آتے رہے۔ ان لوگوں کا دل انسانوں کی اس حالت کو دیکھ کر کراہ اٹھتا ہے اور پھر یہ لوگ اپنے اپنے اعتبار سے ایک خدا اور انسان دوستی کا پیغام دیتے ہیں۔ انھیں روحانی ہستیوں اور انسانیت کے پیغامبروں میں سے ہمارے ملک ہندوستان کی سرزمین پر پیدا ہونے والے سنت کبیر داس اور سنت دادو دیال کے فرمودات اور کلمات کی روشنی میں ہم دیکھیں گے کہ وہ کس انداز سے انسان دوستی اور آپسی ہم آہنگی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ہمیں ان کی باتوں سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ خدا پر سچا یقین اور مذہبی تعلیمات کے ذریعے کس طرح آدمی کو انسان اور سماج کو سکھ شانتی کا مندر بنایا جا سکتا ہے۔

یہاں کبیر داس کے دوہوں کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ نہ صرف ہندو اور مسلمان کی ایکتا کی بات کرتے ہیں بلکہ آدمی کو انسان کیسے بنایا جائے اس کا پیغام بھی ان کے کلام میں ملتا ہے۔ بنیادی طور پر ہمارے ملک ہندوستان میں ہندو اور مسلم یکجہتی کو مثال بنا کر پیش کیا جاتا اور اسی کی ضرورت بھی ہے۔ اس مقالے میں ان عقائد اور دیگر رسومات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو ایک دوسرے کو خدا اور انسان سے قریب کرنے کا وسیلہ ہیں۔ سب سے پہلے کبیر کا وہ کلام پیش کیا جا رہا ہے جس میں انھوں نے خدا کی یکتائی کو پیش کرتے ہوئے بین المذاہب یکجہتی کی تعلیم دی ہے۔

کبیر کہتے ہیں:

بھائی رے دوئی جگدیش کہاں تے آیا، کہو کونے بھرمایا
اللہ، رام، کریما، کیشو، ہری، حضرت نام دھرایا
گہنا ایک کنک تے، گہنا ان منہ بھاو نہ دوجا
کہن سنن کو دو کر تھاپن، اک نماج اک پوجا
وہی مہادیو، وہی محمدؐ، برہما آدم کہیے
کو ہندو، کو ترک کہاوے ایک جمین پر رہیے
وید، کتیب پڑھیں وے کتبہ، وے مُلا وے پانڈے
بگر بگر نام دھرائے اک مٹیا کے بھانڈے
کہہ ہیں کبیر وے دونوں بھولے رام ہیں کنہوں نہ پایا
وے کھسّی وے گائے کٹاویں باد ہیں جنم گنوایا

"اے بھائی! اس دنیا کے دو مالک، دو خدا کیسے ہو سکتے ہیں، کہو تمھیں کس نے بہکا دیا؟

اللہ، رام، کریم اور کیشو، ہری اور حضرت سب صرف الگ الگ نام رکھ لیے گئے ہیں۔

جیسے ایک سونے سے طرح طرح کے گہنے بنا لیے جائیں، یہ دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، کہنے سننے کے لیے ایک نماز کہتا ہے دوسرا اسی کو پوجا کہتا ہے۔

جو مہادیو ہے وہی محمدؐ ہے جو برہما ہے وہی آدم ہے۔

کون ہندو ہے اور کون مسلمان؟ دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں۔

کوئی وید پڑھتا ہے کوئی خطبہ پڑھتا ہے، کوئی مولانا کہلاتا ہے اور کوئی پنڈت۔

نام الگ الگ ہیں اصل میں سب ایک ہی مٹی کے برتن ہیں۔

کبیر کہتا ہے اس جھوٹے بھید بھاؤ میں پڑ کر یہ دونوں اصلی راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں، ان میں سے کسی کو ایشور نہیں ملا۔

ایک بکرا کاٹتا ہے دوسرا گائے، اسی بحث میں ان دونوں نے اپنی زندگی برباد کر دی۔"

مذہب اور فرقے کی سطح سے بلند ہو کر سوچنے کی دعوت بھی ہمیں کبیر داس کے کلام میں جگہ جگہ ملتی ہے اور وہ یہ پیغام پہنچانا چاہتے ہیں کہ کس طرح ہم سب ایک ہیں اور ہمارا خالق و مالک بھی یکتا و واحد ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ایسو بھرم بگر جگ بھاری،
وید کتیب دین او دوجک کو پرش کو ناری
ماٹی کے گھٹ ساز بنایا نادے بوند سماتا
گھٹ بن سے کا نام دھروگے اہمق کھوج بھلاتا
ایکے تچا ہاڑ مل موترا، اک رُدھر اک گودا
اک بوند سو سسٹی کیو ہے کو برہمن کو سودرا
رج گن برہما تم گن شنکر ست گنا ہر سوئی
کہہ ہیں کبیر رام رم رہیے، ہندو ترک نہ کوئی

"ساری دنیا ایک بہت بڑے دھوکے میں پڑی ہوئی ہے۔ جو اسے برباد کر رہا ہے۔

کوئی وید کی دہائی دیتا ہے کوئی قرآن کی، کوئی دین کی بات کرتا ہے کوئی دوزخ کی، روح کے لیے مرد اور عورت دونوں کی حیثیت ایک ہے اس میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔

سب کے بدن مٹی کے بنے ہوئے ہیں، سب میں ایک ہی سی جان ہے۔ اس جسم کے مٹ جانے کے بعد اوپری شکلوں کا فرق بھی ختم ہو جائے گا۔

نا سمجھ آدمی اصل راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں، آدمی آدمی سب برابر ہیں۔ سب کے ایک ہی سی کھال، ایک سی ہڈیاں، ایک سا بول و براز، ایک سا خون اور گوشت۔

ایک بوند سے سب پیدا ہوئے ہیں نہ کوئی برہمن نہ کوئی شودر۔

برہما، وشنو اور مہیش تینوں (رجو گن یعنی حرکت، ستو گن یعنی سکون، تمو گن یعنی تساہلی) آتما کی مختلف حالتوں کے نام ہیں۔

کبیر کہتا ہے سب کو ایک ہی خدا اور ایشور سے لو لگانی چاہیے۔ نہ کوئی ہندو ہے نہ کوئی مسلمان۔ یہ سب فرق جھوٹے ہیں۔"

ہندو کہیں موہے رام پیارا ترک کہیں رحمانا
آپس وو لڑ لڑ موئے مرم کاہ نہیں جانا

ہندو کہتا ہے ہمارے پیارے کا نام رام ہے مسلمان کہتا ہے رحمان۔

دونوں آپس میں لڑ لڑ کر مرے جاتے ہیں۔ جب کہ اس کی اصلیت سے دونوں ناواقف ہیں۔

انسان کو دوسروں کے عیوب تلاشنے کی بجائے اپنے دامن میں جھانکنے کا ہنر سکھانے والے کبیر داس کچھ اس طرح کہتے ہیں:

برا جو دیکھن میں چلا
برا نہ ملیا کوئے
جو دل کھوجا اپنا، مجھ سے
برا نہ ملیا کوئے

کبیر داس نے انسانیت کے لیے ناسور بنے ہوئے ان تمام زخموں کی نہ صرف اپنے کلام میں نشاندہی کی ہے بلکہ انھیں مندمل کرنے کی پوری کوشش بھی کی ہے۔ ہم چاہے کچھ بھی کہیں مگر ہمارے ذہن کے نہاں خانے میں کہیں نہ کہیں تعصب اور ذات برادری کا ناسور موجود رہتا ہے۔ اسی چھوا چھوت اور اونچ نیچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سنت کبیر داس نے کہا:

پگ پگ پیغمبر گاڑے
سو سب مرے بھو مائی
نہ دنیا کے بھانڈے پانڈے
پوچھ بیٹھ تم پانی
مجھ کچھ گھریار بیائے
دوھر نیر جل بھر یا
ندیا نیر نرک بہی آوے
پشو مانس سب سریا
ہاڑ جھر جھر گود گری گری
دودھ کہاں تے آیا
سو لے پانڈے! جیوں بیٹھے
منیا ہی چھوت لگایا
وید، کتیب چھانڈ دو پانڈے
ای سب من کے بھرما
کہہ کبیر سنہ او پانڈے
ای سب تیھرے کرما

''اس زمین میں قدم قدم پر پیغمبر دفن ہیں، وہ سب اسی مٹی میں مل گئے۔

اے پانڈے اسی مٹی کے بنے ہوئے ایک برتن تم بھی ہو، پھر بھی تم دوسرے آدمی کی ذات پوچھ کر اس کے ہاتھ سے پانی پیتے ہو؟

جس ندی کا تم پانی پیتے ہو اس کے اندر ان گنت مگرمچھ اور گھڑیال انڈے بچے دیتے ہیں۔ ان سب کا خون اور پانی اسی میں ملا رہتا ہے۔

دنیا بھر کا نرک بہہ بہہ کر اسی میں آتا ہے۔ آدمی اور جانور سب اسی میں سڑتے ہیں۔

جس دودھ کو لے کر تم کھانے کے لیے بیٹھتے ہو وہ کہاں سے آتا ہے؟ ہڈیاں جھڑ جھڑ کر اور گوشت گل گل کر انھیں سے دودھ بنتا ہے۔

اور تم مٹی کو چھوت لگاتے ہو؟ اے پانڈے، وید اور شاستروں کے حوالے دنیا چھوڑ دو۔ یہ سب تمھارے من کی گھڑنت ہے۔ کبیر کہتا ہے اے پانڈے! یہ سب تمھاری کرتوت ہے۔''

آگے کہتے ہیں:

پنڈت بھولے پڑھ گنی ویدا
آپ اپن پوں جانے نہ بھیدا
گائتری جگ چار پڑھائی
پوچھو جائے مکتی کن پائی
اور کے چھیئے (چھوتے) لیت ہو سینچا
تم تے کہو کون ہے نیچا
جاسو نام ہے گرب پر ہاری
سو کس گرب ہیں سکے سہاری
کل مر جاوا کھوئے کے
کھو جتی پچ نر بان
اگر بیج نسائے کے
جمے بدیگی تھان

''اے پنڈت تم وید پڑھا پڑھا کر بھی بھول گئے، تم نے اپنے آپ کو نہ پہچانا۔

گائتری بھی پڑھتے ہو، یہی کرتے کراتے تمھیں جگ بیت گئے، پر ان سب کے کرنے سے تمھیں نجات نہ مل سکی۔

کیونکہ دوسرے انسان کے چھو جانے سے تم اپنے اوپر پاک ہونے کے لیے پانی ڈالتے ہو۔ بتاؤ تم سے زیادہ نیچ کون ہو سکتا ہے جو آدمی کے چھونے سے پرہیز کرے۔

اس ایشور کا نام 'گرب پرہاری' (گھمنڈ کو چور چور کرنے والا) ہے وہ تمھارے اس جھوٹے گھمنڈ کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟

نجات اسی کو مل سکتی ہے جو ذات پات، خاندان اور اونچ نیچ کے سارے گھمنڈوں کو اپنے اندر سے اسی طرح مٹادے۔

جس طرح بیج اپنے آپ کو مٹی میں ملا کر ختم کر دیتا ہے، تب کہیں جا کر اس میں سے مکتی کا انکھوا پھوٹتا ہے۔''

مذہبی ٹھیکے داروں کے دوہرے کرداروں کو بھی کبیر نے خوب نشانہ بنایا ہے۔ ان کی نظر میں سچا مذہبی پیروکار وہی ہے جو اپنے علاوہ دوسروں کی تکلیفوں کو بھی اپنی تکلیف سمجھے اور سب کے کام آئے۔ جو مذہب کے نام پر دوسروں کو مارنے یا تکلیف پہنچانے کی بات نہ کرے۔ وہ کہتے ہیں:

کاجی سو جو کاج ہلاوے
نہیں اکاج سے راجی
جو اکاج کی بات چلاوے
سو کاجی نہیں پاجی
کبیر سوئی پیر ہے
سو جانئی پر پیر
جو پر پیر نہ جانیئے
سو کافر بے پیر

''اصلی قاضی وہ ہے جو دوسروں کے کام سنوارے، اور جو برے کام سے راضی نہ ہو۔

جو کوئی برا کام کرنے کو کہے اسے قاضی نہیں پاجی کہنا چاہیے۔

اے کبیر! سچا پیر وہی ہے جو دوسروں کی پیڑا (تکلیف) کو سمجھے۔

جو دوسروں کی تکلیف کو تکلیف نہ سمجھے وہ پیر نہیں کافر اور بے پیر ہے۔''

یہاں پر مختلف جہتوں سے کبیر کے کلام میں ہم نے دیکھا کہ وہ قومی یکجہتی اور انسان دوستی کا پیغام کس کس انداز سے دیتے ہیں اور انھوں نے نہ صرف خدا کی وحدانیت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ انسانی تخلیق میں بھی یکسانیت کو تلاش کر کے ہندو مسلمان، ذات پات اور مرد و عورت کے درمیان تخلیقی برابری کو پیش کر کے انسانی برادری میں پھیلی ہوئی نابرابری کو آئینہ دکھایا ہے۔

اسی طرح ہم کبیر کے شاگرد سنت دادو دیال جن کا زمانہ 1544 تا 1603 عیسوی ہے، ان کے بارے میں بھی ان کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ یہ بچپن میں سابرمتی ندی میں بہتے ہوئے پائے گئے تھے۔ ان کی حیات کا زیادہ تر حصہ راجستھان میں گزرا۔ جبکہ ابتدائی زندگی گجرات میں بسر ہوئی۔ ان کے کلام میں ہمیں کبیر کا پورا عکس نظر آتا ہے اور یہ بھی انھیں کی طرح مذہب و مسلک کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر انسانیت نوازی کا پیغام دیتے ہیں:

ہندو ترک بھید کچھ ناہیں
دیکھوں درسن تورا
سوئی پران پنڈ پن سوئی
سوئی لوہی ماسا
سوئی سندھ بندھ پن سوئی
سوئی سکھ سوئی پیرا

سوئی ہست پاؤں بین سوئی
سوئی ایک سریا
یہو سب کھیل کھالک ہے تیرا
تے ہیں ایک کر لینا
دادو جگت جان کر ایسا
تب یہو پہچان پیتا

"ہندو اور مسلمان میں مجھے کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔
اے خدا ایشور میں سب کے اندر تیرا ہی جلوہ دیکھتا ہوں۔
سب کا ایک سے جسم ایک سا خون ایک سا گوشت۔
سب کے ایک سی ہڈی اور جوڑ ہیں۔ سب کو ایک ہی طرح راحت و تکلیف بھی ہوتی ہے۔
سب کے ایک ہی سے ہاتھ پاؤں، ایک ہی سا چلنا ہے۔
یہ سب کھیل اسی خالق کا ہے، وہی خالق ہے وہی ہریا ہے۔
اسی نے میرے اور سب کے اندر مجھے اپنی یکتائی کا جلوہ دکھایا ہے۔ اس طرح دیکھ کر دادو کی آتما کو یقین کامل ہوا کہ وہی ایک سب کا خالق ہے۔"

اسی طرح سارے مذاہب کے جوہر کو انھوں نے اپنے دوہے ذیل دوہے میں اس انداز سے پیش کیا ہے:

آپا میٹے ہر بھجے، تن من تجے بکار
نربیری سب جیو سوں، دادو یہو مت سار
نربیری سب جیو سوں سنتن جن سوئی
دادو ایکے آتما، بیری نہیں کوئی
ہم سب دیکھیا سودھ کر دو جا ناہیں آن
سب گھٹ ایکے آتما، کیا ہندو مسلمان

"اپنی خودی یعنی اہنکار کو مٹانا، ایک خدا، ایشور کی عبادت کرنا، اپنے تن کو برے کاموں سے اور من کو برے خیالوں سے پاک رکھنا۔
اور کسی جاندار کا برا نہ چاہنا اے دادو یہی مذہب کا نچوڑ ہے۔
وہی انسان سنت اور خدا رسیدہ ہے جو کسی جاندار سے بھی دشمنی نہ کرے۔
اے دادو سب کے اندر ایک ہی روح اور آتما ہے، کوئی ہمارا دشمن نہیں ہے۔
ہم نے سب اچھی طرح تلاش کر کے دیکھ لیا ہے، کوئی غیر نہیں ہے۔ کیا ہندو اور کیا مسلمان سب کے اندر ایک ہی آتما کام کر رہی ہے۔"

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں لوگ مسجد اور مندر کے نام پر ایک دوسرے کا لہو بہانے پر تلے ہوئے ہیں۔ مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ اللہ مسجد میں عبادت کرنے کو قبول کرتا ہے اور ہندو یہ جانتا ہے کہ مندر ہی ایشور کا گھر ہے۔ لیکن واقعتاً ان دونوں میں کوئی فرق ہے؟ اس کا جواب ہمیں دادو دیال اپنے اس دوہے میں یوں دے رہے ہیں:

ہندو لاگے دیہرے مسلماں مسیت
ہم لاگیں اک الکھ سوں سدا نرنتر پریت
نا تہاں ہندو دیہرا نا تہاں ترک مسیت
دو آپ آپ ہے نہیں تہاں دہ ریت
یہو مسیت یہو دیہرا، ست گرو دیا دکھائے
بھیتر سیوا بندگی، باہر کاہے جائے
دونوں ہاتھی ہوئے رہے، مل رس پیا نہ جائے
دادو آپا میٹ کر دونوں رہے سمائے

"ہندو مندر سے چپٹا ہوا ہے اور مسلمان مسجد سے، ہم اسی ایک اللہ سے لو لگائے ہوئے ہیں جو بے نشان ہے۔
نہ وہاں مندر کی ضرورت ہے نہ مسجد کی۔ وہاں وہ آپ ہی آپ موجود ہے۔ اس کی پوجا کے لیے کسی خاص رسم اور رسم کی ضرورت نہیں ہے۔
سچے گرو نے ہمیں دکھا دیا ہے کہ آدمی کا یہ جسم ہی مسجد ہے اور یہی مندر ہے۔ انسان اپنے اندر ہی خدا کی سیوا اور بندگی کر سکتا ہے۔ اسے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔
ہندو اور مسلمان دونوں دو پاگل ہاتھیوں کی طرح ہو رہے ہیں۔ اسی لیے دونوں مل کر پانی نہیں پی سکتے ہیں۔ جبکہ اپنی خودی کو مٹا کر دونوں آنند کے ساتھ ایک جگہ سما سکتے ہیں۔"

سنت دادو دیال جی نے کس انداز میں انسانی اقدار کو خاطر میں لاتے ہوئے اور اس کی معنویت پر زور دیتے ہوئے یہ دوہا کہا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

دادو باندھے وید بدھ، بھرم کرم ارجھائی
مرجادا انگلیں رہے، سمرن کیا نہ جائی
اس کل کے تے ہوئے گئے ہندو مسلمان
دادو ساچی بندگی، جھوٹا سب ابھمان
پوتھی اپنا پنڈ کری، ہر جس ماہیں لیکھ
پنڈت اپنا پران کر، دادو کتھ ہوا لیکھ
کاذی کتیب بولے الکھ، ساکھو رحمن
حجیا ملا بولتے، سرجا ہے سبحان

"اے دادو لوگوں کو وید اور شاستروں کی رسم و رواجوں نے جکڑ رکھا ہے، اسی سے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، اسی لیے اس مالک کا سچا سمرن (دل سے یاد) نہیں کر پاتے۔
اس کلجگ میں کتنے ہی ہندو اور مسلمان ہوئے، لیکن، اے دادو اس ایشور کی بندگی ہی سچی ہے باقی سارا گھمنڈ جھوٹا ہے۔
اپنے جسم کو کتاب کی صورت بنانا چاہیے۔ جس کتاب کے اندر ایشور کا نام لکھا ہوا موجود ہے۔ اپنی جان ہی کو پنڈت ماننا چاہیے۔ اور اسی پنڈت سے الکھ (اللہ) اور ایشور کا نام اس دل کی کتاب میں پڑھنا چاہیے۔
اسی کتاب میں رحمن لکھ کر اپنے من کو ملا بنا کر اس سبحان کے سامنے دعا مانگنی چاہیے۔"

ظاہری بات ہے کہ مختلف مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے انسان اس کائنات میں موجود ہیں اور ہر ایک کا اپنا ایک خاص نقطۂ نظر اور مذہبی عقیدہ بھی ہے۔ تو کیا ہم سب مل کر ایک ایسا ماحول نہیں بنا سکتے جس کی بنیاد ہر مذہب میں ایک جیسی ہے جسے ہم بشر نوازی یا انسان دوستی کہہ سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک ایسا معاشرہ تخلیق کیا جائے جس میں تیری میری، اس فرقے کی یا اس فرقے کی نہیں بلکہ جس میں انسانیت کی روح پھونکی ہوئی ہو، جس کے رہن سہن اور رسم و رواج میں ہر آدمی برابر کی حصہ داری لے سکے، جس کے قاعدے اور قانون دھارے مذہبوں کی تنگیوں اور فرقوں کی جکڑبندیوں سے آزاد ہوں، جس کی عمارت آپس کی محبت اور ایک دوسرے کی مدد سے گہری اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہو۔ یہی مذہب وہ مذہب ہے جو انسانیت، محبت اور ایکتا کا مذہب، عشق، پریم اور سچائی کا دین ہے جسے دنیا کے تمام رسولوں، نبیوں، اوتاروں اور صوفی سنتوں نے پہنچایا بھی ہے اور سکھایا بھی ہے۔

حواشی:

1. سورہ نمبر 2 آیت 186
2. سورہ نمبر 2، آیت 12-111
3. سورہ نمبر 23، آیت 51 تا 54
4. گیتا اور قرآن: سندر لال، ص 9 ہندوستانی کلچر سوسائٹی، الٰہ آباد، 1980
5. ایضاً، ص 8
6. ایضاً، ص 20
7. سورہ یونس، آیت 47
8. سورہ ابراہیم، آیت 4
9. گیتا اور قرآن: سندر لال، ص 19 ہندوستانی کلچر سوسائٹی، الٰہ آباد، 1980
10. مثنوی مولانا روم، ترجمہ قاضی سجاد حسین

■

Dr. Ali Abbas Dept of Urdu, Punjab University, Chandigarh (Punjab)

موسمی اثرات اور طب یونانی

■ طیبہ عائشہ فاطمہ

انسان جس ماحول میں زندگی گزارتا ہے اس میں ہر وقت مختلف تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جس کا اثر اس کے جسم اور اس کے اندر موجود بنیادی مادوں پر پڑتا ہے خواہ اس کا سبب موسم ہو یا کچھ اور جس کی وجہ سے یہ وقتاً فوقتاً مرضی کیفیت میں مبتلا ہو سکتا ہے، ان موسم کی اگر پیشگی تدابیر کی جائیں تو ایک مشکل مرحلے کو آسانی سے طے کر سکتے ہیں کیونکہ ہر موسم ہر شخص کے لیے موضوع ومناسب نہیں ہو سکتا، ہر موسم کی اپنی ایک کیفیت ہوتی ہے جو اس کے مثل کیفیت رکھنے والے شخص کو نقصان پہنچا سکتی ہے، جیسے صفراوی شخص کے لیے موسم صیف (گرما) میں زیادہ تکلیف کا احساس ہوتا ہے جس کے لیے خصوصی تدابیر ضروری ہیں اسی طرح بلغمی، دموی۔ یعنی نوع انسان کی تخلیق کے مطابق ہر شخص کے لیے ہر موسم موضوع و مناسب ہو ضروری نہیں کسی شخص کو کوئی موسم بہت بہتر لگتا ہے تو کوئی موسم تکلیف کا باعث بن جاتا ہے جس کے لیے مخصوص و ضروری احتیاطی تدابیر ضروری ہیں۔

فلسفۂ طب میں امراض کے ازالے سے پہلے حفظ ماتقدم پر دھیان دیا جاتا ہے جیسا کہ طب کے مقصد میں اولاً صحت کی حفاظت کا ذکر ہے۔ اصول علاج میں بھی کوشش کی جاتی ہے کہ مادۂ مرض کا اجتماع نہ ہو اور اگر ہو جائے تو جلد از جلد اس کا املاء یا تنقیہ ہو جائے۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو علاج بالتدبیر کافی اہم رول انجام دیتا ہے، جس کی مدد سے ہم طب کے مقصد کو آسانی سے پاسکتے ہیں۔ علاج بالتدبیر جو کئی طریقوں پر مشتمل ہے، جس میں پرہیز، تدبیر (طریقہ)، دوائیں ان تمام بنیادی اصولوں کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ علاج بالتدبیر میں کئی طریقوں کا ذکر ہے جس کی مادۂ مرض کے لحاظ سے اپنی افادیت ہے اور ہر طریقہ اپنی ایک اہمیت رکھتا ہے۔ علاج بالتدبیر کے کئی طریقوں میں صرف ایک ہی طریقہ بہت اہم اور ہر مرض کی افادیت رکھتا ہے ایسا نہیں ہے جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے۔ اسی طرح اطباء کرام نے باعتبار فصول علاج بالتدبیر کے طریقوں کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ ایک ہی طریقہ ہر موسم میں موضوع ومناسب نہیں ہے، کئی اطباء کرام نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے جو مختلف تصانیف سے ماخوذ ہے۔ تدابیر باعتبار موسم پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ فصول اور اس کی وجہ سے ہونے والے تغیرات واس کے اسباب پر روشنی ڈالی جائے۔

فصل کے لغوی معنی جدا کرنے کے ہیں اور موسم بھی ایک زمانے کو دوسرے زمانے سے ممتاز اور جدا کرتا ہے جو زمین کی حرکت پر منحصر ہے۔ کرۂ ارض گیند کے مانند گول ہوتا ہے جو اپنے محور کے گرد مغرب سے مشرق کی جانب چوبیس گھنٹوں میں ایک مکمل گردش کرتا ہے، جس کو یومیہ گردش کہا جاتا ہے۔ اس گردش کی بنا پر رات دن تبدیل ہوتے ہیں، دوران گردش زمین کا جو حصہ آفتاب کے سامنے ہوتا ہے وہاں دن اور جو حصہ دوران گردش آفتاب کے پیچھے ہوتا ہے وہاں رات ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح کرۂ ارض آفتاب کے گرد تقریباً 365 دنوں میں ایک دفعہ گردش کرتا ہے جس کو سالانہ گردش کہتے ہیں، یہ گردش پوری طرح گول نہیں بلکہ بیضوی ہوتی ہے جس کے سبب چار موسم (موسم ربیع (بہار)، صیف (گرما)، خریف (خزاں) اور شتا (سرما) پیدا ہوتے ہیں اور دن و رات کے اوقات میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

ہندوستان خط استوا سے شمال میں منطقہ حارہ شمالی و کچھ حصہ منطقہ معتدلہ شمالی میں واقع ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کا موسم گرم ہونا چاہیے لیکن ہندوستان میں گھنے جنگلات، ندی، پہاڑ اور اطراف میں سمندر ہونے کی وجہ سے اس کا موسم غیر یقینی ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہاں پر بھی چار موسم پائے تو جاتے ہیں لیکن یہ تمام کی معیاد مختلف ہوتی ہیں اور معمولی اسباب سے موسم غیر متوقع ہو سکتا ہے۔

مزید یہ کہ دنیا کے مختلف ممالک و شہروں میں ایک ہی موسم میں موسمی کیفیات علیحدہ علیحدہ ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً موسم صیف کی کیفیت ہندوستان کے میدانی علاقوں میں زیادہ گرم ہوتی ہے جبکہ پہاڑی علاقے میں زیادہ گرمی نہیں ہوتی ہے اور ساحلی علاقے میں موسم معتدل رہتا ہے۔ کرۂ ارض پر مختلف خطوں میں موسمی کیفیات کے اختلاف کے اسباب حسب ذیل ہیں۔ (1) خط استوا سے فاصلہ: جو علاقے خط استوا سے قریب ہوتے ہیں گرم ہوتے ہیں اور جو علاقے خط استوا سے دور ہوتے ہیں وہ سرد ہوتے ہیں۔ کیونکہ خط استوا پر سورج کی شعاعیں عموداً پڑتی ہیں۔ (2) سطح سمندر سے بلندی و پستی: جو علاقے سمندر سے جتنے زیادہ بلند ہوتے ہیں اسی قدر سرد

ہوا کرتے ہیں، اور جو علاقے سمندر سے ملحق میں ہوتے ہیں اسی قدر گرم ہوتے ہیں۔ (3) سمندر سے فاصلہ (4) پہاڑوں کا رخ (5) ہواؤں کا رخ (6) ساخت (7) جنگلات (8) بحری رو (9) مٹی کا اختلاف وغیرہ۔ ہر موسم اپنی کیفیت کی مناسبت سے بعض امراض کو پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسی طرح اپنی کیفیت کے مخالف امراض کو زائل کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے، کیونکہ ہر موسم اپنی کیفیت کے مناسب بدن میں کیفیات پیدا کرتا ہے اور یہ مناسب کیفیات اپنی مناسبت سے امراض کو پیدا کر دیتی ہیں اگر چہ قوت مدبرہ بدن کمزور ہو یا اس میں موسمی تغیرات کو برداشت کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر موسم بدن میں ایسا مادہ پیدا کر دیا کرتا ہے جس کی کیفیت مادۂ مرض پیدا کرنے کے لیے مناسب ہوتی ہے۔ لہٰذا طبیعت مادہ مرض کی تاب نہ لا کر مادہ مرض کو قبول کرتی ہے جس کی وجہ سے بدن میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو مرض کے مطابق و مناسب ہوتی ہے، اور امراض لاحق ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ ہر شخص کے جسم میں مختلف اخلاط کا غلبہ ہوتا ہے، مثلاً بلغمی اشخاص کو موسم سرما میں تکلیف اور دوسرے موسم میں آرام، صفراوی اشخاص کو گرما کے موسم میں شدید تکلیف اور دوسرے موسم میں آرام ملتا ہے۔

موسم ربیع (بہار):

یہ موسم سردیوں کے بعد اور گرمیوں سے پہلے آتا ہے فروری، مارچ اور اپریل اس کا زمانہ ہے، اس کا مزاج معتدل ہوتا ہے۔ یہ موسم دراصل تمام موسموں سے زیادہ اچھا ہے اور زندگی و صحت کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس موسم میں فاعلہ کیفیات حرارت و برودت اور منفعلہ کیفیات رطوبت و یبوست معتدل رہتی ہے جو حرارت غریزیہ (جسم کی طبعی حرارت) کے لیے معتدل ہیں۔ اس موسم کا مزاج جسم کے تمام اعضا کے ساتھ ساتھ اخلاط اور روح کے لیے بھی مناسب ہوتا ہے جو خون کی طبعی درجہ حرارت سے مطابقت رکھتا ہے، جس کی وجہ سے اخلاط کی پیدائش زیادہ مقدار میں ہوتی ہے۔ اس موسم میں خون اعتدال کے ساتھ جلد کی طرف جذب ہوتا ہے اور جلد کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ اس موسم میں بہتر طور پر جسم کا تغذیہ ہوتا ہے، یہ موسم نشو و نما کے لیے عمدہ ہوتا ہے اور اعضا کا نشو و نما بھی بہتر ہوتا ہے۔ موسم ربیع بذات خود بہت اچھا موسم ہے۔ یہ موسم خوشگوار ہوتا ہے اس میں زیادہ گرمی ہوتی ہے اور نہ زیادہ سردی اس موسم میں درخت پھولتے پھلتے ہیں اور ان میں بہار آجاتی ہے۔ یہ موسم اگر اپنے مزاج پر قائم رہے تو بہترین اور افضل ہے۔ اس موسم میں اخلاط حرکت میں آجاتے ہیں جو سرما کے موسم میں ہوا کی سردی سے منجمد ہوتے ہیں اور کمزور اعضا کی طرف بہہ نکلتے ہیں۔

یہ موسم بالذات موجب امراض نہیں ہے بلکہ دوسرے امور کی وجہ سے اس موسم میں امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ یہ موسم امراض کے مناسب کوئی کیفیت بدن میں پیدا نہیں کرتا بلکہ ربیع میں جو امراض پیدا ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ موسم ربیع اپنی لطیف حرارت سے مواد میں سیلان و حرکت پیدا کرتا ہے اور قوتوں کو قوی کر کے ان کو دفع مواد کے لیے ابھار دیتا ہے، تاکہ جو مواد اپنے اپنے ٹھکانوں میں موجود ہیں وہ نکل جائیں۔ چنانچہ جب قوت اس مقصد کے لیے بیدار ہو جاتی ہے اور وہ پورے طور پر دفع کرنے پر قادر نہیں ہوتی تو وہ موجود مواد کو کمزور اعضا (کنج ران، بغل اور جلد) کی طرف مائل کر دیتی ہے اور اگر قوت اس سے بھی عاجز ہوتی ہے تو مواد سارے بدن میں بکھر کر پھیلے جاتے اور اپنی کیفیت کے مناسب امراض پیدا کر دیتے ہیں۔ ہندوستان میں بعض امراض جیسے خراجات، پھوڑے، اورام حلق، چیچک وخسرہ وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ اس موسم میں وہ سارے مادی امراض حرکت میں آجاتے ہیں جن کا مادہ موسم سرما میں ساکن ہوتا ہے۔ اس موسم کے آخر میں آنے والے موسم کی احتیاطی تدابیر کرنی چاہیے جو کہ گرم موسم ہے۔

تدابیر: فصد، قے

اس موسم کے اوائل میں فصد مفید ہے کیونکہ اس موسم کے شروع میں مادہ مقدار میں کم اور کثیف رہتا ہے جیسے جیسے گرمی بڑھتی ہے مادے کی مقدار میں اضافہ اور مادے کی کثافت میں کمی ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے جلدی امراض پیدا ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ اس موسم میں قے بھی مفید ہے کیونکہ موسم سرما میں معدے کے اطراف بلغم جمع ہو جاتا ہے مزید یہ کہ موسم سرما میں غذائیں کثیف استعمال کی جاتی ہیں اور دماغ سے سرد اور فاسد مادے بکثرت معدہ پر انصباب ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان بلغمی مواد کو قے کے ذریعے خارج نہ کیا گیا تو موسم بہار کی حرارت کے اثر سے معدہ اور اعضا و رئیسہ کو نقصان لاحق ہو سکتا ہے نیز ان مواد کو بذریعہ قے معدہ سے خارج ہونا آسان اور ممکن ہے۔

غذائیں: (1) حرارت بجھانے والی (مطفیات) اور مواد کو ساکن کرنے والی (مسکنات) چیزیں استعمال کرنی چاہیے یعنی مواد کی حرکت اور اس کے جوش کو کم کرنے والی چیزیں استعمال کرنی چاہئیں تاکہ یہ چیزیں موسم کے مزاج کا مقابلہ کر سکیں۔ گرمی پیدا کرنے والی تمام اشیا سے بچنا چاہیے، تاکہ مواد حرکت پیدا کر کے زیادہ گرم نہ ہو جائیں۔ مثلاً قوی ریاضت، حمام اور تیز شراب سے پرہیز کرنا چاہیے۔ لطیف و ہلکی غذائیں اس موسم میں زیادہ مفید ہے کیونکہ تحلیل کے سبب اخلاط کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے لیکن اس صورت میں یہ دھیان رکھا جائے کہ جسم میں رطب مادے کی مقدار توازن میں رہے ایسا ہو سکتا ہے کہ رطوبت کی مقدار زیادہ ہونے کی وجہ سے عروق میں تناؤ پیدا ہو جائے اور وہ شق ہو جائے۔ اس موسم میں ٹھنڈے و رقیق مشروبات استعمال کرنا چاہیے یا ایسے مشروبات جو اعضا میں زیادہ دیر تک نہ ٹھہرے اس لیے کہ اس سے بدن میں گرمی بھی کم پیدا ہو اور اس کی حرارت کا اثر بھی کم ہو اس سے تحلیل ہو جاتی ہے۔ بارد رطب مشروبات اضافی حرارت کو کم کرتے ہیں اور صفرا کی حدت کا ادرار بھی کرتے ہیں، جس کی وجہ سے گرمی اور خشکی بھی باقی نہیں رہتی اور تحلیل بھی آسانی سے ہو جاتی ہے۔ اس موسم میں پوشاک نرم و نازک استعمال کرنا

چاہیے جس کی وجہ سے بدن میں زیادہ گرمی پیدا نہ ہو۔ ہوا دار ہو، آسانی سے ہوا کا گزر ہو، جس کی وجہ سے گرمی کا اجتماع و اس کی پیدائش ممکن نہ ہو۔

موسم صیف (گرما):

مئی، جون اور جولائی گرمی کا موسم ہے جس میں گرمی شدت کی پڑتی ہے، لو چلتی ہے، اس کا مزاج حار یابس ہوتا ہے۔ اس موسم میں دن بڑے اور راتیں چھوٹی ہوجاتی ہیں، جس کی وجہ سے جسم کی حرارت بڑھتی چلی جاتی ہے، جس سے حرارت میں اضافہ ہوتا ہے اور حرارت کی زیادتی کے باعث جسم کے رطوبات تحلیل ہوتے ہیں۔ تحلیل کے باعث قوتیں اور افعال کمزور ہوجاتے ہیں۔ اس سے خون اور بلغم کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔ اس موسم کا مزاج صفرا کے موافق ہوتا ہے جس کی وجہ سے صفرا کی مقدار و جوش میں اضافہ ہوتا ہے اور صفراوی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ موسم گرما کی طبیعت چونکہ صفرا کی طبیعت کی طرح گرم و خشک ہوتی ہے اس لیے موسم گرما طبعاً صفرا پیدا کرتا ہے۔ مزید یہ کہ اس موسم میں جو غذائیں استعمال کی جاتی ہیں وہ لطیف اور صفرا میں تبدیل ہوجانے کے لیے تیار ہوا کرتی ہیں۔ الغرض اس وقت دونوں باتیں اکٹھی ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے صفرا کا مادہ بھی حاصل ہوجاتا ہے اور صفرا کا فاعل بھی۔ اس کے علاوہ اس موسم میں حار کیفیت کی زیادتی سے صفرا میں حرکت و ہیجان پیدا کر دیتا ہے جس سے اس میں ابال کی سی صورت لاحق ہو جاتی ہے۔ مواد فاسدہ میں کمی واقع ہوتی ہے اور امراض کا وقفہ کم ہو جاتا ہے اور امراض کا فیصلہ جلد ہو جاتا ہے۔ رطوبات تحلیل ہونے کی وجہ سے مقدار میں کمی واقع ہوتی ہے جس کی وجہ سے ضعف و نقاہت ہوسکتا ہے۔ ہوا کا جوہر بھی تبدیل ہوجاتا ہے انسان اس ماحول میں رہتا ہے اور ماحول کا اثر اس کے جسم کے اخلاط اور مزاج پر پڑتا ہے اور خشکی بڑھ جاتی ہے۔ اس موسم میں حمی محرقہ، (ضرب الشمس) جنجب (تھاری بخار)، تپ محرقہ صفراویہ، پیاس، کرب و بے چینی، دور سر، خفقان اور سرسام وغیرہ جیسے امراض زیادہ ہوا کرتے ہیں۔ اس موسم کے آخر میں آنے والے موسم کی احتیاطی تدابیر کرنی چاہیے جو کہ خزاں کا موسم ہے۔

تدابیر: گرمیوں کے موسم میں آرام و راحت اختیار کرنا چاہیے تاکہ زیادہ حرکت اور محنت و مشقت سے جسم کے رطوبات تحلیل نہ ہوں، اور سایہ میں رہنا اختیار کرنا چاہیے تاکہ دھوپ کی گرمی اور مزید نقصان نہ پہنچائے۔ گرمی ریاضت نقصان کا سبب بنتی ہے۔

غذائیں: لطیف و قلیل المقدار سرد غذائیں استعمال کرنا چاہیے کیونکہ اس موسم میں قوت ہاضمہ کمزور ہوتی ہے۔ صفرا کو کم کرنے والی غذائیں اور تدابیر استعمال کرنا چاہیے کیونکہ اس موسم میں صفراوی کا غلبہ ہوا کرتا ہے۔ ایسی تمام تدابیر ترک کر دینا چاہیے جس سے گرمی و خشکی پیدا ہو۔ اس موسم میں رطوبات بدن اگرچہ زیادہ تحلیل ہوتی ہیں مگر تغذیہ کی حاجت کم ہوتی ہے۔ کیونکہ جوش و غلیان کی وجہ سے اخلاط کا حجم بڑھ جاتا ہے اور ان کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس موسم میں ترمیوہ استعمال کرنا چاہیے مثلاً انار، آلو بخارا، تربوز اور کھیرا تاکہ حرارت میں کمی اور سکون ہو۔ سرد کیفیت رکھنے والے لباس ملبوس کرنا چاہیے۔ اس موسم میں ٹھنڈے مشروبات استعمال کرنا چاہیے تاکہ جسم میں حرارت کا غلبہ کم ہو اعضا کو غذا کی کمی کی صورت میں بھی رطوبت ملتی رہے۔

موسم خریف (خزاں):

یہ موسم گرمی کے بعد اور سردی سے پہلے آتا ہے۔ اگست، ستمبر اور اکتوبر کے زمانے میں بعض ممالک میں پتے گر جاتے ہیں اس لیے اس موسم کو موسم خزاں کہتے ہیں۔ اس کا مزاج معتدل کے قریب اور بعض کے نزدیک حار رطب ہوتا ہے۔ گرمی و رطوبت کے سبب نباتات گلنے سڑنے لگتی ہیں کیونکہ اس موسم میں ہوا میں اعتدال نہیں ہوتا۔ کبھی گرمی ہوتی ہے تو کبھی بارش اور ہوا سے سردی ہو جاتی ہے۔ نباتات ردیہ کے سبب ہوا اور پانی کثیف ہوجاتے ہیں۔ اس لیے اس موسم میں پھوڑے پھنسیوں کی کثرت ہوتی ہے، نیز اسہال و پیچش اور بالخصوص ہیضہ اور ملیریا بخار یا موسمی بخار وغیرہ جیسے امراض کی کثرت ہوتی ہیں۔ لیکن بہ لحاظ رطوبت و یبوست معتدل نہیں ہوتا ہے بلکہ مائل بہ یبوست ہوتا ہے۔ موسم خریف موسم صیف کے بعد آتا ہے جو ہوا میں خشکی کر دیتا ہے۔ نیز ہوا کو اعتدال پر لانے یا رطوبت پیدا کرنے کے لیے کوئی سبب موجود نہیں ہوتا ہے۔ یہ موسم بدترین موسم ہوتا ہے اس موسم میں بیماریاں بکثرت ہوتی ہیں۔ اس موسم میں معمولی حرارت خشکی کو اور بڑھا دیتی ہے جس کی وجہ سے رطوبات بدن زیادہ مقدار میں تحلیل ہو جاتی ہیں اور اخلاط کا قوام اور غلیظ ہو جاتا ہے۔ موسم خریف حرارت و برودت کے لحاظ سے بھی معتدل نہیں ہوتا۔ اس موسم میں دن کی گرمی اور رات کی سردی سے جسمانی افعال کا نظام بگڑ جاتا ہے کیونکہ بدن ایک کیفیت سے مناسبت پیدا نہیں کر پاتا کہ اس کی ضد کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے موسم (موسم صیف) میں قوتیں کمزور ہو چکے تھے اور پھر اس پر خریف کے متضاد کیفیات امراض کو پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ پھل اس موسم میں بکثرت پیدا ہوتے ہیں جو زیادتی رطوبت کے باعث اخلاط کو فاسد کر دیتے ہیں۔ لطیف اخلاط اس موسم میں بہت جلد احتراق پا کر جل جاتے ہیں اور کثیف اخلاط موجب مرض بنتے ہیں۔ کیونکہ اس موسم میں ہوا بدلتی رہتی ہے رات کو اور صبح کے وقت اگر سردی ہوتی ہے تو دوپہر کے وقت گرمی ہوتی ہے طبیعت ایک قسم کی پریشانی میں مبتلا رہتی ہے۔ اس موسم کی برودت فضلات کی تحلیل میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے کیونکہ برودت کا کام تجمید پیدا کرنا اور اس موسم کی حرارت حار غریزی کو اندرون بدن میں بند ہو کر اکٹھا بھی نہیں ہونے دیتی جس سے ہضم اور قوت تغذیہ قوی ہو سکے اور اندرونی فضلات تحلیل ہو سکیں کیونکہ موسم کی یہ گرمی حرارت غریزیہ کو باہر کی طرف خارج کرتی ہے۔ الغرض طبیعت مشتشدد ہو جاتی ہے یکسوئی کے ساتھ بدن کا کوئی کام انجام نہیں دے سکتی نہ مواد کو تحلیل کر سکتی ہے اور نہ انھیں پکا سکتی ہے۔

علاوہ ازیں بدن پر متضاد حالات و کیفیات کا یہ

درپے وارد ہوتا بدن کو بگاڑ دیتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب موسم گرما نے بدن کو ضعیف کر دیا ہو۔ موسم خریف میں سودا زیادہ اور خون کم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس موسم کا مزاج خون کے مزاج کے متضاد ہوتا ہے۔ اس موسم میں خون کے لطیف اجزا حرارت سے تحلیل ہو جاتے اور باقی اجزا جل کر خاکستر بن جاتے ہیں۔ پھر خریف کے موسم میں یہ باقی کثیف اجزا بدن میں رک کر بادہ ہو جاتے اور طبیعت خریف کے تقاضا کے مطابق سودا بن جاتے ہیں۔ اس موسم میں رات کی اور صبح کی سردی مواد کو اندر کی طرف حرکت دیتی ہے اور دوپہر کی گرمی اسے باہر کی طرف لوٹا دیتی ہے روزمرہ کی یہی گردش سے مواد کی کثافت اور حدت بڑھتی چلی جاتی ہے اور ہوا کی کثافت اس میں معین و مددگار ثابت ہوتی ہے اور اسے سودا میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اس موسم میں قوتیں بھی کمزور ہوتی ہیں اور جب ان پر زیادہ کام کا بوجھ پڑتا ہے تو عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس موسم کے ہر وقت (صبح وشام) کے اثرات سے جسم کو محفوظ رکھنا چاہیے۔

تدابیر: اس موسم میں خشکی پیدا کرنے والے اسباب سے بچنا چاہیے کیونکہ یہ موسم تمام موسموں سے خشک ہے۔ جماع کی کثرت سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ جماع کے ذریعے منی خارج ہونے کی وجہ سے بدن میں خشکی پیدا ہوتی ہے۔ قوتیں تحلیل ہوتی ہیں اور بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ سرد پانی کے زیادہ استعمال سے بھی پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ یہ موجب نزلہ ہو سکتا ہے۔ اطبا کرام نے اس موسم میں قے سے روکا ہے کیونکہ قے سے عروق کے مواد میں جوش اور ہیجان پیدا ہو جاتا ہے لیکن مادہ غلیظ ہونے کی وجہ سے خارج ہونے سے قاصر رہتے ہیں۔ طبیعت ان کو خارج کرنے کی ممکن کوشش کرتی ہے لیکن یہ قابل اخراج نہیں ہونے کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہٹ تو جاتے ہیں لیکن دوسری جگہ اپنا مسکن بنا کر اس سے متعلق اعضا کو بھی متاثر کر دیتے ہیں۔

غذائیں: مرطوب میوے زیادہ نہ کھانے چاہئیں اس سے عفونت پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ ایسے میووں میں مائیت زیادہ ہوتی ہے۔ اس موسم میں گاہے گرم اور گاہے سرد ہوائیں چلتی ہیں اور قوت ہاضمہ خراب ہو جاتی ہے۔ اس موسم کے آخر میں آنے والے موسم کی احتیاطی تدابیر کرنی چاہیے کیونکہ سرد موسم ہے۔

موسم شتا (سرما):

نومبر، دسمبر اور جنوری کا یہ زمانہ جس کا مزاج بارد رطب ہوا کرتا ہے جس کی وجہ سے ہوا بھی کثیف ہو جاتی ہے۔ اس موسم میں بلغم اور بلغمی امراض زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ ہضم غذا کے لیے بہترین موسم ہے۔ اس موسم میں سردی حرارت غریزیہ کو جسم میں محبوس کر دیتی ہے جس کی وجہ سے جسم میں حرارت قوی ہو کر غذا کو ہضم کرنے میں مدد کرتی ہے۔ اس موسم میں عموماً مقوی اور گرم غذائیں زیادہ استعمال کی جاتی ہیں جس سے بدن کا تغذیہ زیادہ ہوتا ہے اور بدن میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اس موسم میں لوگ گرم کپڑے اور مقام کو زیادہ پسند کرتے ہیں جس کی وجہ سے جسم گرم رہتا ہے۔ یہ موسم تو طبع منفرد ہونے کی وجہ

سے جسم کا تغذیہ و استحالہ اچھا ہوتا ہے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ کثیر التغذیہ چیزیں خوب کھائی جائیں تاکہ حرارت میں اضافہ ہو۔ اس موسم میں نزلہ، زکام و کھانسی، نیمونیا اور وجع المفاصل وغیرہ امراض زیادہ ہوتے ہیں۔ زکام کی وجہ یہ ہے کہ اس موسم میں بیرونی برودت سے سر اور بدن کے مسامات تنگ ہو جاتے ہیں اور بارد مواد سے جو بارد اور غلیظ بخارات پیدا ہوتے ہیں وہ سر کی طرف صعود کر کے برودت کی وجہ سے رطوبت کی شکل میں تبدیل ہو جاتے اور سر میں جمع ہو کر برودت ہی کی وجہ سے نچڑ کر اور منعصر ہو کر ناک کی طرف دفع ہوتے ہیں۔ برودت اعضا کو ضعیف کر دیتی اور مواد مرض کے قبول کرنے کے لیے اعضا کو تیار کر دیتی ہے اور قوت مدبرہ بدن کو کمزور کر دیتی ہے جس کی وجہ سے امراض اور ان کے مادوں کو اثر کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ گویہ مادہ پہلے سے اعضا کی رگوں، خون کی نالیوں، ہوا کی نالیوں میں موجود ہوتا ہے مگر پھیپھڑے اور مختلف اعضا کمزور نہیں ہوتے اس لیے ان مواد کو کام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ جب یہ کمزور ہو جاتے ہیں تو سبب مرض ہو جاتے ہیں۔

تدابیر: موسم سرما کا استقبال گرم جوشی سے کرنا چاہیے جس کے لیے گرم ملبوسات و لحاف درکار ہے۔ جسم میں حرارت پیدا کرنے والے اسباب استعمال کرنا چاہیے۔ موسم سرما میں قے کرانا مضعف کا موجب ہے کیونکہ اس موسم میں مادے غلیظ اور منجمد ہوتے ہیں جو آسانی سے جسم سے خارج نہیں ہوتے ہیں۔ مادے غلیظ ہونے کی وجہ سے نیچے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور قے کے ذریعے سے جب ان کو خلاف سمت خارج کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو طبیعت مضمحل ہو جاتی ہے۔ الغرض مادے کی نافرمانی اور عدم اطاعت کی وجہ سے قے کرنے میں سخت قسم کی تکلیف دینے والی حرکات ہوتی ہیں اور بہت زور لگانا پڑتا ہے جس سے قوی تحلیل ہو جاتے ہیں اور بدن میں کمزوری لاحق ہوتی ہے۔ سخت قسم کی ریاضت اس موسم میں مفید ہیں، کیونکہ ایسی ریاضت سے بدن میں گرمی اخلاط میں لطافت اور ان میں بہاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے اس کثافت اور انجماد کا تدارک ہو جاتا ہے جو برودت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

غذائیں: اس موسم میں قوی اور غلیظ غذائیں مثلاً حلیم (ہریسہ) کا استعمال مفید ہے، کیونکہ اس موسم میں قوت ہاضمہ قوی ہوا کرتی ہے اور موسم کی برودت اخلاط میں انجماد اور کثافت پیدا کر دیتی ہے جس سے ان کا حجم کم ہو جاتا ہے جس سے وہ عروق کو پُر کرنے کے لیے کفایت نہیں کرتے اس لیے ایسی حالت میں زیادہ غذا کی ضرورت درکار ہے۔ گوشت کثرت سے استعمال کرنا چاہیے تاکہ خون زیادہ سے زیادہ مقدار میں پیدا ہو سکے۔ ملطفات و گرم غذا اس موسم میں بہتر ہے کیونکہ عموماً اس موسم میں غلیظ غذائیں استعمال کی جاتی ہیں اور موسم بھی سرد ہوتا ہے جس سے غلیظ خون پیدا ہوتا ہے چنانچہ ایسی حالت میں غذا کے ساتھ عروق و مجاری میں سدے پیدا ہو جاتے ہیں جس کے لیے ملطف غذاؤں کا استعمال مفید ہے تاکہ ان سدوں میں کمی واقع ہو۔ اس موسم کے آخر میں آنے والے موسم کی احتیاطی تدابیر کرنی چاہیے جو کہ بہار کا موسم ہے۔

■

Tabasha Aasiha Fatima, Lecturer Dept of Moalijat, Mohammedia Tibbia College, Mansoora, Malegaon, Distt. Nasik (MS)

ادبی کوئز

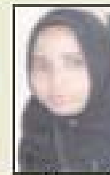

طلعت جمال

(1) پریم چند کا پہلا ناول کون سا ہے؟
(الف) چوگانِ ہستی (ب) اسرارِ معابد
(ج) نرملا (د) گئودان

(2) کس تحریک کے دوران اردو میں صنف ناول کا آغاز ہوا؟
(الف) رومانی تحریک (ب) حلقہ اربابِ ذوق
(ج) ترقی پسند تحریک (د) علی گڑھ تحریک

(3) 'وہ اردو ادب کے تاج میں کوہِ نور بن کر چمکے گا' علی عباس حسینی نے کس ناول کے متعلق کہا؟
(الف) گئودان (ب) امراؤ جان ادا
(ج) آگ کا دریا (د) خدا کی بستی

(4) 'فائر ایریا' کس کا ناول ہے؟
(الف) شوکت صدیقی (ب) عبداللہ حسین
(ج) الیاس احمد گدی (د) راجندر سنگھ بیدی

(5) ناول 'اور انسان مرگیا' کا مصنف کون ہے؟
(الف) خدیجہ مستور (ب) کرشن چندر
(ج) رامانند ساگر (د) حیات اللہ انصاری

(6) 'لہو کے پھول' ناول کے تخلیق کار کون ہیں؟
(الف) مرزا ہادی رسوا (ب) قرۃ العین حیدر
(ج) حیات اللہ انصاری (د) پریم چند

(7) ناول 'امراؤ جان ادا' میں فیض علی کا کردار کیا ہے؟
(الف) غلام (ب) عاشق
(ج) ڈاکو (د) نواب

(8) زمانی اعتبار سے صحیح ترتیب کی نشان دہی کیجیے:
(الف) گئودان، لندن کی ایک رات، فردوس بریں، میدان عمل
(ب) میدان عمل، فردوس بریں، لندن کی ایک رات، گئودان
(ج) لندن کی ایک رات، میدان عمل، فردوس بریں، گئودان
(د) فردوس بریں، میدان عمل، لندن کی ایک رات، گئودان

(9) یہ کس نے کہا کہ میر امن نے ناول کے لیے موزوں زبان کی بنیاد ڈالی؟
(الف) علی عباس حسینی (ب) یوسف سرمست
(ج) احسن فاروقی (د) شمس الرحمٰن فاروقی

(10) ناول 'آگ کا دریا' کب تخلیق کی گئی؟
(الف) 1949 (ب) 1959
(ج) 1962 (د) 1984

(11) 'دشمن' عصمت چغتائی کے کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) معصومہ (ب) سودائی
(ج) ضدی (د) ٹیڑھی لکیر

(12) رائے صاحب اور پروفیسر مہتا پریم چند کے کس ناول کے کردار ہیں؟
(الف) گئودان (ب) بازارِ حسن
(ج) نرملا (د) میدانِ عمل

(13) ان میں کون سا ناول خطوط کی تکنیک میں لکھا گیا ہے؟
(الف) فسانۂ مبتلا (ب) شاہد رعنا
(ج) لیلیٰ کے خطوط (د) امراؤ جان ادا

(14) اردو کے کس ناول نگار کو پہلا ناول نگار کہا جاتا ہے؟
(الف) عبدالحلیم شرر (ب) رجب علی بیگ
(ج) مرزا ہادی رسوا (د) ڈپٹی نذیر احمد

(15) اردو میں گیان پیٹھ انعام کس ناول نگار کو دیا گیا؟
(الف) جیلانی بانو (ب) صالحہ عابد حسین
(ج) قرۃ العین حیدر (د) خدیجہ مستور

(16) نذیر احمد کے کس ناول کو تمثیلی مجسموں کا ایک البم کہا جاتا ہے؟
(الف) توبۃ النصوح (ب) بنات النعش
(ج) مراۃ العروس (د) ابن الوقت

(17) اردو کے کس ناول نگار کو مصورِ غم کہا جاتا ہے؟
(الف) عبدالحلیم شرر (ب) نذیر احمد
(ج) راشد الخیری (د) کرشن چندر

(18) قاضی عبدالستار کے ناولوں میں ہیرو پرستی کے اسباب کیا ہیں؟
(الف) کردار کا وقار اور اہمیت
(ب) کرداروں سے ناول نگار کی دلچسپی
(ج) قدروں کی شکست و ریخت
(د) جاگیردارانہ سماج سے ناول نگار کا انسلاک

(19) 'آنگن' کا موضوعاتی انسلاک کیا ہے؟
(الف) تقسیم ہند اور ہجرت
(ب) تقسیم اور فسادات
(ج) عوام اور قتل و غارت گری
(د) سیاست اور فسادات

(20) خدا کی بستی کا موضوع کیا ہے؟
(الف) تقسیم ہند (ب) تقسیم اور فسادات
(ج) قتل و غارت گری
(د) نئی وجود میں آنے والی اخلاقیات

(21) قرۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا دریا' کے جواب میں اردو کا کون سا ناول لکھا گیا؟
(الف) اداس نسلیں (ب) خدا کی بستی
(ج) سنگم (د) آنگن

(22) ابن الوقت نذیر احمد کا ناول ہے، بتائیے صبح زندگی کس کی تصنیف ہے؟
(الف) عبدالحلیم شرر (ب) رجب علی بیگ سرور
(ج) پریم چند (د) راشد الخیری

(23) کس ناول میں صرف ایک رات کی کہانی پیش کی گئی ہے؟
(الف) گریز (ب) آخر شب کے ہمسفر
(ج) لندن کی ایک رات (د) ضدی

(24) پاکستان ایکسپریس کے مصنف کون ہیں؟
(الف) بلونت سنگھ (ب) خشونت سنگھ
(ج) جوگندر پال (د) کرشن چندر

(25) 'کتنے پاکستان' کس کی ہے؟
(الف) احسن فاروقی (ب) فکر تونسوی
(ج) کملیشور (د) نسیم حجازی

(26) اردو کا پہلا ناول کون ہے جس میں شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی گئی:
(الف) آگ کا دریا (ب) لندن کی ایک رات
(ج) خدا کی بستی (د) گریز

(27) پاکستان کے کس اردو ناول کو آدم جی انعام دیا گیا؟
(الف) اداس نسلیں (ب) علی پور کا ایلی
(ج) آبلہ پا (د) آنگن

(28) کس ناول نگار نے جنسی موضوعات پر نہیں لکھا ہے؟
(الف) سعادت حسن منٹو (ب) کرشن چندر
(ج) عصمت چغتائی (د) قرۃ العین حیدر

(29) 'افشائے راز' کس کا ناول ہے؟
(الف) عبدالحلیم شرر (ب) پریم چند
(ج) عصمت چغتائی (د) مرزا ہادی رسوا

(30) کس ناول میں لکھنؤ کے زوال پر جاگیردارانہ تمدن کا خوبصورت خاکہ پیش کیا ہے؟
(الف) گریز (ب) میرے بھی صنم خانے
(ج) اداس نسلیں (د) شام اودھ

(31) عبدالصمد کو کس ناول پر ساہتیہ اکادمی انعام ملا؟
(الف) لہو کے پھول (ب) تلاش بہاراں
(ج) پس دیوار (د) دو گز زمین

(32) 'خدا کی بستی' کس پاکستانی ناول نگار کی تخلیق ہے؟
(الف) انتظار حسین (ب) شوکت صدیقی
(ج) خدیجہ مستور (د) ممتاز مفتی

(33) 'راجہ گدھ' کس کا ناول ہے؟
(الف) خواجہ احمد عباس (ب) ممتاز مفتی
(ج) بانو قدسیہ (د) رضیہ فصیح احمد

(34) ناول 'فرات' کس کی تخلیق ہے؟
(الف) احمد یوسف (ب) شوکت حیات
(ج) حسین الحق (د) عبدالصمد

(35) ابن انشا نے کس ناول کو اردو کا گرنتھ صاحب کہا؟
(الف) علی پور کا ایلی (ب) دارا شکوہ
(ج) تلاش بہاراں (د) آبلہ پا

(36) کس ناول نگار کے لیے 'تیمور جنگ' کا لقب تجویز کیا گیا؟
(الف) راشد الخیری (ب) رجب علی بیگ سرور
(ج) ڈپٹی نذیر احمد (د) کرشن چندر

(37) 'مصورۃ الخیال' کے تخلیق کار کون ہیں؟
(الف) رمز عظیم آبادی (ب) شاد عظیم آبادی
(ج) اختر اورینوی (د) شکیلہ اختر

(38) ' ' وجودی کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) پردۂ غفلت (ب) امراؤ جان ادا
(ج) شریف زادہ (د) فردوس بریں

(39) 'غم دل وحشت دل' کس ممتاز شاعر کی زندگی پر لکھا گیا سوانحی ناول ہے؟
(الف) ساحر لدھیانوی (ب) مجاز لکھنوی
(ج) فیض احمد فیض (د) کرشن چندر

(40) 'نادار لوگ' کس کا ناول ہے؟
(الف) عبداللہ حسین (ب) شوکت صدیقی
(ج) انتظار حسین (د) انیس ناگی

(41) 'کاغذی ایپا' کی کہانی ہندوستان کے کس صوبے سے تعلق رکھتی ہے؟
(الف) اتر پردیش (ب) مدھیہ پردیش
(ج) ہماچل پردیش (د) جھارکھنڈ

(42) ان میں جمیلہ ہاشمی کے کون سے ناول ہیں؟
(الف) بستی (ب) امداد
(ج) روحی (د) باگھ

(43) پریم چند کا پہلا ناول 'اسرار معابد' ہے ان کا آخری ناول کون سا ہے؟
(الف) بازار حسن (ب) بیوہ
(ج) منگل سوتر (د) پردۂ مجاز

(44) ناول 'ایک چادر میلی سی' کتابی صورت میں کب آیا؟
(الف) 1960 (ب) 1962
(ج) 1986 (د) 1984

(45) کرشن چندر کا پہلا ناول کون سا ہے اور اس کی اشاعت کب ہوئی؟
(الف) غدار 1950 (ب) آسمان روشن ہے 1946
(ج) شکست 1943 (د) درد کی لہر 1963

(46) ناول 'ضدی' کا ہیرو کون ہے؟
(الف) کلّو (ب) مہاجن
(ج) پورن (د) مہیش

(47) ترقی پسند تحریک سے وابستہ کون سے ناول نگار ہیں؟
(الف) ممتاز مفتی (ب) غیاث احمد گدی
(ج) ابراہیم جلیس (د) سلیم احمد

(48) لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری کے خالق کون ہیں؟
(الف) سلیم احمد (ب) قاضی عبدالغفار
(ج) قاضی عبدالستار (د) خواجہ احمد عباس

(49) ان میں سے منٹو کے کون سے ناول ہیں؟
(الف) ہم خرما ہم ثواب (ب) گردش رنگ چمن
(ج) اداس نسلیں (د) بلا عنوان

(50) پریم چند نے اپنے کس ناول میں پہلی مرتبہ دیہاتی زندگی کے مسائل کی عکاسی کی ہے؟
(الف) ہم خرما ہم ثواب (ب) جلوۂ ایثار
(ج) گئودان (د) گوشۂ عافیت

(51) 'موہنی' کس کا ناول ہے؟
(الف) حیات اللہ انصاری (ب) جوگندر پال
(ج) عزیز احمد (د) قاضی عبدالستار

صحیح جوابات

1. ب	2. د	3. ب	4. ج	5. ج
6. ج	7. ج	8. د	9. ج	10. ب
11. د	12. الف	13. ج	14. د	15. ج
16. د	17. ج	18. ج	19. د	20. د
21. ج	22. د	23. ج	24. ب	25. ج
26. ----	27. ج	28. د	29. د	30. د
31. د	32. ب	33. ج	34. ج	35. الف
36. ج	37. ب	38. ج	39. ب	40. الف
41. د	42. ج	43. ج	44. ب	45. ج
46. ج	47. ج	48. ب	49. د	50. د
51. ج				

■

Talat Jamal, Karim Ganj, Road No 2, Gaya (Bihar)

تبصرہ و تعارف

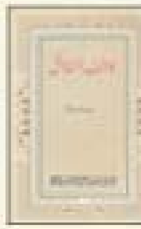

کاشف الحقائق (جلد اوّل و دوم)

مصنف: سید امداد امام اثر
صفحات: 348، 392 (جلد اوّل و دوم)
قیمت: 305 روپے دونوں جلدیں
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر سید اختیار جعفری،
مرزا غالب ریسرچ اکادمی، 18/147، محمود نگر، تاج گنج، آگرہ

"کاشف الحقائق" کا شمار اردو تنقید کے بنیادی متون میں ہوتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف مولوی سید امداد امام اثر کو اردو تنقید کا امام ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ اوّلاً یہ کتاب مولانا الطاف حسین حالی کی کتاب 'مقدمہ شعر و شاعری' کے بعد منظر عام پر آئی۔ اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس کا عکسی ایڈیشن 2015 میں شائع کیا ہے۔ یہ ایڈیشن 1982 کے پہلے ایڈیشن کا عکس ہے۔ کاشف الحقائق کی اوّلین اشاعت 1897 میں عمل میں آئی تھی۔ جبکہ مقدمہ شعر و شاعری اس سے محض 4 برس قبل 1893 میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔

اس کتاب میں سب سے پہلے مرتب کتاب ڈاکٹر وہاب اشرفی کا دیباچہ یا مقدمہ ہے۔ اس میں انھوں نے مولوی سید امداد امام اثر کے حالات اور علم و مطالعے کا جائزہ لیتے کے ساتھ ساتھ کتاب کے مباحث اور مصنف کے تنقیدی نظریات و تنقیدی عمل کا جائزہ بھی لیا ہے۔ کتاب کی جلد اوّل میں دنیا بھر کی ممتاز زبانوں عربی، لاطینی، انگریزی، فرنچ، یونانی، سنسکرت کے قابل ذکر شعر و ادب کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ خود مصنف نے بھی اس کا اظہار کیا ہے کہ اس میں مختلف اقوام جہاں کی شاعری کا ذکر ہے۔ نیز اخلاق، مذہب اور معاشرت سے بھی بحث کی گئی ہے۔ گویا جلد اوّل میں مصر و یونان و اٹلی و عرب کی شاعری زیر بحث آئی ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ امداد امام اثر صرف شعری یا ادبی نکات پر ہی تنقیدی نظر نہیں ڈالتے بلکہ وہ مصوری، ڈراما، سیر و شکار، موسیقی، سیاحت تک کو شاعری سے تعلق رکھنے والے لوازمات کا حصہ مانتے ہیں۔ شعر و ادب کا جائزہ لیتے ہوئے ان اثرات کو مدنظر رکھتے ہیں۔ اسی لحاظ سے وہ شاعری کی تعریف بھی دوسروں سے الگ کرتے ہیں۔ بقول ان کے:

"شاعری حسب خیال راقم رضائے الٰہی کی ایسی نقل صحیح ہے جو الفاظ بامعنی کے ذریعہ سے ظہور میں آئی ہے۔ رضائے الٰہی سے مراد فطرت اللہ ہے اور فطرت اللہ سے مراد وہ قوانین قدرت ہیں جنھوں نے حسب مرضی الٰہی کا نفاذ پایا ہے اور جن کے مطابق عالم درونی و بیرونی نشو و نما پائے گئے ہیں۔ پس جاننا چاہیے کہ اس عالم درونی و بیرونی کی نقل صحیح جو الفاظ بامعنی کے ذریعہ سے عمل میں آئی ہے، شاعری ہے۔"

اس جلد میں انھوں نے از روئے نکات مضامین شاعری کی تقسیم کرتے ہوئے رعایت لفظی، مبالغہ پردازی، صنائع و بدائع، پست خیالی، مکروہ مضامین اور بدمذاقی جدید پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ شاعری کو دیگر فنون لطیفہ سے الگ نہیں سمجھتے۔ اسی جلد میں معروف شاعر متنبی کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے یہ دل چسپ بحث بھی چھیڑی ہے کہ عرب کے شعرا عاشقانہ شاعری میں اپنے مخاطب کو ہمیشہ مؤنث قرار دیتے ہیں۔

شاعری پر تنقید کرتے ہوئے وہ خیال اور صورت دونوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ صرف لفظی بازی گری ان کے نزدیک شاعری نہیں۔ ان کے خیال میں شاعری امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ کا بیان ہے۔ "کاشف الحقائق" میں شاعروں کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے داخلی اور بیرونی ماہیت و کیفیت کو ضرور مدنظر رکھا ہے۔ وہ ڈراما کو بھی نہایت اعلیٰ قسم کی شاعری قرار دیتے ہیں۔

امداد امام اثر ایک قاموسی شخصیت تھے۔ وہ انگریزی اور یونانی زبانیں اسی طرح جانتے تھے جیسے عربی و فارسی۔ ان کے علاوہ وہ دنیا کی اہم زبانوں کے نثری و شعری ادب سے کما حقہ واقف بھی تھے۔ انھیں علم و ادب کے علاوہ بھی فنون لطیفہ سے گہری واقفیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ مصوری یا شکاریات کو شاعری شمار کرتے ہیں تو ان کی جزئیات پر بھی غور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب وہ مصوری کو شاعری کا ہی ایک روپ ثابت کرتے ہیں تو یہ بھی بتاتے ہیں کہ مصور کو کن صفات سے متصف ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک مصور کو علم حساب، جبر و مقابلہ، اقلیدس، علم مثلث، کیمسٹری، علوم معدنیات، نباتات، حیوانات، علم ہیئت، جغرافیہ، مناظرہ، تاریخ، سیر، حکایات، قصص، تمدن، معاشرت، ادب اور دیگر علوم میں دستگاہ رکھنا واجبات سے ہے۔

"کاشف الحقائق" کی دوسری جلد میں فارسی اور اردو شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان دونوں زبانوں کی اصناف سخن خاص طور پر غزل، نظم، قصیدہ اور مراثی کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تمام قابل ذکر اساتذہ کا اصول تنقید کی روشنی میں تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ ابتداءً انھوں نے اس بات پر افسوس کا بھی اظہار کیا ہے کہ اردو شعرا نے فارسی سے جتنا فائدہ حاصل کیا اپنی زبان سنسکرت کی طرف اتنی ہی کم توجہ مبذول کی۔ اس سے اردو شاعری کو خاصا نقصان پہنچا ہے۔ انھوں نے فارسی اور ہندوستانی معاشرت، عوامی مزاج، تاریخ و تہذیب، ادبیات و شعریات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ شعر و ادب کا جائزہ نہیں لے رہے ہیں بلکہ تمدنی، تہذیبی اور ثقافتی و ادبی تاریخ لکھ رہے ہوں۔ غزل گوئی کے باب میں انھوں نے شاعروں کو توجہ دلائی ہے کہ غزل کی زبان سلیس ہو۔ اسے صنائع و بدائع سے پاک ہونا چاہیے۔ انھوں نے غزل کے حوالے سے جس طرح مشرقیت پر زور دیا ہے وہ اس عہد میں انھیں دیگر تنقید نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ انھوں نے غزل گو شعرا کے لیے ایک بین ثقافتی منشور جاری کیا ہے۔ یہ منشور ان کی گہری تجزیہ نگاری اور وسیع معلومات کا مظہر ہے۔ ان کے اس ادبی منشور سے بیشتر تنقید نگاروں نے اختلاف کیا ہے لیکن اس منشور کی تہذیبی بنیادوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

امداد امام اثر اور حالی کے تنقیدی افکار تقریباً ایک ہی وقت پر منظر عام پر آئے ہیں۔ لیکن حالی کے یہاں جو جامعیت ہے وہ اثر کے یہاں اس کا فقدان ہے۔ امداد امام اثر نے شاعری میں اخلاقیات پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ حالی کے یہاں بھی یہ اخلاقیات موجود ہے۔ اسی طرح واقعیت پر زور بھی دونوں کے یہاں یکساں ہے۔ لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ سرور صاحب نے لکھا ہے کہ حالی مجموعی طور پر اردو غزل کی اس شعریات کو تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے جو غزل نے صدیوں کے تہذیبی عمل کے بعد تشکیل دی تھی۔ حالی جن بنیادوں پر غزل پر تنقید کر رہے تھے وہ مغربی تھیں۔ حالی مغربی ادب اور مغربی تہذیب کا ادھورا اور بالواسطہ علم ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ مغربی تہذیب و ادب کے صرف اس حصے کا علم رکھتے تھے جو ہندوستان پہنچا تھا جو نہ اصلی مغربی تھا اور نہ اصل یوروپی تہذیب تھی۔ اثر کا امتیاز یہ ہے کہ وہ مغرب کا نسبتاً وسیع اور براہ راست علم رکھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اردو غزل کی تہذیبی شناخت اور اس کی تخلیقی شعریات کے تحفظ کی کوشش کی۔ حالی کو عشقیہ غزل پر اعتراض تھا۔ اس کے مقابلے میں نیچرل شاعری کا تصور لایا گیا تھا۔ اثر نے غزل کے عشقیہ ہونے کو ہی اس کی شعریات کا مرکزی اصول ٹھہرایا ہے۔

کاشف الحقائق کی پہلی جلد میں بنیادی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ جبکہ دوسری جلد میں اردو کی غزل گوئی پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس ریویو میں انھوں نے غزل کے متعلق بہت سی ایسی باتیں کہی ہیں جو مطالعے کے لائق ہیں۔ جستہ جستہ وہ ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جو آج بھی تازہ معلوم ہوتی ہیں۔ فلسفہ، منطق، تاریخ، عمرانیات پر ان کو جو عبور حاصل ہے اس کی بنا پر وہ تنقید کرتے وقت کوئی سطحی بات نہیں کہتے۔

تنقیدی ادب میں کاشف الحقائق کو اہم متن کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب تنقید کے میدان میں آج بھی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ عرصے سے یہ کتاب نایاب تھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کلاسیکی متون کی اشاعت کے اپنے منصوبے کے تحت اس کا شاندار عکسی ایڈیشن شائع کر کے ایک اہم ادبی و تنقیدی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ امید ہے کہ ہمارے جدید تنقید نگار اس کے مندرجات اور مباحث کی روشنی میں ایک بار پھر نئے تنقیدی نکات نکالنے کا آغاز کریں گے۔

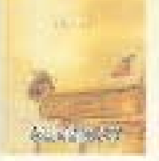

تعلیمی نفسیات

مصنف: ڈاکٹر طلعت عزیز
صفحات: 242، قیمت: 100 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: [illegible]، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ایک صالح معاشرے اور سماج کی تعمیر و تشکیل میں تعلیم کا اہم رول ہوتا ہے۔ کوئی بھی معاشرہ اور ملک تعلیم کے بغیر نہ ترقی کرتا ہے اور نہ ہی کر سکتا ہے۔ تعلیم انسان کی رہنمائی کا اہم ذریعہ ہے۔ علم کی روشنی میں ہی انسان بھلے برے کی تمیز کرتا ہے۔ اسی سے انسان میں سوچنے، سمجھنے، پرکھنے اور عمل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے جدید سے جدید تر طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ طرح طرح کی سہولتیں مہیا کرائی جاتی ہیں تاکہ نئی نسل اس عالم گیر ترقی کی دوڑ میں شامل ہو سکے اور ملک و قوم کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کر سکے۔

ایک استاد کے لیے اپنے طلبہ و طالبات کو سمجھنا ضروری ہے۔ طلبہ کے مزاج اور ان کی عادتوں کو سمجھنے کے لیے نفسیات کا علم ضروری ہے۔ اس لیے بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت کے لیے تعلیمی نفسیات لازمی ہے۔ چونکہ ایک استاد طالب علم کے مزاج اور عادتوں کو سمجھے بغیر اس کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل نہیں کر سکتا، نہ ہی اسے تعلیم دے سکتا اور اس کی تربیت کرنا ممکن ہے۔ اسی لیے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرنے والوں کو باضابطہ ٹریننگ کورس کرایا جاتا ہے جس میں تعلیمی نفسیات کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت حاصل ہے۔ نفسیات کے علم کی روشنی سے اساتذہ بچوں کی تعلیم و تربیت سے قبل ان کے مزاج، عادتوں، صلاحیتوں اور سیکھنے اور سمجھنے کے طور طریقوں سے واقف ہوتے ہیں۔ جب ایک استاد کو ان چیزوں سے واقفیت ہو جاتی ہے تو وہ ان کی بہتر شخصیت سازی کرتا ہے، ان کے مزاج اور عادات و اطوار کے مطابق انھیں بہتر تعلیم دیتا ہے اور اچھی تربیت کرتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'تعلیمی نفسیات' ڈاکٹر طلعت عزیز کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں تعلیم کی تعریف کی گئی ہے اور اس سے متعلق دانشوروں اور ماہرین تعلیم کی آرا کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ تعلیم کے بنیادی ارکان 'طالب علم'، 'تدریسی مقاصد'، 'معیار تعلیم'، 'طریقۂ تدریس' اور 'اندازۂ قدر' پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ طالب علم کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے استاد کو کن باتوں کا علم ہونا چاہیے، اس پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، مثلاً انسان کا ذہن کس طرح کام کرتا ہے؟ انسانی ذہن میں کون کون سی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں؟ انسان کی ذہنی صلاحیتوں کو کس طرح ناپا جا سکتا ہے؟ کس عمر میں بچے کی ذہنی صلاحیت کتنی ہوتی ہے؟ عمر کے اعتبار سے بچوں کی دلچسپیاں کیا ہوتی ہیں؟ کیا بچوں کے شوق اور دلچسپیوں میں تبدیلی کی جا سکتی ہے؟ کسی ایک کام پر بچے کی توجہ کتنی دیر تک مرکوز رہ سکتی ہے؟ کن حالات میں تعلیم و تربیت کا کام بہتر طور پر ہو سکتا ہے؟ وغیرہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ تعلیمی نفسیات کے ضمن میں تعلیمی نفسیات کا ارتقا، تعلیمی نفسیات کے مقاصد، تعلیمی نفسیات کی اہمیت، تعلیمی نفسیات کی ماہیت، تعلیمی نفسیات کی وسعت یا دائرۂ عمل، تعلیمی نفسیات کے طریقۂ کار کے تحت مشاہدے کا طریقہ، تحقیق کا طریقہ، عملی تحقیق اور مطالعۂ احوال پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

باب دوم میں نشو و نما کے عام اصول، نیز قبل از پیدائش مراحل کو متاثر کرنے والے عوامل، زندگی کے مختلف مراحل میں مختلف پہلوؤں کی نشو و نما، جسمانی نشو و نما، ذہنی نشو و نما اور سماجی و جذباتی نشو و نما پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان سب کے علاوہ اس باب میں فرد کی شخصیت سازی سے متعلق سگمنڈ فرائڈ، ابراہم ہیرلڈ میسلو، ایرک ایچ ایرکسن، جین پیاجے اور جیروم ایس برونر جیسے ماہرین تعلیم کے نظریات بیان کیے گئے ہیں اور ساتھ ہی ان ماہرین کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے تاکہ زیر تربیت اساتذہ ان ماہرین تعلیم کے نظریات کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت سے بھی متعارف ہو سکیں۔

باب سوم میں دماغ اور ذہن، ذہن کی کارکردگی، ذہانت اور اس سے متعلق چارلس اسپیئرمین، لوئس لیون تھرسٹن، ہاورڈ گارڈنر اور جوئے پال گلفورڈ کے نظریات پیش کیے گئے ہیں۔

باب چہارم میں آموزش کی تعریف، آموزش کی ماہیت اور خصوصیات، آموزش کو متاثر کرنے والے عوامل، آموزش کے طریقۂ کار، معاشرتی آموزش، ذہنی نشو و نما اور آموزش میں معاشرے کا کردار وغیرہ پر بہت ہی کارآمد گفتگو کی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب زیر تربیت اساتذہ اور ان اساتذہ کے لیے جو بغیر ٹریننگ کورس کیے ہوئے تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں، انتہائی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ پروفیسر طلعت عزیز تقریباً 1980 سے تدریسی خدمات انجام دے رہی ہیں اور تعلیمی نفسیات کے پیچیدہ مسائل سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ مہارت بھی رکھتی ہیں۔ پروفیسر طلعت عزیز کتاب کے حرف آغاز میں لکھتی ہیں: "اپنی ملازمت کے تقریباً 33 سال میں نے اس مضمون کو اردو زبان کے طالب علموں کو پڑھایا ہے اور ان کی کمزوریوں اور پریشانیوں کو سمجھا ہے اور ہر ممکن کوشش کی ہے کہ وہ نفسیات کے بنیادی تصورات کو اپنی زندگی کے تجربات کے پس منظر میں دیکھ اور سمجھ سکیں اور تدریس میں اس کی اہمیت کو سمجھ لیں۔"

زیر تربیت اساتذہ کے لیے اردو زبان میں تعلیمی نفسیات لکھ کر پروفیسر طلعت عزیز نے بہت اہم کام انجام دیا ہے۔ اس کے لیے وہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔ ساتھ ہی قومی کونسل برائے

فروغ اردو زبان کی انتظامیہ کو بھی بہت بہت مبارکباد کہ انھوں نے مذکورہ کتاب شائع کر کے اردو میڈیم کے زیر تربیت اساتذہ کی مشکل آسان کر دی ہے۔ چونکہ اب تک تعلیمی نفسیات پر اردو زبان میں شاید کوئی کتاب دستیاب نہیں تھی۔ اس لیے ان طلبہ و طالبات کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، جنھیں انگریزی زبان پر دسترس نہیں ہے۔ اب جب کہ یہ کتاب اردو زبان میں دستیاب ہو گئی ہے تو اردو میڈیم کے طلبہ و طالبات کو تعلیمی نفسیات کے پیچ و خم سمجھنے میں آسانی ہوگی اور وہ بھرپور استفادہ کر سکیں گے۔

دورِ حاضر میں رامائن کی معنویت اور دیگر مضامین

مصنف: ڈاکٹر ودیا ساگر آنند
ترتیب و انتخاب: پریم گوپال مِتل
صفحات: 160، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: معیار پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: پروفیسر [illegible] گیا 823001

جناب پریم گوپال مِتل ایک پڑھے لکھے گھرانے کے فرد ہیں۔ خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک بڑے پبلشنگ ہاؤس کے مالک ہیں۔ اردو کے فروغ کے لیے ہمہ دم کوشاں ہیں۔ پبلشنگ کے علاوہ ترتیب و ترجمہ کا بھی شوق رکھتے ہیں اور مختلف کتابیں مرتب کر چکے ہیں۔ ترجمہ نگاری کے فن پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔

فی الوقت میرے پیشِ نظر ان کی مرتبہ کتاب 'دورِ حاضر میں رامائن کی معنویت اور دیگر مضامین' ہے۔ یہ کتاب دراصل ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کے مختلف انگریزی مضامین و خطبات کا مجموعہ ہے۔

ابتدا میں ڈاکٹر راجندر کور لوٹے کا ایک انگریزی مضمون My Association with Dr. Vidya Sagar Anand کے عنوان سے شامل ہے جس میں ڈاکٹر لوٹے نے بڑے دلکش انداز میں ڈاکٹر آنند کی سماجی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ ان کی انسان نوازی اور سیکولر ذہنیت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد پریم گوپال مِتل نے (بطور تعارف، مقدمہ یا پیش لفظ جو نام بھی آپ دیں) 'ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کے رامائن اور ہندو فلسفے پر مضامین' کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے جو 25 صفحات پر مشتمل ہے۔ اپنے تعارفی کلمات / تحریر میں مِتل صاحب نے رامائن اور ہندو فلسفے کے تعلق سے دیے گئے خطبات اور لکھے گئے مضامین کے حوالے سے ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کے ہندو فلسفے پر یقین اور اس پر عمل پیرا ہونے کی بات بڑے ہی دلکش انداز میں کی ہے۔ ان کے خیال میں ڈاکٹر آنند نے ہندو فلسفے کو کٹرپن سے دور رکھا ہے اور خود ایک کشادہ ذہن، وسیع النظر اور وسیع القلب ہندو ہونے کی مثال پیش کی ہے۔ ان کا ہندو ہر تمام مذاہب اور اعتقادات رکھنے والوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور دوسروں سے بھی اس کی توقع رکھتا ہے۔ ڈاکٹر آنند کی اس سوچ کو پھیلانے کے لیے انھوں نے ان کے جن مضامین کا انتخاب کیا ہے اس سے ان کی انتخابی صلاحیت کا بھی علم ہوتا ہے اور خود ان کے ایک کشادہ دل ہندو ہونے کی خوبصورت مثال پیش کرتا ہے۔

پہلا مضمون 'دورِ حاضر میں رامائن کی معنویت' ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر ودیا ساگر آنند نے والمیکی اور تلسی کی رامائن کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ رامائن نہ صرف ایک شعری شاہکار اور کلاسک ہے بلکہ اس میں انسانوں کو انسان کی حیثیت سے زندگی جینے کا جو حق سکھایا گیا ہے وہ بے حد اہم ہے۔ یہ کتاب دراصل انسانیت کے لیے راہ نما ہے۔ رامائن کا پیغام 'سروِ دھرم سمبھاؤ' ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی سماجی زندگی کیسی ہو اور کس طرح انسان سماج میں زندگی گزارے۔ رامائن صرف ایک شعری شاہکار ہی نہیں ہے بلکہ اس میں اس عہد کی جھلک بھی ملتی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"سچائی یہ ہے کہ اس عظیم انسانی رزمیے میں کہیں ایک سطر بھی ایسی نہیں ہے جو ولادت کی بنیاد پر نسلی امتیاز کی حمایت کرتی ہو۔ اس کے برعکس رامائن واشگاف طور پر یہ تلقین کرتی ہے کہ انسان کسی بھی حد تک کسی خصوصی امتیاز کا حامل رہ سکتا ہے جب تک وہ اوصافِ حمیدہ سے خود آراستہ رہے۔" (ص 50)

"نسب کا مطلب صرف جسمانی نہیں، باطنی بھی ہے۔ جہاں انسان کے ظاہر اور باطن میں فرق ہو وہاں اس کے اعلیٰ نسب ہونے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اعلیٰ نسب میں پیدا ہو کر بھی اگر انسان کا ضمیر آلودہ ہو تو اسے اعلیٰ نسبی کا احترام پانے کا کوئی حق نہیں ہے۔" (ص 51)

"رامائن کے آدرشوں کو از سرِ نو رائج کرنے کی کوششوں میں مصروف ان لوگوں کی متعصبانہ فطرت، فاشسٹی مزاج کی علامت ہے۔ یہ لوگ تو رام کے نہیں راون کے پیرو دکھائی دیتے ہیں۔" (ص 52)

یہ کافی طویل مضمون ہے۔

اور رامائن بقول ڈاکٹر آنند آج کے آدمی کو انسان بننے کی دعوت دیتی ہے۔

دوسرے مضمون کا عنوان ہے 'تلسی جی کی رامائن اور ترجمہ پروفیسر یونس اگاسکر' یہ مضمون دراصل راجہ گوپال آچاریہ کے رامائن کا اردو ترجمہ از پروفیسر یونس اگاسکر کا دیباچہ ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر آنند نے رامائن ہی کے حوالے سے بتانے کی کوشش کی ہے کہ غیر جانب داری جس کا آج کل بہت شور ہے دراصل ہے کیا؟ وہ کہتے ہیں:

"جب حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی ہو، جب غیر جانب داری بے معنی بن جاتی ہے، جب ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم حق کے طرف دار بنیں، لیکن اس کے ساتھ ہمیں رواداری بھی اپنانی ہوگی، 'جیو اور جینے دو' کا اصول بھی اپنانا ہوگا... غیر جانب داری کا مطلب تو اقوام عالم کو کسی ڈر، خوف اور دباؤ کے بغیر اپنا دوست منتخب کرنے کا حق دینا ہے۔ آدرشوں کی کھینچا تانی میں مدد کرنے، امن چاہنے والے باہم کے لیے اپنے اثرات کو استعمال کرنا ہے۔" (ص 70-71)

اس کے علاوہ 'یوگا'، 'رامائن میں ہندو ازم'، 'یہودی ہندو تعلقات'، 'لاثانی ہندو ازم'، 'زرنگ عہد ہندو عمل' وغیرہ مضامین ایسے ہیں جو کافی دلچسپ اور معنی خیز ہیں۔

ڈاکٹر آنند کے خیال میں ہندو ازم کیا ہے، وہ بھی دیکھیے:

"اگرچہ ہندو طرزِ زندگی کا اپنا ایک معیار ہے جس میں خاکساری کا جذبہ اور انکسار، اس کی وضاحت جس طرح بھی کی جائے اور جیسے بھی اسے دیکھا جائے، سدا بہار محسوس ہوتا ہے۔"

آج کے عالمی تناظر اور خصوصی طور پر ہندوستان کے موجودہ سیاسی منظرنامے کو سامنے رکھیے تو ڈاکٹر آنند کی اس تحریر کی معنویت کو سمجھنا دشوار نہیں ہوگا۔

پریم گوپال مِتل مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ڈاکٹر آنند کے افکار کو انگریزی سے اردو میں منتقل کر کے ملک کے لوگوں کو نئی راہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔

شکیل بدایونی، شخصیت اور فن

مصنف / ناشر: ڈاکٹر مسرت اشرفی بدایونی
صفحات: 286، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2014
مبصر: ضیا الحق، فرحت کدہ، سرسید نگر، علی گڑھ

شکیل بدایونی اردو کے ان شاعروں میں سے ہیں جو فلم انڈسٹری میں جانے کی وجہ سے ادبی نقادوں کی نظر میں قابلِ اعتنا نہیں رہے۔ شکیل بدایونی کی شاعری اور شخصیت پر مصنف کا یہ تحقیقی مقالہ اس ادبی کوتاہی کا ازالہ کرتا ہے۔ مصنف رقم طراز ہیں "شکیل نے اردو زبان پر بڑا احسان کیا ہے کہ انھوں نے پردۂ سیمیں کے لیے ایسے ادبی نغمات لکھے

جن کے طفیل ادب گلی گلی کوچے کوچے ہر زبان تک پہنچ گیا۔"

اس کتاب کے آغاز میں پیش لفظ کے علاوہ اس کتاب کی مصنف اور کتاب کے بارے میں چودہ لوگوں کے تاثرات کل اڑتیس صفحات پر پیش کیے گئے ہیں۔ باقی کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے جن میں شکیل کی شاعری اور حالات زندگی کی تفصیل ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں شکیل بدایونی کے چار شعری مجموعوں: رعنائیاں، صنم و حرم، شبستاں، رنگینیاں کا تفصیلی بیان ہے، یعنی ہر مجموعے میں کتنی غزلیں، نظمیں اور قطعات ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے لکھے ہوئے مشہور فلمی گانوں کے مکھڑے اور فلموں کے نام دیے گئے ہیں۔ کتابیات کے تحت شکیل کی تمام تصنیفات کے نام اور ان پر دیگر لوگوں کے لکھے ہوئے مضامین اور کتابوں کی فہرست ہے۔ اس کتاب میں جابجا شکیل کی غیر مطبوعہ آپ بیتی 'میری زندگی' سے استفادہ کیا گیا ہے جو مجلہ 'بدایوں' کراچی میں قسط وار منظر عام پر آرہی ہے جسے ان کی بیٹی رضیہ شکیل پیش کر رہی ہیں۔

پہلے باب بعنوان 'پس منظر اور ماحول (بدایوں)' میں بدایوں کی تہذیبی اور ادبی تاریخ پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ عظمت بدایوں کو اجاگر کرنے کے لیے مشہور شعرا کے اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے۔ بدایوں کی تاریخ حوالوں کے ساتھ دی گئی ہے جو کسی بھی تحقیقی مقالے کے لیے بہت اہم ہوتی ہے۔ بدایوں کے اہل کمال، صوفیا، مشائخ، ادبا اور شاعروں کا مفصل ذکر بھی ہے۔

باب دوم میں شکیل بدایونی کے خاندان اور حیات کی تفصیل ہے۔ ان کا تعلق بدایوں کے سوختہ خاندان سے تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ حضرت سراج الدین کا لقب سوختہ تھا۔ ان کے والد منشی شیخ ہدایت اللہ کے دو لڑکے تھے منشی حضور احمد اور دوسرے مولوی جمیل احمد قادری سوختہ جو بمبئی میں اہل سنت نوجوں کے جماعت خانہ میں خطیب مسجد بنائے گئے تھے۔ انھوں نے بدایوں کے مدرسہ شمس العلوم سے تفسیر، حدیث اور فقہ وعقائد کی تکمیل کی تھی۔ وہ ہر سال باقاعدگی سے بدایوں آیا کرتے تھے۔ شکیل کی والدہ دلاری بیگم منشی غلام علی خان کی بیٹی تھیں۔ شکیل کی ولادت تین اگست 1916 کو اپنے دادا کے گھر ہوئی اور ان کا نام شکیل احمد رکھا گیا۔

انیس سو سینتیس میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے پہنچے۔ شکیل علی گڑھ کے دوران تعلیم ملک گیر شہرت کے مشاعروں میں حصہ لے رہے تھے اور نامور شعرا سے ملاقات کر چکے تھے۔ مصنف نے شکیل کی غیر مطبوعہ آپ بیتی کے حوالے سے ان کی حسرت موہانی اور جگر مرادآبادی سے پہلی ملاقات کی دلچسپ تفصیل بھی رقم کی ہے۔

'بدایوں کے مشاعروں کی کیفیت' کے عنوان سے مصنف لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں بدایوں کا مشاعرہ پڑھنا بڑی خوش نصیبی سمجھا جاتا تھا۔ عموماً مشاعرے طرحی ہوتے تھے۔ مصنف نے ایسے کئی مشاعروں کی تاریخیں اور مصرعہ طرح بھی درج کی ہیں۔ شکیل کے علی گڑھ کے قیام کے دوران ان کی شاعری اور اس زمانے کی ادبی تحریکوں پر بھی کتاب میں بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب سوم میں 'تفصیلی تحقیقی اور تنقیدی جائزہ' کے عنوان کے تحت، شکیل کی غزل گوئی، نظم نگاری، نعت گوئی اور گیت نگاری کا تفصیلی اور تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے ان کی چند نظموں کا تفصیلی تنقیدی تجزیہ کیا ہے، کئی نعتیں پیش کی ہیں۔ شکیل کا نعتیہ کلام، جس کا مسودہ ان کے دوست یوسف قادری کے پاس تھا، اسے ضمیر بدایونی صاحب نے 'نغمۂ فردوس' کے نام سے سنہ انیس سو ستاسی میں شائع کیا۔ اس مجموعے کی فہرست بھی شامل کتاب ہے۔ اس باب میں شکیل کی نغمہ نگاری پر ایک بھرپور مضمون شامل ہے اور بہت سے فلمی گانوں کے حوالے دیے گئے ہیں۔

باب چہارم مختصر ہے اور اس میں شکیل کی مراسلہ نگاری کی جھلک دکھلانے کے لیے ان کے کچھ خطوط شامل ہیں۔ ایک خط جو انھوں نے اپنے بدایوں کے ایک دوست افق صاحب کو سنہ انیس سو افتالیس میں لکھا تھا، اس کا ایک اقتباس بھی درج کیا ہے۔

باب پنجم میں شکیل کا اپنے ہم عصر شعرا سے 'تقابل' کے عنوان کے تحت کچھ مشہور شاعروں اور ادیبوں کے توصیفی کلمات ایک صفحے پر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد ایک طویل روداد بدایوں کے ایک بہت اہم مشاعرے کی جو شکیل کی شہرت کے بعد ان کی شان میں بدایوں میں ہوا تھا۔ مصنف نے مشاعرے کا آنکھوں دیکھا حال بہت جذباتی انداز میں رقم کیا ہے۔

باب ششم مصنف نے شکیل کا ادبی مقام پر روشنی ڈالنے کے لیے وقف کیا ہے۔ جس میں ان کی شاعری پر مختلف لوگوں کی آرا ہیں، تبصرے اور مضامین شامل ہیں۔ ان کے نام پر قائم کی گئی انجمنوں کی فہرست ہے۔ ان کو ملنے والے انعامات اور ایوارڈز کی تفصیل ہے۔

شکیل بزرگان دین سے بہت عقیدت رکھتے تھے، اور ان کے آستانوں پر حاضری دیتے تھے۔ کتاب میں ان کے سفر عراق کی روداد ہے، انھیں خواب میں بشارت ہوئی تھی کہ وہ غوث پاک کے مزار پر حاضری دے رہے ہیں، اس لیے وہ سنہ انیس سو چھپن میں عراق گئے اور اس مزار پر اور دیگر بزرگان دین کے مزارات پر حاضری دی اور کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف کی بھی زیارت کی۔

شکیل خوش شکل، خوش مزاج اور خوش پوشاک تھے۔ سفید رنگ کا لباس زیادہ تر پہنا کرتے تھے۔ خاص موقعوں پر کالی شیروانی اور سوٹ بھی پہن لیتے تھے۔ سگریٹ اور شراب سے دور رہتے تھے۔ پان کے شوقین تھے اور ان کے ساتھ ہمیشہ پان کی ڈبیہ اور بٹوا ہوتا تھا۔ ان کی شادی کم عمری ہی میں اپنے خاندان کی لڑکی سلمیٰ سے ہوئی تھی۔ ان کے خطوط میں کئی جگہ ان کا ذکر سلمیٰ بعد اور کہہ کر کیا گیا ہے۔ ان سے پانچ اولادیں ہوئیں جن میں سے چار زندہ ہیں۔ ایک بیٹی پاکستان میں ہیں جن کو ضیا قادری صاحب نے گود لے لیا تھا۔ بیٹے جاوید شکیل، طارق شکیل اور بیٹی صفیہ شکیل بمبئی میں رہتے ہیں۔ بیس اپریل انیس سو ستر کو وہ ذیابیطس کے دائمی مرض سے جاں بحق ہو گئے۔

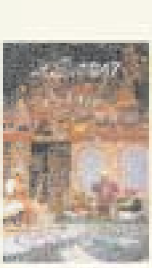

1947 کے بعد اردو ڈراما
مصنف: ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری
صفحات: 482، قیمت: 500 روپے
ناشر: دارالادب چیلی کشتہ فراش گنڈ بڈگام، کشمیر- 191111
مبصر: احمد شکیل، سنٹرل یونیورسٹی آف ساؤتھ بہار، گیا

'1947 کے بعد اردو ڈراما' ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری کی پی ایچ ڈی تحقیق ہے جو کتابی صورت میں منظر عام پر آئی ہے۔ یہ کتاب 'پیش گفتار' اور 'کتابیات' کے علاوہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں اردو ڈراما آغاز سے 1947 تک کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے، باب دوم میں اردو ڈراما 1947 سے 1970 تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ باب سوم میں اردو ڈراما 1970 سے تا حال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب چہارم میں 1947 کے بعد اردو کے ادبی ڈراموں سے بحث کی گئی ہے۔ باب پنجم میں 1947 کے بعد اردو ڈراما، اوپیرا اور ڈانس ڈراموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ باب ششم میں اردو ڈراموں پر جدید یورپی اثرات کا اکتساب ہے۔ باب ہفتم میں 1947 کے بعد اردو میں یورپی اور مشرقی ڈراموں کے ترجموں کی جانکاری فراہم کی گئی ہے۔ باب ہشتم میں اردو تھیٹر اور اس کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے اور کتابیات میں اردو اور انگریزی کے بنیادی اور ثانوی ماخذ کی فہرست ہے۔ اس طرح ان مختلف ابواب میں کافی مواد یکجا کیا گیا ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ عالمی ادب میں ڈراما یونان اور ہندوستان کی پیداوار ہے لیکن یورپی ممالک نے اس فن کو نقطہ عروج پر پہنچایا۔ ڈرامے کی ابتدائی شعریات بھی ارسطو اور

بھرت منی نے طے کی لیکن یورپ میں شیکسپیئر کے عہد میں اس کی نئی شعریات پر زور دیا جانے لگا۔ بعد میں ڈرامے کی شعریات پر اردو ہندی اور مغربی زبانوں میں بہت سی تحقیقات اور تنقیدات سامنے آئیں۔ اور بقول مصنف اطمینان بخش کام ہوا ہے۔ لیکن 1947 کے بعد خصوصاً اردو ڈراموں پر کوئی قابل لحاظ تحقیق و تنقید سامنے نہیں آئی ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ 1947 کے بعد سماجی بیداری، آزادی، تقسیم وطن، انتشار، تنہائی و بیزاری اور برصغیر کے ماحول اور مقامی اثرات سے متاثر ہو کر اردو میں بہت سے ڈرامے لکھے گئے۔ اس دور میں روایتی طرز پر بھی ڈرامے لکھے گئے اور مغربی طرز سے متاثر ہو کر اچھے خاصے تجربے بھی کیے گئے۔ ایسے ڈراما نگاروں میں حبیب تنویر، انور عظیم، کمار پاشی، ساجدہ زیدی، شمیم حنفی، آفاق احمد، محمد حسن، دیریندر پٹواری، کرشن چندر، محمد مجیب، ابراہیم جلیس، عصمت چغتائی، صادق، عابد حسین، زاہدہ زیدی، رفعت سروش، حبیب خان، صفدر ہاشمی، شاہد انور، ظہیر انور خصوصاً سرفہرست میں رہے ہیں۔ مغربی ڈراموں کے اردو ترجمے بھی کیے گئے۔ خصوصاً بریخت کے ڈراموں کے اردو ترجمے انور عظیم نے کثرت سے کیے۔ اس دوران اردو میں تحقیقی و تنقیدی کتابیں بھی سامنے آئیں لیکن زور کشمیری کے بقول آزادی کے بعد اردو ڈراما تحقیق و تنقید سرد مہری کا شکار ہے۔ لہٰذا موجودہ صورت حال کے تقاضوں کے تحت زیر تبصرہ کتاب سامنے آئی ہے۔ موصوف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ڈراموں کے جائزے میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا خیال رکھا گیا ہے لیکن یہ خیال نہ ابواب کی تقسیم سے ظاہر ہے اور نہ عنوان تحریر سے۔

اردو ڈراموں کی تحقیق و تنقید پر جن اصحاب نے قلم اٹھائے ہیں، زیر تبصرہ کتاب میں ان کی بڑی لمبی فہرست تیار کی گئی ہے۔ وہ مصنفین جن کی مستقل کتابیں ہیں، وہ مصنفین جنھوں نے مضامین و مقالے لکھے اور ایسے رسائل جن میں ڈراموں پر خصوصی نمبر نکالے گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ زور کشمیری نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ان کے مقالہ '1947 کے بعد اردو ڈراما - ایک تنقیدی مطالعہ' کے ساتھ ساتھ تین جامعات میں مشابہ موضوع پر تین اسکالرز کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شہناز صبیح (الٰہ آباد) 'اردو ڈراما آزادی کے بعد' جس کی اشاعت 2003 میں ہوئی اور ڈاکٹر شمیم اسماعیل گڑھ 'آزادی کے بعد اردو ڈراما' جس کی اشاعت 2008 میں ہوئی۔ موصوف کی رسائی کے مطابق ان تینوں کاموں کے طرز میں کوئی مشابہت نہیں ہے اور ان کا اپنا کام اپنی نوعیت کا منفرد کام ہے۔ زور کشمیری کی تحقیق میں آٹھواں باب 'اردو تھیٹر اور اس کی موجودہ صورت حال کا مجموعی جائزہ' کافی اہم باب ہے۔ 25 صفحات کے اس باب میں 12 صفحات میں اردو تھیٹر کا جائزہ لیا گیا ہے اور 13 صفحات میں اس کی موجودہ صورت حال سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے 1947 کے بعد ہند و پاک کی ڈراما کمپنیوں کی ابتدائی پیش رفت سے خاطر خواہ بحث کی ہے۔ ان کمپنیوں کے موجودہ گھروں کی جانکاری بھی دی ہے لیکن بنیادی ذرائع اور موجودہ کارکردگی کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ عہد رواں میں ڈراما نگاروں کے موضوعات اور ترجیحات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کا یہ بیان "کبھی تحقیق کار کی شناخت سچائی تھی، اب سچائی ہی بے شناخت ہو گئی ہے۔" (صفحہ 445) ڈرامے کے تخلیقی رجحانات کے باب میں ایک بڑا انکشاف ہے۔ بیسویں صدی کے ساتھ فلموں کا دور، ریڈیو کا ارتقا اور ٹیلی ویژن نے ڈراموں کو خاطر خواہ متاثر کیا۔ ڈرامے کی دلچسپی میں کمی بھی آئی لیکن ان ذرائع ابلاغ سے بھی ڈرامے کو راہ ملی۔ اور آج آب رواں کی طرح اس نے بھی اپنی انفرادی راہ نکال لی۔ صاحب کتاب نے اس بات پر کافی زور دیا ہے کہ اردو ڈرامے کا مستقبل ماضی کے مقابلے میں (یا معاشرے کے دور) یقیناً درخشاں ہے اور ان سے قوی امکانات اور توقعات وابستہ ہیں۔ انھوں نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ اس کتاب کی اشاعت میں حاصل مواد کا ایک تہائی حصہ ہی شامل کیا ہے اور مزید یہ کہ تھیسس اور کتاب دونوں کی صورت یکساں ہے۔

شعرائے مہاراشٹر (جلد اول دوم)

مصنف: خلیق الزماں نصرت
صفحات: 400، 541 (جلد اول دوم)
قیمت: 400، درج نہیں (جلد اول دوم)
ناشر: کائنات پبلی کیشنز، بھیونڈی
مبصر: راشد جمال فاروقی، C-1452 آئی ڈی پی ایل ٹاؤن شپ، ویر بھدرا، رشی کیش، اتراکھنڈ

خلیق الزماں نصرت تقریباً ایک درجن کتب کے مصنف ہیں اور نصف درجن اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب 'شعرائے مہاراشٹر' ممبئی، بھیونڈی اور ممبرا کے 91 شعرا کی تصاویر، ان کے سوانحی احوال، شعری سفر کی روداد، نمونہ کلام اور کلام کا غیر جانبدارانہ، تفصیلی اور تنقیدی جائزہ پیش کرتی ہے۔ جلد اول میں حروف تہجی کے حساب سے 'الف' سے لے کر 'نون' تک کے شعرا سامنے ہیں۔ مواد جمع کرنے میں انھیں جو دشواریاں درپیش آئیں وہ تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ایک شاعر نے تو ان سے کہا کہ ہمارا کلام پیش کر کے آپ مشہور ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے شاعر نے ایک ماہ کی مہلت مانگی کہ تازہ کلام کہہ سکیں اس سے قبل کا سارا کلام وہ کسی کو بیچ چکے تھے یا بخت کی صورت میں وہ اپنے دادا مرحوم کا کلام دینے کی پیش کش بھی فرمانے لگے۔ ممبئی اردو کے لیے ہمیشہ سے فراخ دل شہر رہا ہے اس ضمن میں نصرت فلموں اور ٹی وی سیریلوں نیز غزلوں، گیتوں کے گلوکاروں کا اردو کی طرف جھکاؤ دیکھتے آ رہے ہیں۔ سکندر علی وجد نے مہاراشٹر کی شان اجنتا پر اور علی سردار جعفری نے 'ممبئی' پر نظمیں لکھیں۔ ستیہ اداھوا، پالگری، مراٹھی صحافی و دیا دھر گوکھلے، شری پد جوشی، دشت پوت دار، کیفلائی میشرام، نرائن سردے اور رام پنڈت نے مراٹھی زبان میں غالب پر کتب لکھیں۔ شعرا کے تعلق سے دلچسپ واقعات کتاب کو خوشگوار بناتے ہیں۔

کتاب کے سب سے پہلے شاعر صفدر آہ بیوی کے انتقال کے بعد پنڈت بن کر ایک مندر میں رہنے لگے تھے اور مرنے کے بعد جلائے جانے کی وصیت کر چکے تھے۔ لیکن مندر کے بڑے پنڈت نے ان کی لاش ان کے اعزا کو سونپ کر دفنانے کا انتظام کر دیا۔ اعجاز صدیقی کی وقت کی پابندی ایسی تھی کہ دوسروں سے بھی یہی امید رکھتے ورنہ خفا ہو جاتے۔ جاں نثار اختر فلموں میں رہتے ہوئے بھی فلمی دنیا سے متنفر رہے۔ اعجاز صدیقی جذباتی تھے۔ ایک بار قیصر الجعفری سے ناراض ہو کر بگڑ گئے۔ قیصر خاموشی سے سنتے رہے اور بولے "اچھا چلو پان کھاتے ہیں۔" اعجاز بولے "میں پان نہیں جان کھاتا ہوں" قیصر مسکرائے اور کہا "آپ جان ہی نہیں کان بھی کھاتے ہیں" ابراہیم اشک ادب کے علاوہ فلموں میں بھی کامیاب ہیں۔ باقر مہدی کی تنک مزاجی کے کئی قصے قارئین کی تفریح کا سبب بنیں گے۔ مثلاً باقر اپنے گھر آنے والے کے لیے جب دروازہ کھولتے تو جس کو چاہتے تھے اسی کو اندر آنے دیتے تھے ورنہ واپس بھیج دیا جاتا تھا۔ ایک بار انور خاں ان سے ملنے گئے۔ باقر مہدی انھیں اندر نہیں آنے دینا چاہتے تھے لیکن وہ زبردستی اندر داخل ہو گئے۔ تو پھر باقر نے بھی برا نہ مانا اور ان کی خوب تواضع کی۔

علی سردار جعفری نے جب اردو شعرا پر ٹی وی سیریل 'کہکشاں' بنایا تو ان کی کوشش کے باوجود اسے ہندی کا سرٹیفکیٹ دیا گیا۔

شکیل بدایونی نے اپنے ایک جشن میں مسلسل 3 گھنٹے تک کلام سنایا اور لوگ داد دیتے رہے۔ شکیلہ بانو بھوپالی جب بھی ہوتیں تو ایک ہاتھ کی چوڑیاں نکال کر دوسرے میں اور دوسرے ہاتھ کی پہلے ہاتھ میں پہنتی رہتی تھیں۔ عماد اعظمی نے معصوم انصاری کو بتایا کہ ایک دن صبح سو کر اٹھے اور پردہ کھینچا تو سامنے کوہ نور مل کے مونوگرام (مرغے) پر نظر پڑ گئی اور یہ شعر ہو گیا:

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہوگئی

اس ضخیم کتاب میں موجود شعرا کے کلام کی خصوصیات اور زندگی کے تئیں ان کے رویے نیز دلچسپ واقعات نے مجموعی طور پر کتاب کو دستاویزی حیثیت عطا کردی ہے۔ سب سے آخر میں مصنف خلیق الزماں نصرت نے اپنا پروفائل اور نمونہ کلام پیش کیا ہے۔ ممبئی اور مضافات کے شعرا پر مشتمل اس اہم کتاب نے عروس البلاد ممبئی کے دھنک رنگ شعری منظرنامے کو آئندہ کے محققین کے لیے محفوظ کردیا ہے۔ ممبئی جو اردو کا ایک بڑا مرکز رہا ہے، وہاں منتشر شعرا کو ایک جلد میں سمیٹ کر نصرت نے کارِ خیر انجام دیا ہے۔ یہ انگلوتی کتاب ہمیں ان مشاہیر شعرا کے بہت قریب پہنچا دیتی ہے ان میں سے چند نام درج کیے جاتے ہیں، مسعود آرا، اعجاز صدیقی، جاں نثار اختر، افتخار امام صدیقی، ابراہیم اشک، باقر مہدی، انا دہلوی، شبیر راہی، راجش ریڈی، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، احمد سوز، عبدالاحد ساز، ساگر ترپاٹھی، شکیل بدایونی، رفیعہ شبنم عابدی، شکیلہ بانو بھوپالی، شکیل اعظمی، ظفر گورکھپوری، عزیز قیسی، عبداللہ کمال، مجروح سلطانپوری، ندا فاضلی اور ندا فاضلی وغیرہ۔

خلیق الزماں نصرت نے شعرائے مہاراشٹر جلد دوم میں کوئی پیش لفظ شامل نہیں کیا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی جلد الف سے ن تک حروف سے شروع ہونے والے تخلص رکھنے والے شعرا پر مشتمل تھی۔ جلد دوم کو پھر الف سے شروع کرکے ے تک لے گئے ہیں۔ اس طرح جو لوگ پہلی جلد میں چھوٹ گئے تھے وہ بھی شامل ہوگئے لیکن نام بڑھ گیا۔

اس جلد میں بھی فارمیٹ (format) وہی ہے۔ شاعر کی تصویر، حالاتِ زندگی، شعری رجحان، نمونہ کلام، کلام کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ اور شاعر کی شخصیت کے تعلق سے اہم جانکے۔ اس طرح بہت سارے دلچسپ واقعات قارئین کے مطالعے کو مزید پرشوق بناتے ہیں۔ یہ جلد غلام احمد خاں آرزو سے شروع ہوکر یوسف دیوان پر ختم ہوتی ہے اور 144 شعرا کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ آیئے چند مزیدار باتیں بانٹ لیں:

کتاب کے اولین شاعر غلام احمد خاں آرزو اخبار 'ہندوستان' نکالتے تھے۔ اخباری رپورٹ سب سے پہلے شائع کرنے کا انھیں جنون تھا۔ ایک بار جب روس ڈکٹیٹر اسٹالن کوما میں تھا تو ایک روز اچانک آرزو نے اپنے اخبار کی سرخی جمائی 'اسٹالن کی موت' اور واقعی اس رات ہی کسی وقت وہ مر بھی چکا تھا۔ انور فرخ آبادی سے کوئی کلام سنانے کو کہتا تو منع کردیتے، کہتے "میں تو قوالیاں لکھتا ہوں" اختر الایمان نظم اور نثر دونوں پر قدر رکھتے تھے۔ جاوید اختر کی اپنے والد جاں نثار اختر سے کبھی نہیں بنی لیکن وہ ساحر لدھیانوی کا بہت احترام کرتے تھے۔ ساحر کے انتقال پر جاوید اختر ان کی میت اپنے گھر لے گئے۔ روتے جاتے اور تجہیز وتکفین کا انتظام کرتے جاتے تھے۔ حسرت جے پوری بس کنڈکٹر تھے۔ چلتی بس میں شعر سناتے رہتے تھے۔ ایک دن کسی پروڈیوسر کی نظر میں آگئے اور فلمی نغمہ نگار بن بیٹھے۔ آغا خلش کاشمیری نے منٹو کو ابتدائی اردو سکھائی تھی۔ جب منٹو کو 'مصور' کی ایڈیٹری ملی تو انھوں نے شرط رکھی کہ آغا خلش کو بھی ملازمت دی جائے۔ غرقاب نظام پوری نے کبھی مکتب کا منہ نہیں دیکھا۔ انھیں جب جب مکتب لے جایا جاتا انھیں تیز بخار آجاتا تھا۔ قیصر الجعفری ممبئی سینٹرل پر بکنگ دفتر میں تھے۔ ایک بار علی سردار جعفری نے ٹکٹ لینے کے لیے جب کھڑکی میں ہاتھ ڈالا تو قیصر نے انھیں ٹکٹ کے ہمراہ اپنی کتاب بھی تھمادی اور اس پر کچھ لکھنے کی درخواست بھی کی لیکن سردار نے اس پر کبھی کچھ نہیں لکھا۔ کیفی اعظمی حیدرآباد کے ویمنس کالج کی لڑکیوں میں آئے۔ پسند کیے جاتے تھے کہ لڑکیاں 30-25 روپے خرچ کرکے ان کی تصاویر حاصل کرتی تھیں۔ یہ رقم ان دنوں خاصی بڑی ہوتی تھی۔ محمود درانی بس کنڈکٹر تھے اور ملازمت کے دوران بھی اکثر نشے میں رہتے تھے۔ روز شام کو حساب دیتے وقت کچھ روپیہ ہمیشہ کم نکلتے جو ان کی قلیل تنخواہ سے کاٹے جاتے پھر بھی وہ مست تھے۔ گرلز میں ان کے نام ایک چوک ہے۔

اس جلد میں ایسے ایسے عظیم الشان شعرا کی شخصیت اور شعری پہچان منعکس ہوئی ہے جن کے بارے میں اکثر قارئین کو تجسس رہتا ہے۔ مثلاً چند اہم نام درج کیے جاتے ہیں۔ اختر الایمان، انجم رومانی، کفیل آزر، فصیح اکمل، اشعر نجمی، جاوید اختر، جاوید ندیم، حسرت جے پوری، حامد لطیف، حامد اقبال صدیقی، دفتی شرر، راجندر کرشن، کالی داس گپتا رضا، یعقوب راہی، سعید راہی، ممتاز راشد، شمیم عباس، شمیم طارق، شاہد لطیف، صابر دت، صبا افغانی، عشیش بہاری طرز، فضیل جعفری، قمر جلال آبادی، قیصر الجعفری، قمر صدیقی، کیفی اعظمی، حسن کمال، گلزار، عبدالمنان بجنوری، حسن نعیم، نقش لائلپوری، نظام الدین نظام، ندیم صدیقی، قاسم ندیم، عزیز نبیل اور احمد وصی وغیرہ۔ کتاب کی عظمت مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

بقول پروفیسر مجاہد حسین حسینی "جب میں نے سرسری طور پر پڑھا اور چاہا کہ اسے بک شیلف میں رکھ دوں تو اس کلام نے ہاتھوں کی گرفت اور نظروں کی توجہ سے ہٹنے سے یکسر انکار کردیا۔ علامہ آرزو لکھنوی کی زبان میں گویا اس نے مجھ سے احتجاج کیا اور کہا:

جاتے کہاں ہیں آپ نظر مجھ سے موڑ کے
تصویر نکل پڑتی ہے آئینہ توڑ کے

مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار

مصنف: ارشاد احمد آفاقی

صفحات: 212، **قیمت:** 300 روپے، **سنہ اشاعت:** 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی

مبصر: سجاد احمد، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مزاح نگاروں میں مجتبیٰ حسین کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے جنھوں نے اخبار 'سیاست' کی کالم نگاری سے مزاح نگاری کا آغاز کیا تھا اور آج تک ان کے لکھے ہوئے مزاحیہ کالم نہ صرف اخبار 'سیاست' کے قاری اپنے ذوق کی تسکین کرتے ہیں بلکہ وہ کالم ہندوستان اور پاکستان کے ادبی جریدوں اور اخباروں میں بھی ڈائجسٹ کیے جاتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی ہر تحریر منتخب ہوتی ہے چاہے ان کی کالم نگاری ہو یا مزاح نگاری ان کی تحریریں پھکڑپن سے پاک ہوتی ہیں۔ خیالی دنیا کی سیر کرانے کے بجائے وہ ہمیں زمین سے جڑے حقائق کو اپنے خاص طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ شگفتگی اور شادابی ان کے پڑھنے والوں کو ہمیشہ ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دہراتے نہیں ہر بار ایک نئے موضوع کے ساتھ اپنے قاری کے سامنے حاضر ہوتے ہیں۔

ارشاد احمد آفاقی کی کتاب 'مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار' میں انھوں نے مجتبیٰ حسین کی مزاحیہ خاکہ نگاری کے ساتھ ساتھ ان کی سوانح اور فن پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں اپنی بہترین ادبی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ کتاب کے مشمولات کچھ اس طرح سے ہیں۔ 'ہنسی کی تعریف اور اہمیت'، 'مزاح کیا ہے'، 'طنز کیا ہے'، 'طنز ومزاح کے مابین رشتہ'، 'اردو ادب میں طنز ومزاح کی روایت'، 'مجتبیٰ حسین کی سوانح حیات اور کارنامے'، 'مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار'، غرض یہ کہ ارشاد احمد آفاقی نے ہنسی سے شروع کرکے طنز ومزاح کے جملہ لوازمات پر بھرپور خامہ فرسائی کی ہے۔ ہنسی کے ضمن میں "ہنسی کی تعریف اور اہمیت" کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"ہنسی انسان کی جبلی کیفیت ہے۔ یہ فطری کیفیت انسان کو حیوان سے جدا کرتی

ہے اسے 'حیوان ظریف' کا لقب بھی عطا کرتی ہے اس لیے کہا گیا ہے کہ 'الانسان حیوان ضاحک' کیونکہ ہنسی انسان کی وہ صفت ہے جو اسے دوسرے حیوان سے ممتاز و ممیز کرتی ہے۔ بلکہ میڈیکل کالجوں میں ڈاکٹروں نے تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہنسی ہائی بلڈ پریشر اور اضافی بلڈ شوگر کو اعتدال میں رکھنے کے لیے ممد و معاون ہے۔"

اس مضمون کے تحت مصنف نے نہ صرف یہ بتایا ہے کہ ہنسی کی بدولت انسان کی جذباتی، ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی پریشانیوں اور غموں کا علاج بھی ہوتا ہے۔ بلکہ جن امراض کا علاج ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات کے علاوہ پیروں اور فقیروں سے بھی نہیں ہوتا ہے اس پریشانی کا علاج صرف ہنسی سے ہوتا ہے۔ ہنسی کے توضیحی مطالعے کے بعد مزاح اور طنز کی الگ الگ تعریف بیان کی گئی ہے اور اسی کے ساتھ طنز و مزاح کے درمیان باہمی رشتے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف ادبا و ناقدین کے اقوال کو سامنے رکھ کر طنز و مزاح کی تعریف متعین کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔

دوسرے حصے میں طنز و مزاح کی روایت پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے اس حصے میں جعفر زٹلی سے لے کر نظیر اکبرآبادی، غالب، خواجہ حسن نظامی، ملا رموزی، ابوالکلام آزاد، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، ابراہیم جلیس، کنہیا لال کپور، شوکت تھانوی، ابن انشا، کرشن چندر، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان، احمد جمال پاشا، مشفق خواجہ، مجتبیٰ حسین، فکر تونسوی، یوسف ناظم اور دلاور فگار وغیرہ کے فن کا بھی جائزہ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے میں "مجتبیٰ حسین کی سوانح حیات اور کارنامے" کے تحت ان کے خاندان، ان کی ولادت، ان کی تعلیم و تربیت، ان کی شادی اور ازدواجی زندگی، ان کے دوستانہ مراسم، ان کی ملازمت، ان کے ادبی سفر اور تصانیف، ان کے اعزازات، ان کا تخلیقی عمل اور ان کی ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے بہت ہی مربوط گفتگو کی گئی ہے جس سے مجتبیٰ حسین کی حیات و شخصیت کا ایک جامع اور دلچسپ مرقع تیار ہوا ہے۔

کتاب کا آخری حصہ "مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار" کے عنوان سے ہے اس میں مصنف نے مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ پیش کرنے سے پہلے خاکہ نگاری کی شعریات کو مقدمے کے طور پر پیش کیا ہے اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں قاری بیک وقت ہندوستان و پاکستان کے مزاحیہ ادب کا مزہ بھی چکھ لیتا ہے۔ اس طرح قاری مجتبیٰ حسین کے گزشتہ اور ان سے پیوستہ مزاح نگاروں کی جھلکیاں بھی دیکھ لیتا ہے۔

ارشاد احمد آفاقی نے جس سلیقے سے معلومات پیش کیے ہیں وہ قابل تعریف ہیں طرز اظہار استدلالی اور واضح ہے کتاب کی طباعت بھی دیدہ زیب ہے سرورق پر مجتبیٰ حسین کی تصویر نہایت عمدہ ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی: احوال و آثار

مصنف: عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی

صفحات: 176، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

مبصر: ثمرین (ریسرچ اسکالر)، جامعہ ملیہ اسلامیہ

تصوف کا ادب و شاعری سے گہرا تعلق ہے۔ اردو شاعری کے حوالے سے کئی ایسے نام ہیں جن کے کلام کا بیشتر حصہ تصوف پر مبنی ہے۔ تصوف کے اہم شعرا میں امیر خسرو، علامہ اقبال، خواجہ میر درد اور محسن کاکوروی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ انھیں میں ایک اور صوفی شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی ہیں۔ شاہ وجیہ الدین گجراتی کی ادبی شناخت شاعر اور مفکر کی ہے۔ عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی نے شاہ وجیہ الدین کے تعلق سے بکھری معلومات کو جمع کر کے اسے کتابی شکل میں پیش کیا ہے جس سے شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی اور ان کے تصوفانہ خیالات سے واقفیت ہوتی ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی نے مدرسۃ الاصلاح سے تعلیم حاصل کی۔ علم و ادب سے گہرا اشتغف رکھتے تھے اور مومن خاں مومن پر کتاب بھی شائع کی۔ اس کے علاوہ ان کا خاص موضوع تصوف رہا ہے۔ انھوں نے صوفی حضرت مخدوم مہائمی: احوال و آثار، غالب کے معاصر صدر الدین آزردہ اور گجرات کی مشہور صوفی شخصیت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی پر محققانہ کتابیں تصنیف کیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی: احوال و آثار' کا پیش لفظ ماہر لسانیات پروفیسر عبدالستار دلوی نے تحریر کیا ہے اور تصوف پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ ان کے مطابق ہندوستان میں تصوف نے بہت ترقی کی اور اس کے کئی سلسلے وجود میں آئے۔ دلی میں نظام الدین اولیا، حضرت بابا فرید گنج شکر، خواجہ بختیار کاکی اور شرف الدین بوعلی قلندر جیسی برگزیدہ شخصیتیں پیغام محبت عام کرتی رہی ہیں۔ ہندوستان میں اردو زبان و ادب کے ارتقا میں صوفیائے کرام کا لسانی و ادبی حیثیت سے کافی اہم کردار رہا ہے۔ اس ضمن میں عبدالستار دلوی نے مولوی عبدالحق کی معروف کتاب 'اردو زبان کے ارتقا میں صوفیائے کرام کا حصہ' کا ذکر بھی کیا ہے۔

پیش نظر کتاب شاہ وجیہ الدین کے احوال و آثار سے متعلق ہے۔ یہ گجرات کے مشہور صوفی بزرگوں میں سے ہیں۔ ان کی کوئی تصنیف یا مستقل ادب کے حوالے سے کوئی تحقیق نہیں پائی جاتی سوائے چند رسائل اور شرحوں کے۔ 'بحر الحقائق' کے نام سے ان کے ملفوظات پائے جاتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی: احوال و آثار' کو عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی نے 12 حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلا حصہ شاہ وجیہ الدین کے حالات زندگی پر مبنی ہے۔ مصنف نے وجیہ الدین علوی کی ولادت، والدین، تعلیم و تربیت، اساتذہ، ادبی شوق اور تصوف وغیرہ سے متعلق معلومات پیش کی ہیں۔ جب کہ کتاب کے دوسرے حصے میں شاہ وجیہ الدین علوی کے پیر و مرشد سے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ روحانی مرشدوں میں وجیہ الدین کو جس شخصیت نے متاثر کیا وہ شاہ محمد غوث گوالیاری کی شخصیت ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب فریدالدین عطار سے ملتا ہے۔ ان کی یادگار تصانیف میں رسالہ معراجیہ، جواہر خمسہ، کلید مخازن، کنز الوحدہ اور ضمائر و بصائر ہیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ شاہ محمد غوث کے خلفا میں شاہ وجیہ الدین ایسے بزرگ ہیں جن کی بدولت عرب و عجم دونوں میں لوگ سلسلۂ شطاریہ سے روشناس ہوئے۔

تیسرا حصہ شاہ وجیہ الدین کے اخلاق و عادات سے متعلق ہے۔ انسان کتنی ہی عظیم شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو لیکن اگر اس کے اندر اخلاقی آداب و محاسن نہیں ہوں گے تو اس کی شخصیت جاذب نظر نہیں ہوگی۔ مصنف کا خیال ہے کہ شاہ وجیہ الدین کے اندر اخلاق کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کے اندر حق گوئی و بے باکی، تقویٰ، رحم دلی، مظلوم کی فریاد رسی، پوشاک میں سادگی اور خدمت خلق بھی کچھ موجود تھا۔ ان کی اولاد میں 5 بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ جن کے نام شاہ عبداللہ، شاہ عبدالواحد، شاہ عبدالحق، شاہ غالب اور شاہ حامد ہے۔ عبدالرحمٰن پرواز نے شاہ وجیہ الدین علوی کے اہل و عیال کا ذکر بھی اس کتاب میں کیا ہے۔ نواں حصہ 'خلفائے کبار اور ممتاز تلامذہ' میں وجیہ الدین علوی کے خلفا اور شاگردوں کا تذکرہ ہے۔ ان کے ممتاز شاگردوں میں سید صبغۃ اللہ بھڑوچی، شیخ محمد بن فضل اللہ برہانپوری، قاضی جلال الدین ملتانی، حکیم عثمان بوبکانی اور شیخ عبدالقادر وغیرہ اہم ہیں۔ یہ تمام شاگرد بھی انھیں کی طرح بزرگ اور عظیم شخصیت کے مالک ہوئے۔ اور انھوں نے تصوف کا دامن وسیع کیا۔ دسواں باب شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کی تصنیفات سے متعلق ہے۔ وجیہ الدین کا مشغلہ درس و تدریس تھا۔ وہ ہمیشہ علوم دینی کے درس میں مشغول رہتے

تھے۔ مصنف نے زیر نظر کتاب 'شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی: احوال و آثار' میں ان کی 17 کتابوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ جن میں شرح محمدیہ، شرح کلیہ قانون، الرسالۃ الطبیہ، شرح جام جہاں نما (فارسی)، رسالہ شرح الارشاد، حاشیہ علی شرح الجامی، وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ شاہ وجیہ الدین علوی کے ملفوظات بھی شامل کتاب ہیں۔ کتاب کے آخر میں عبدالرحمن پرواز اصلاحی نے کتابیات بھی درج کی ہے جو بہت اہم ہے۔ جس سے وجیہ الدین کے تعلق سے نئی کتب و رسائل سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ان میں عربی، اردو، فارسی، انگریزی اور گجراتی زبان کی کتابیں ہیں۔ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے کتابوں کی یہ فہرست معاون اور مددگار ثابت ہوگی۔

رئیس المعالجات بایوکیمک علاج

مصنف: ڈاکٹر رئیس اعظمی
صفحات: 370، قیمت: 250 روپے
ناشر: قاسمیہ لائبریری، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

زیر نظر کتاب بارہ نمکیات پر مشتمل ایک الگ علاج سے متعارف مانی جانے والی پیتھی 'بایوکیمسٹری' پر لکھی گئی ہے۔ جسے ہومیوپیتھ ڈاکٹر کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ مصنف 'بایو پیتھی' 'بایوکیمک' کو نہایت آسان اور ٹھوس شکل میں پیش کرنے کی کوشش میں کامیاب ہیں۔ کتاب میں ڈاکٹر رئیس احمد انصاری صاحب نے بایوکیمک علاج کا تعارف بھی پیش کیا ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ بایوکیمک دوائیں کس طرح انسانی جسم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ بایوکیمک دواؤں سے متعلق تمام معلومات اس کتاب میں موجود ہیں۔ مثلاً بارہ دواؤں کی اہم علامات، دوا کا انتخاب کیسے کریں، بایوکیمک دوائیں بنانے کا طریقہ، کیا بایوکیمک دوائیں ملا کر دی جاسکتی ہیں، دوا کی مقدار اور خوراک کا استعمال، دوائیں کن صورتوں میں دستیاب ہیں، غذا اور پرہیز وغیرہ۔

کتاب میں امراض کی تفصیل اور دواؤں کے متعلق تفصیلات حروف تہجی کے اعتبار سے دی گئی ہیں جس سے کوئی بھی اپنے مرض کا علاج بآسانی دریافت کرسکتا ہے۔ کتاب میں ڈاکٹر رئیس احمد صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ دوائیں ہومیوپیتھک دواؤں کے ساتھ دی جاسکتی ہیں اور زیادہ فائدہ مند بھی۔ ملاحظہ کریں: "ہومیوپیتھی کے ساتھ بایوکیمک دوائیں بہت ہی مفید ہیں یہ کسی طرح مضر بھی نہیں ہیں کیونکہ یہ جسم میں پائے جانے والے بارہ نمک کی کمی کی تکمیل پیتھی طریقہ علاج ہے۔" (ص 46-45)

ڈاکٹر موصوف تعارف کے محتاج نہیں۔ اس سے قبل اپنی تصنیفات سے عوام و خواص میں اپنی کامیاب کوشش سے پہچانے جاتے ہیں۔ اردو سے واقف کوئی بھی شخص اس کتاب سے استفادہ کرسکتا ہے۔

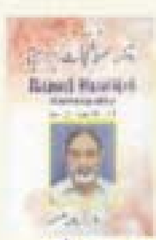

رئیس المعالجات ہومیوپیتھی

مصنف: ڈاکٹر رئیس اعظمی
صفحات: 603، قیمت: 325 روپے
ناشر: قاسمیہ لائبریری، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی
مبصر: ڈاکٹر ایم ایف خان، ڈاکٹر آر بی اگروال ہومیوپیتھک کالج اینڈ ہاسپٹل، اسلام پور، بودھ گیا

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر رئیس احمد اعظمی کی قابل قدر تصنیف ہے جس کا اسلوب [illegible] میں لطیف ہے۔ اردو میں اس طرز کی کتاب نہیں لکھی جاتی ہے۔ کتاب آسان اور عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے۔ کتاب کی شناخت Reportorial ہے جس میں ضرورت کے مطابق بیماری سے لڑنے کے تمام ادویاتی ہتھیار موجود ہیں۔

اس 600 صفحے والی کتاب میں ہومیوپیتھی سے متعلق تمام موضوع کو یکجا کیا گیا ہے۔ میٹریا میڈیکا، پریکٹس آف میڈیسن 'Cardinal-Principles'، ڈاکٹر ہنیمین صاحب کی Organon 'آرگنن آف میڈیسن'، 'کینٹ کی ریپرٹری' غرض سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہو۔ ہومیوپیتھک فزیشن کو ذہن نشین ہونا چاہیے کہ علامات جو مریض محسوس کرے تیماردار بیان کریں اور ڈاکٹر کے مشاہدہ میں ہو اور Mental General ایسی ہی دوا تیر بہ ہدف ہوتی ہے اور اس کوشش میں ڈاکٹر موصوف کامیاب ہیں۔

سوائے چند غلطی کے صفحہ 14 'ہومیوپیتھی کا تعارف' "اگرچہ ہنیمین صاحب کے سر ہومیوپیتھی کو دریافت کرنے کا سہرا نہیں ہے۔" یہ سراسر بے بنیاد ہے جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے وہ غیر واضح ہے۔ پھر بھی جس ڈاکٹر کی محنت اور جانفشانی کے اوپر کتاب تصنیف کی گئی ہے اس کو بھی مشکوک کرکے کسی علمی دلائل کو سراہا نہیں جاسکتا۔ آئندہ اگر اس ایک سطر کو حذف کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

اس کتاب میں بھی حروف تہجی کے اعتبار سے تقریباً 739 امراض اور ان کی علامات کے مطابق دواؤں کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ امراض میں سر سے لے کر پاؤں تک کی علامت کو شامل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کوشش کو اہم اور ذی قدر لوگوں نے عزت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر رئیس اعظمی صاحب کو ہومیوپیتھک علاج کا ایک طویل تجربہ ہے اور اس کتاب میں دواؤں کے انتخاب اور امراض کی علامات کی تفصیل میں وہ تجربہ جابجا نظر آتا ہے۔ کتاب بہت اچھی ہے اور اس سے ڈاکٹروں کے ساتھ ساتھ اردو پڑھا لکھا کوئی بھی شخص استفادہ کرسکتا ہے۔

سلام بن رزاق: اپنے افسانوں کے آئینے میں

مؤلف / ناشر: شاکر تسلیم
صفحات: 240، قیمت: 250 روپے
مبصر: ڈاکٹر اقبال زیدی، B-63، ڈی ایل ایف کالونی، صاحب آباد، ضلع غازی آباد، یوپی 201005

'سلام بن رزاق اپنے افسانوں کے آئینے میں' شاکر تسلیم کی ایسی کتاب ہے جس میں انھوں نے سلام بن رزاق کے منتخب افسانوں اور تجزیوں کو شامل کیا ہے۔ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاکر تسلیم نے سلام بن رزاق کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہوگا لیکن کتاب کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے ممتاز نقادوں کے ذریعے کیے گئے تجزیوں کو یکجا کر دیا ہے۔ سلام بن رزاق 1970 کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے 'ننگی دوپہر کا سپاہی' (1977)، 'معبر' (1987)، 'شکستہ بتوں کے درمیان' (2003) اور 'زندگی افسانہ نہیں' (2012) شائع ہوچکے ہیں۔ 'شکستہ بتوں کے درمیان' کے لیے سلام بن رزاق کو ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ بھی دیا گیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کی خوبی یہ ہے کہ مؤلف نے جہاں سلام بن رزاق کے افسانوں پر کیے گئے تجزیوں کو یکجا کر دیا ہے وہیں مقدمے میں سلام بن رزاق کی شخصیت اور فن سے بھی خوبی کے ساتھ متعارف کرایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سلام بن رزاق کا نام 1970 کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ معتبر اور ممتاز تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس عہد کے افسانہ نگاروں میں بعض کا قلم واماندگی کا شکار ہوگیا اور انھوں نے افسانہ نگاری کو تقریباً ترک کر دیا لیکن بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی لگن، ہمت

اور ریاضت کو بھی ماند پڑنے نہ دیا اس لیے وہ آج بھی افسانوی افق پر تاباں و درخشاں نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی چند افسانہ نگاروں میں سلام بن رزاق کا نام بلا تامل لیا جا سکتا ہے۔"

کتاب کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں مشہور افسانہ نگار سلام بن رزاق کے فن سے متعلق بھرپور معلومات فراہم کی گئی ہے۔ مشہور و معروف ادبا اور پروفیسروں نے ان کے افسانوں کے جامع تجزیے پیش کیے ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے کہانی انجام کار کا بہترین تجزیہ پیش کیا ہے، انھوں نے جہاں کہانی کے ایک ایک جز کو بخوبی اجاگر کیا ہے وہیں سلام بن رزاق کے فنی محاسن اور افسانے کی تکنیک پر بھی کھل کر بات کی ہے۔ ساتھ ہی افسانے سے مثالیں بھی پیش کی ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"سلام کو بیانیہ پر قدرت حاصل ہے اور وہ بے ضرورت لفظ صرف نہیں کرتا۔"

قمر رئیس نے 'ننگی' افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے کردار نگاری سے واقف کرایا ہے۔ وارث علوی نے 'بجوکا' کی معنی خیزی اور تہ داری پر گفتگو کرتے ہوئے شاہکار افسانہ قرار دیا ہے۔ افسانہ 'معبر' سلام بن رزاق کا بہترین افسانہ ہے، جس کا تجزیہ حامدی کاشمیری اور یاسمین محمدی بیگم نے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ یاسمین محمدی بیگم نے جہاں سلام بن رزاق کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے معبر کا تجزیہ کیا ہے وہیں حامدی کاشمیری نے سیدھے طور پر تجزیہ کرتے ہوئے افسانے کے اسلوب پر گفتگو کی ہے۔ مؤلف کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے سلام کے انھی افسانوں کا انتخاب کیا ہے جو سماج کے بہترین عکاس ہیں۔ اسی کڑی کا ایک اہم افسانہ 'زندگی افسانہ نہیں' ہے جس میں افسانہ نگار نے ایک غریب مسلم خاندان کے مسائل سے روشناس کرایا ہے ساتھ ہی ان لوگوں پر بھی طنز کیا ہے جو مذہب کا سہارا لے کر خاندانی کفالت سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ اس افسانے کی خوبی یہ ہے کہ یہ افسانہ آخر تک قاری کو باندھے رکھتا ہے کہیں بھی لہجہ خطیبانہ یا صحافتی نہیں ہوا ہے کافی حد تک قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے لیکن آخر میں قاری کو بڑا جھٹکا لگتا ہے۔ اس افسانے کا تجزیہ اسلم پرویز نے بڑے موثر انداز میں کیا ہے یہاں تجزیہ نگار سیدھے طور پر افسانہ نگار سے مخاطب ہے اور افسانہ پڑھ کر جو اس کی کیفیت ہوتی ہے اس کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ مشہور افسانہ نگار نور الحسنین نے کہانی 'ایک چھوٹی سی کہانی' کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے جدیدیت کا ایک مثالی افسانہ قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ مہدی جعفر (آواز گریہ)، انور قمر واور شمیم خان (چادر)، طارق چھتاری (باہم)، م۔ ناگ (آخری کنگورا) اور قاسم ندیم (کلہاڑی) کے تجزیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ آخر میں شاکر تسنیم نے سبق کہانی کا عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ مجموعی طور پر شاکر تسنیم نے سلام بن رزاق کی افسانہ نگاری پر طلبا کے لیے بھرپور معلومات فراہم کر دی ہے۔ امید ہے کہ طلبا اس کتاب سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔

رباعیات کے چار دیوان

شاعر و ناشر: ڈاکٹر صابر سنبھلی

صفحات: 112، قیمت: 100 روپے، سن اشاعت: 2015

مبصر: جاوید جہاں (جاوید احمد ڈار)

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

رباعی ایک ایسی صنف ہے جو اپنا الگ مزاج رکھتی ہے۔ یہ بے حد نازک فن ہے۔ رشید احمد صدیقی نے غزل کے فن کو ریزہ کاری اور مینا کاری سے تعبیر کیا ہے۔ رباعی کا فن بھی کچھ ایسا ہی ہے، اس لیے کہ غزل یا دوسرے اصناف سخن میں اگر کوئی شعر کسی سبب سے معیار سے گر جائے تو بقیہ اچھے شعر کی خوبیاں اپنی جگہ برقرار رہتی ہیں۔ لیکن رباعی میں اگر کبھی مصرعے (چار مصرعے) مربوط نہ ہوں یا کوئی مصرعہ خراب ہو جائے تو اس کا اثر پوری رباعی پر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل اس فن کے استاد کم ہی مل پاتے ہیں جس کی وجہ سے اس صنف سخن پر کم توجہ دی جا رہی ہے۔ وجہ ظاہر ہے یعنی اس کی فنی پابندیاں۔ لیکن یہ کہنا کہ اب رباعی گوئی کا زمانہ چلا گیا یا کوئی لکھنے والا ہی نہیں، سراسر غلط۔ اس صنف میں طبع آزمائی کرنے والے آج بھی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر صابر سنبھلی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ اردو دنیا میں وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ رباعی جیسی مشکل ترین صنف ان کی رگ رگ میں مچلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کی رباعیوں میں درد اور دور حاضر کی کربناکی کی بازگشت کے ساتھ ساتھ خدا کی برتری و بلندی واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ زبان اور عروض کے بنیادی نکات سے حتی الوسع واقفیت رکھتے ہیں۔ صوفی ماحول میں ان کی تربیت ہوئی۔ صوفی گھرانے میں انھوں نے اپنے شب و روز گزارے لیکن انھوں نے نہ تو عروض دانی کو اپنی شاعری پر حاوی ہونے دیا اور نہ تصوف کو۔ ہاں اپنے شخصی پس منظر کے باعث ان کی رباعیات پر تصوف کا رنگ غالب ہے۔ انھوں نے حمدیہ رباعیات بھی تحریر کی ہیں۔ شہر آشوب کے تحت بھی۔ اخلاقی اور صوفیانہ موضوعات پر بھی انھوں نے اظہار خیال کیا ہے اور حسن و عشق کے موضوعات پر بھی۔ ان کی رباعیاں قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ فن رباعی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انھوں نے نہایت دلکش اور پیاری رباعیاں کہی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'رباعیات کے چار دیوان' بھی انھی موضوعات پر مبنی ہے جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اس کتاب میں نہ صرف ایک دیوان یا دو دیوان ہیں بلکہ چار دیوان ہیں اور چاروں میں شاعر نے نہ صرف خدا کی ذات، ان کی نعمتوں کا شکر بجا لانے اور ان کی بلندی و برتری کا اعتراف کیا ہے بلکہ پامال ہوتی ہوئی انسانیت پر تیر و نشتر بھی چلائے ہیں اور یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ انسانیت ہی دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ دنیا محبت کی آماجگاہ ہے لہٰذا انسان آپسی نفرت، حقارت، بغض و عناد کو ختم کر کے محبت کے راستے پر گامزن ہو جائے۔ اس بات کا اعتراف مصنف نے خود بھی اس مجموعے کے پیش لفظ میں کیا ہے۔

ڈاکٹر صابر سنبھلی کی زیر تبصرہ کتاب چار دواوین پر مشتمل ہے۔ حالانکہ دیوان کا نام سنتے ہی یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ کوئی بڑا دیوان یا کتاب ہوگی لیکن کہتے ہیں کہ دریا کو کوزے میں بھرنا سب سے بڑی بات ہوتی ہے۔ کتاب تو بہرحال ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل ہے اور ان صفحات میں چار دواوین کو سمیٹ لینا، اس سے آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ شاعر نے واقعی دریا کو کوزے میں بھرنے کی کوشش کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے پہلے دیوان میں کل پچپن رباعیاں شامل ہیں۔ جو مختلف موضوعات کی عکاسی کرتی ہیں۔ لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس دیوان میں حمدیہ رباعیات زیادہ ہیں۔ شاعر نے اس بات کا خیال رکھتے ہوئے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی تعریف کا موقع کسی طرح سے بھی ہاتھ سے گنوایا نہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کے دوسرے دیوان میں کل (57) رباعیاں درج ہیں۔ پہلے دیوان کی طرح اس دیوان میں بھی مختلف موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ البتہ اس دیوان میں حمدیہ رباعیات کے ساتھ ساتھ کچھ اخلاقی اور مذہبی رباعیات بھی شامل ہیں۔ مثال کے لیے دیوان دوم کی پہلی رباعی:

اللہ ہے تو! نام ہے تیرا اعلیٰ — اول بھی تجھے کہتا ہے عالم سارا
بندے ہیں تیرے آس لگائے تجھ سے — محتاج ہیں سب تیرے ہی، تو ہے مولیٰ!

اور پھر اسی دیوان کی آخری رباعی کا یہ اختتام شاعر کی ذاتی سوجھ بوجھ کا پتہ دیتا ہے:

اے بھائی بہت سوچ کے کر جو بھی کرے — ہوتا ہے یہاں "کوئی کرے کوئی بھرے"
انسان کو لازم ہے کہیں پر بھی ہو — اللہ تعالیٰ سے بہرحال ڈرے

زیر تبصرہ کتاب کے دیوان سوم میں کل (63) رباعیاں ہیں جن میں شاعر نے اچھے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے۔ البتہ کہیں کہیں عشق حقیقی کے موضوعات کو بھی شاعر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ دیوان چہارم میں کل (64) رباعیاں ہیں۔ اس دیوان میں بھی پہلے دوسرے اور تیسرے دیوان کی طرح شاعر نے محمود شاہ کے نغمے بکھیرے ہیں۔ کہیں کہیں معاشرے میں پھیلی بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کو طشت از بام کرنے کی کوشش کی ہے اور آخر میں شاعر نے علامہ سحر عشق آبادی کے وضع کردہ (12) اوزان میں تین رباعیات کی بحر واضح کر کے نظم کی ہیں جو شاعر کی ذہنی صلاحیت کی غماز ہیں۔

مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر صابر سنبھلی کو خدا نے وہبی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

ان کا پہلا مجموعہ 'دواوین رباعیات' کے نام سے منظر عام پر بہت پہلے آچکا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ان کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں کل ملا کر (252) رباعیات شامل ہیں۔

'پیش اظہار' کے عنوان سے شاعر نے پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ شاعر موصوف کا کلام خود ان کی کامیابی کا ضامن ہے۔ ان کی وسعت اس کے موضوعات میں پنہاں ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے بے شمار الفاظ وتراکیب کا استعمال ان کو ایک کامیاب شاعر کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ان کی شاعری سے ان کے واردات قلبی، غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں کی بھی بے شمار پرتیں کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مکاشفات

مصنف: شاہد رشید

صفحات: 216، قیمت: 120 روپے، سنہ اشاعت 2014

ناشر: محمد عثمان نیت احمد مسرت نگر کے پاس لائٹ ساؤتھ پور دانا گنج

مبصر: ڈاکٹر زیبا ناز، بنگش پارہ شاہ صفا مراد آباد 244001

بنی نوع انسان کو ہر لحظہ اپنی ذات اور کائنات سے متعلق امور کی دریافت اور انکشافات کا ذوق کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ یہی احساس انسان اور حیوان میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ انکشاف ذات کے مختلف مراحل سے گزر کر یہ کائنات کی جانب رخ کرتا ہے اور پھر ماورائے کائنات کی جانب ذہن کو مبذول کرتا ہے اور قدرت کے گوناگوں اسرار ورموز کی پردہ کشائی کر کے پورے نظام پر قادر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

شاہد رشید کی 'مکاشفات' کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوا کہ تمام ہی مضامین بہت عمدہ ہیں جو سائنسی شواہد اور دلائل کے ساتھ قلم بند کیے گئے ہیں اور ان مضامین کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ سائنسی ہوتے ہوئے ادب اور مذہب کی چاشنی سے لبریز ہیں۔ یہی مضامین مختصر اور جامع ہیں۔ ایک مضمون کو ایک ہی نشست میں نہایت مسرت اور بھرپور تاثر کے ساتھ مکمل کیا جا سکتا ہے۔

شاہد رشید نے کتاب میں شامل مضامین کو سائنسی اصطلاحات کی بھرمار کر کے گراں بار ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں پڑھتے وقت کسی قسم کی اکتاہٹ نہیں ہوتی اور دلچسپی کے ساتھ ہم اپنی معلومات میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے مضامین میں حالات حاضرہ سے آگاہی بھی ہے اور روایت کی پاسداری بھی ان کے یہاں ایک بڑی خوبی یہ بھی نظر آتی ہے کہ انھوں نے قرآن کریم کی روشنی میں نئی تحقیق اور سائنسی حقائق کو ثابت کیا۔

شیخ سعدی کی کہانی کو جس لطیف انداز سے پیش کیا ہے اس سے عبارت میں معنویت کے ساتھ برجستگی بھی پیدا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے واقعات اور اشعار کے برمحل استعمال اور ساتھ ہی فارسی، عربی الفاظ وتراکیب اور محاوروں نے عبارت کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ مضامین کے عنوانات کا انتخاب بھی سوچ سمجھ کر کیا

ہے۔ جیسے 'دل سنبھال کے' اس میں صداقت کے ساتھ ظرافت بھی ہے۔ ہر مضمون میں ضروری اور مختصر گفتگو کی گئی ہے مثلاً آلودگی، آلودگی پیدا ہونے کی وجوہات، آلودگی سے صحت انسانی کا متاثر ہونا، اس کے منفی اثرات یا مضرات وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے آلودگی پر قابو پانے کے طریقے بھی سمجھائے۔ مختصر مضمون میں سب کچھ شامل کر دینا سمندر کو کوزے میں بھرنے سے کم نہیں۔ مگر میں 'قاتل' مضمون بھی بہت اچھا ہے اسے پڑھنے کے بعد گھریلو عورتوں کو غیر صحت مند اشیا سے ہونے والے نقصانات کے بارے میں معلومات ہوگی۔

وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ ہر شخص کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ علم بہر حال کار آمد ہوتا ہے۔ زلزلہ، سونامی، طوفان وغیرہ قدرتی آفات سے ہم بچاؤ کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو سکتے ہیں۔

عظیم سائنس داں جابر ابن حیان، رامانجن، بھابھا، میڈم کیوری، ہاکنگ، ابوالکلام آزاد، ہنری فورڈ اور ارشمیدس وغیرہ کی تصاویر، مختصر تعارف اور ایجادات کی اہم جانکاری کہانی کے انداز میں تحریر کر کے اہل ذوق کو تسکین کا سامان فراہم کرتے ہوئے طالب علموں کی معلومات میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد کی سائنسی فکر کو جان کر بہت مسرت ہوئی کیونکہ مولانا کی دیگر صلاحیتوں کا ذکر اس کثرت سے کیا جاتا ہے کہ ان کا سائنسی رجحان بالکل دب کر رہ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے بچے یہ نہیں جان پاتے کہ مولانا کے ذہن میں ایک خانہ سائنسی فکر کے لیے مخصوص تھا۔

کتاب کے بعض گوشے ہمیں کچھ نہ کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اور دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔ زبان صاف شستہ اور برجستہ ہے۔ جیسے کہانیوں، حکایتوں، شعروں، محاوروں، ترکیبوں کے برمحل اور برجستہ استعمال نے چار چاند لگا دیے ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کی تصنیف میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ زبان نہایت عام فہم ہو۔ امید ہے کہ اسے ہر طبقے میں سراہا جائے گا۔

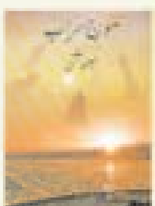

موج سراب

مصنفہ: مینو بخشی

صفحات: 147، قیمت: 200 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: رحمت یونس، 219 گنگا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

مینو بخشی فطری طور پر عشق ومحبت کی شاعرہ ہیں اور جہاں شاعری کا محور عشق ہو تو معاملہ دل آزاری، چوٹ، کسک، درد، ہجر، بے وفائی اور تشنگی جیسے موضوعات کو گرفت میں لے لیتا ہے۔ مینو بخشی کی شاعری بھی انھیں موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ ایک خاتون اپنے محبوب کو مرکزی خیال بنا کر اپنے جذبات واحساسات کو غزل کے پیکر میں ڈھالنا چاہتی ہے۔ فہمیدہ ریاض سے لے کر پروین شاکر تک یہ سلسلہ قائم ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورت آخر کہنا کیا چاہتی ہے؟ شاید وہ اپنا دکھ درد، رنج والم، عاشق کے مکر وفریب، محبوب سے رقابت، اس سے بچھڑنے کے کرب کو ظاہر کرنا چاہتی ہے۔

الغرض دل کے اندر جو ہلچل مچ رہی ہے، جو ہنگامہ آرائی ہے اور جو طوفان برپا ہے، جذبات واحساسات کی تیز آندھی چل رہی ہے اس کا باہر آنا لازمی ہے۔ فطری شاعری کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اس بہاؤ کو روکا نہ جائے۔ مینو بخشی اس تقاضے کو پورا کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ وہ زندگی کی شکست وریخت سے واقف ہیں اور ان کا پہلا مجموعہ 'تشنگی' کے عنوان سے منظر عام پر آچکا ہے۔ اپنے پہلے مجموعے سے جس طمطراق کے

ساتھ انھوں نے اردو شاعری کے دشت میں قدم رکھا اور اپنی تشنگی کا اظہار کیا وہ ان کی فکر، مزاج اور ادب دلچسپی کا اشاریہ ہے۔ اپنی تشنگی بجھانے کی کوشش میں وہ 'موج سراب' تک پہنچ جاتی ہیں اور یہ دوسرا مجموعہ ان کی فکر کو وسعت عطا کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں کچھ الفاظ کئی بار استعمال ہوئے ہیں جیسے سورج، چراغ، چاند، تیرگی، نور، جنار، جو شاعرہ کی داخلی روح کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان کی شاعری کو علامتی بنانے کے ساتھ ساتھ اردو کی کلاسیکی شعری روایت سے قریب کرتے ہیں۔ آئیے چند اشعار کے حوالے سے ان کی اس جذباتی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

ماحول سرد سرد ہے کیوں شہر عشق کا　　اک دوسرے پہ مرنے کے جذبے کو کیا ہوا
زندگی میں یہ کیا حادثہ ہو گیا　　جس کو چاہا وہی غیر کا ہو گیا

اب آئیے مینو بخشی نے شاعری کے کینوس پر جو مختلف رنگوں کو بھرنے کی کوشش کی ہے ان رنگوں کا جائزہ لیں۔

پیار، خلوص و سادگی:

کیوں عداوت پہ تری ہو نہ محبت کا گماں　　یہ عداوت بھی تری جب ہے محبت جیسی

تشنگی و مایوسی:

رہ گئی اب کے مرے دل ہی میں امید وصال　　اب ملال شب فرقت کے سوا کچھ بھی نہیں

کشمکش حیات:

ترا غم بھی پیارا، تیری دنیا بھی پیاری　　عجب کشمکش میں میری زندگی ہے

طنز:

مرے دل میں اب درد اٹھنے لگا　　محبت تری رنگ لانے لگی

عزم و حوصلہ:

تجھ کو دیا ہو اگر ظلمت ہجراں کو شکست　　شمع بجھ جائے مگر دل نہ بجھائے رکھنا

ندرت خیالی و معنوی تہہ داری:

دل ہے کہ بہلتا ہی نہیں ہے کسی صورت　　رکھ جاتا ہے وہ روز کھلونا مرے آگے
قصۂ تیرگی سنتے سنتے یہاں　　روشنی کے پجاروں کو نیند آ گئی

دنیا کی بے اعتنائی اور بے ثباتی:

بیٹھی ہوئی ہوں سب سے الگ آج اس طرح
جیسے کہ کائنات سے روٹھی ہوئی ہوں میں

مختصر یہ کہ مینو بخشی نے زندگی کی مختلف جہات سے گفتگو کی ہے اور زندگی کو زندگی کی طرح دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ شاعری کے افق پر ان کی آمد شاعرات کی کہکشاں میں ایک ستارے کا اضافہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کے اس شعری مجموعے کا اردو دنیا میں خیر مقدم کیا جائے گا۔

ادب امکان

مصنف: ابرار احمد اجراوی
صفحات: 232، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: دسمبر 2014
ناشر: مہتاب پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی
مبصر: غلام نبی کمار، ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی

'ادب امکان' دور جدید کے ایک جواں سال محقق، ابرار احمد اجراوی کے پچیس مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین بقول مصنف: "رنج والم اور خوشی و مسرت کی مختلف شام و سحر میں لکھے گئے ہیں۔" عمومی روش سے احتراز کرتے ہوئے، مشمولات کا عنوان بجائے فہرست کے 'برگ گل' اور مقدمہ کا 'قصہ مختصر' رکھا ہے۔ جو ان کی تخلیقی جدت کا عکاس ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کو 5 ذیلی عنوانات: ادبیات، شعریات، نثریات، ابلاغیات اور شخصیات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ ادبیات میں 8 مضامین، حصہ شعریات میں 7 مضامین، حصہ نثریات میں 3 مضامین، حصہ ابلاغیات میں 3 مضامین اور حصہ شخصیات میں 4 مضامین کا اندراج ہے۔

'ادب امکان' کے پہلے حصے ادبیات میں 'ادبی مزاحمت: تصور و تناظر'، 'نقش حیات: ادبی نگار خانے میں'، 'خطوط غالب: چند ادبی مباحث'، 'اردو زبان کی توسیع میں ریشمی رومال تحریک کا کردار'، 'افلاطون اور ارسطو کا نظریہ نقل: تقابل اور تجزیہ'، 'عربی زبان و ادب میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت'، 'اعلیٰ تحقیق و تنقید کے مختلف مدارج' اور 'ادب اطفال: عصری حسیت سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت' جیسے مفید مطلب موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ کتاب کا پہلا مضمون 'ادبی مزاحمت: تصور و تناظر' کے عنوان سے سپرد قرطاس کیا گیا ہے۔ مضمون کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ مصنف نے یہ مضمون پروفیسر ارتضیٰ کریم کی مرتبہ کتاب 'اردو ادب: احتجاج اور مزاحمت کے رویے' سے متاثر ہو کر لکھا ہے اور اس سے کافی مواد اخذ کیا ہے۔ مصنف کا یہ مضمون بڑا افادی ہے، جس میں احتجاج اور مزاحمت کو ہم معنی بتایا گیا ہے، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ادب اور احتجاج کا باہمی رشتہ بڑا گہرا رہا ہے۔ ادب تخلیق کرنا بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے، مزاحمتی عناصر کی آمیزش کسی بھی تخلیق کی آفاقیت اور اس کی ہمہ گیریت میں اضافے کا باعث بنتی ہے لیکن ہر مزاحمتی تخلیق ادبی شہ پارے کا درجہ اختیار نہیں کر پاتی۔ جب تک احتجاج اور مزاحمتی تخلیق کو جمالیاتی لطافت کی آنچ نہ دی جائے، تب تک وہ ادبی مقام و مرتبے سے فروتر رہتی ہے۔ اردو ادب میں قدیم عہد سے ہی ادبی پیرایے میں احتجاج اور مزاحمت کی روایت ملتی ہے۔ نثر ہو یا شاعری دونوں اصناف میں اس کے نمانمونے ملتے ہیں۔ نثر میں کرشن چندر، عصمت اور منٹو جبکہ شاعری میں جعفر زٹلی، سودا، میر، اکبر، اقبال کے کلام سے ادبی احتجاج کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ ترقی پسند شعرا جوش، فیض، مجروح، علی سردار جعفری وغیرہ کی نظموں میں احتجاج کو بنیادی طور پر برتا گیا ہے۔ 'نقش حیات: ادبی نگار خانے میں' مصنف نے 'نقش حیات' کو مشہور اہل علم و قلم حضرات کے نزدیک مسلمہ خود نوشت نگاری کے مقررہ پیمانے کی عینک سے دیکھا ہے اور خود نوشتوں کے انبوہ میں اس کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی منصفانہ کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عظیم مجاہد آزادی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی خود نوشت 'نقش حیات' صرف مضامین و مشمولات کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی بحث و تحقیق کا موضوع بن سکتی ہے۔ مصنف نے مضمون 'خطوط غالب: چند ادبی مباحث' میں غالب کے خطوط کو مکالماتی انداز، افسانوی انداز، جزئیات نگاری، اثر آفرینی، القاب و آداب سے گریز اور ظرافت و خوش طبعی، ذو معنی الفاظ وغیرہ جیسی چند اہم فنی اصطلاحات کے تناظر میں پرکھنے کی جاندار کوشش کی ہے۔ 'اردو زبان کی توسیع میں ریشمی رومال تحریک کا کردار' ایک بے حد دلچسپ مضمون ہے۔ ریشمی رومال تحریک کا پورا خاکہ اور منظر نامہ آنکھوں میں رقص کرنے لگتا ہے۔ حصہ ادبیات میں شامل دیگر موضوعات افلاطون اور ارسطو کا نظریہ نقل، اعلیٰ تحقیق و تنقید اور ادب اطفال وغیرہ سے متعلق ہے۔ جو کہ یونیورسٹی سطح پر بھی شامل نصاب ہے۔

حصہ شعریات میں 'علامہ اقبال کی رومان پسندی: مشابہتیں اور تضادات'، 'غزلیہ تنقید: محاکمہ اور محاسبہ'، 'دبستان دلی: کل اور آج'، 'شاعر اسلام علامہ اقبال کا عشق رسول'، 'احتجاج اور مزاحمت کا شاعر: فیض احمد فیض'، 'اردو شاعری کا جمہوری کردار'، 'جدید عربی شاعری میں احتجاج اور مزاحمت کی نوعیت' کے عنوان سے 7 مضامین شامل ہیں۔ علامہ اقبال پر مرتب اشاریوں کا پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال پر اب تک ڈھائی ہزار سے زائد

تنقیدی مقالے اور ہزاروں کی تعداد میں مضامین لکھے گئے ہیں جن میں مصنف کے دو مضامین بھی اضافے کا باعث بنے ہیں۔ ایک مضمون میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "رومانیت کے دو عنصر جذبہ اور وجدان کی علامہ اقبال کی شاعری میں اتنی جلوہ گری ہے کہ اگر ان بنیادوں پر انھیں صرف رومانی شاعر کا لقب دیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں، لیکن ان کا شعری آرٹ اتنا ہمہ گیر ہے کہ انھیں کلاسیک یا رومان میں سے کسی ایک خانے میں رکھ دینا اور کوئی خاص لیبل لگا دینا ادبی ناانصافی ہوگی۔" وہیں دوسرے مضمون میں علامہ کی عشقِ رسولؐ پر مربوط گفتگو ہے۔

مذکورہ بالا حصے میں درج ایک مضمون فیض کی احتجاجی اور مزاحمتی شاعری کے پس منظر سے لے کر عروج تک کا احوال بیان کرتا ہے۔ یہ مضمون فیض کی احتجاجی شاعری کا آئینہ ہے۔ رومانی نظموں اور جذبات کو مسحور کرنے والی غزلوں کے اشعار کا انتخاب حوالوں کے طور پر کیا گیا ہے۔ جس سے فیض کی ظلم و جبر کے خلاف قلمی لڑائی، مزدور و مفلس طبقے کی نمائندگی، اور مستحق کو ان کی اجرت دلانے کے لیے عمر بھر کوشاں رہنا ان سارے واقعات کو ایک مضمون میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ اسی موضوع سے مناسبت اور مطابقت رکھنے والا ایک اور مضمون جدید عربی شاعری میں احتجاج اور مزاحمت کی نوعیت پر لکھا گیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کن اسباب کی بنیاد پر عربی شعرا کی شاعری احتجاجی اور مزاحمتی شاعری کا رخ اختیار کر گئی۔ حصہ شعریات میں شامل دیگر مضامین بھی داد و تحسین کے قابل ہیں۔

حصہ نثریات میں مصنف کے تین مضامین 'منٹو کے افسانوں میں تقسیم ہند کا کرب'، 'مولانا عبدالماجد دریابادی کی تبصرہ نگاری' اور 'ساجد رشید کی طنز پچھتی علمی و ادبی لطیفے' کے عنوان سے ہیں۔ منٹو پر لکھے گئے مذکورہ مضمون میں مصنف نے لکھا ہے کہ "اگرچہ تقسیم ہند کے موضوع پر ابھی تک بے شمار افسانے لکھے گئے ہیں تاہم منٹو کے افسانے ان تمام افسانوں میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ جو انسان دوستی پچھلی نظریات اور جبر و تشدد کی زبردست مذمت کی وجہ سے نمایاں اور ایسی جمالیات کو انسانی احساسات کا حصہ بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔" باقی مضامین بھی کارآمد ہیں۔ حصہ ابلاغیات میں مصنف کے 3 مضامین 'ترسیل و ابلاغ کا عمل اور تشکیل کا انتخاب'، 'عوامی ترسیل کی زبان: حدود اور تقاضے' اور 'الیکٹرانک میڈیا اور امن' کو ذرا دیکھیے سے متعلق ہے۔ مذکورہ مضامین ذرائع ابلاغ کی اہمیت، معاشرے کی بقا اور تعمیر و ترقی میں ترسیل و ابلاغ کا رول، ذرائع ابلاغ کے اجزائے ترکیبی، ذرائع ابلاغ میں عوامی ترسیل کو شہ رگ کی حیثیت، اور دورِ جدید میں ذرائع ابلاغ میں الیکٹرانک میڈیا کا حیران کن رول وغیرہ جیسے خیالات کا نچوڑ ہے۔ حصہ شخصیات میں 4 مضامین شامل ہیں جس میں 'مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور اردو'، 'تحقیقی تنقید کی آبرو: حقانی القاسمی'، 'عربی اردو ترجمہ نگاری کا امام: ڈاکٹر شمس کمال انجم'، اور 'ماضی، حال اور مستقبل کا شاعر: مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی' پر لکھے گئے مضامین کا اندراج ہے۔ مذکورہ مضامین میں مصنف کتاب ان چاروں ادیبوں اور شاعروں کی شخصیت کے ساتھ ان کی مجموعی ادبی خدمات کو بھی بے حد عمدہ طریقے سے نمایاں کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے شخصیات پر مضامین لکھنے میں مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لیا ہے۔ اکثر مضامین کے آخر میں متعلقہ مضامین کے حوالے بھی دیے ہیں۔

الغرض پوری کتاب اردو زبان و ادب کے اہم موضوعات کا گہوارہ ہے۔ مضامین کی زبان صاف، سلیس اور شستہ ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب نصابی ضرورت کی تکمیل میں بھی معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

فکرِ انقلاب (حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نمبر)

ایڈیٹر: احسن مہتاب

جلد: 03، شمارہ: 71، صفحات: 704، قیمت: 400 روپے

ناشر: آل انڈیا تنظیم علمائے حق، 25Q، احمد سعید ملکہ، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: عادل اختر انصاری، کریم گنج، روڈ نمبر 2، گیا (بہار)

آل انڈیا تنظیم علمائے حق نئی دہلی نے اکابر شناسی کے سلسلے کے تحت 'محسن تقویم اور فکرِ انقلاب' کے کچھ ایسے شمارے شائع کیے ہیں جن کا تعلق ان اشخاص اور افکار سے ہے جن سے نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کو بھی نئی روشنی ملی ہے۔ خاص طور پر سلسلہ دیوبند کی اہم شخصیات پر 'فکرِ انقلاب' کے ضخیم شمارے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں جن میں علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الحدیث زکریا کاندھلوی، انظر شاہ کشمیری وغیرہ پر خصوصی شمارے قابلِ ذکر ہیں۔ زیرِ تبصرہ خصوصی شمارہ بھی ایک ایسی شخصیت سے متعلق ہے جس نے نہ صرف تعلیمی تحریک کو نیا تحرک دیا بلکہ جس کی ذات سے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو بھی ایک نئی سمت ملی۔ اس شخصیت کا نام مولانا محمد قاسم نانوتوی ہے جو دیوبند جیسی عظیم تعلیمی تحریک کے بنیاد گزاروں میں سے ایک ہیں۔ وہ ایک متبحر عالم دین تھے جنھوں نے دیوبند جیسے مدرسے کی تاسیس میں اہم کردار ادا کیا اور اس ادارے کے لیے اصولِ ہشت گانہ مرتب کیے۔ دیوبند کو جو مرکزیت اور مرجعیت نصیب ہے اس میں مولانا قاسم نانوتوی کا حصہ بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے مختلف سطحوں پر بہت سے اہم کام انجام دیے۔ تحریکِ آزادی سے سرگرم رشتے کے باوجود تصنیف و تالیف سے بھی ان کا تعلق بہت گہرا رہا ہے۔ آبِ حیات، قبلہ نما، حجۃ الاسلام، تقریر دل پذیر، اسرار قرآنی، ان کی اہم تصنیفات ہیں۔ ان کی شخصیت بڑی متنوع تھی۔ ان کے معاصر سر سید احمد خاں نے لکھا تھا کہ "وہ اس دنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز سے کم ہو ورنہ ان تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی، نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحٰق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا۔ وہ در حقیقت فرشتہ صفت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے۔"

704 صفحات پر محیط 'فکرِ انقلاب' کا یہ ضخیم شمارہ اسی ممتاز شخصیت کے متنوع صفات اور کمالات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں تقریباً 42 تحریریں ہیں جن میں مولانا قاسم نانوتوی کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور ان کے کارناموں کا مختلف جہتوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ زیادہ تر مضامین معتبر علما اور معتقد مشاہیر کی ہیں۔ ان میں مولانا انظر شاہ کشمیری، قاری محمد طیب قاسمی، سعید الرحمن اعظمی، عمید الزماں کیرانوی، اسیر ادروی، ابو القاسم نعمانی، بدر الحسن قاسمی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ان مضامین میں 1857 اور تحریک دیوبند کے حوالے سے بہت مربوط گفتگو کی گئی ہے اور مولانا قاسم نانوتوی کو اس ضمن میں ایک مرکز و محور کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ تمام مضامین اس اعتبار سے اہم ہیں کہ ان سے صرف تحریک دیوبند کی اہمیت اور معنویت سامنے نہیں آتی بلکہ جدوجہد آزادی کا پورا منظرنامہ بھی نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ یہ مولانا قاسم نانوتوی کے حوالے سے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تحریکات کو سمجھنے کی بھی کوشش ہے۔ 'فکرِ انقلاب' کے مدیران مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے فراموش کاری کے اس عہد میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کو نئی نسل سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے اور ان کے تعلیمی، مذہبی اور سیاسی افکار کے حوالے سے فکر انگیز تحریریں شامل کی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس ضخیم شمارے سے مولانا کی مکمل شخصیت اس نسل کے سامنے آ جائے گی جو ہمارے اسلاف اور اکابر کی تاریخ سے ناواقف ہے۔

عالمی اردو نامہ

قطر کے قومی دن کے موقعے پر دوحہ میں ہند-پاک مشاعرہ

دوحہ: اسلامی مملکت قطر کے قومی دن کے موقعے

پر انڈیا اردو سوسائٹی قطر کے زیر اہتمام دوحہ میں ایک ہند-پاک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر وسیم بریلوی نے کی، جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر راحت اندوری اور اردو اکادمی، دہلی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے شرکت کی۔ مشاعرے کی نظامت ابرار کاشف نے کی۔ مشاعرہ میں مہمان اعزازی کی حیثیت سے حکومت قطر کے سکریٹری برائے وزارت و ثقافت و فنون موسیٰ زین الموسیٰ نے افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ حکومت قطر میں لاکھوں ہندوستانیوں کی موجودگی اس بات کی علامت ہے کہ ہندوستان کے ہر اس شخص کو جو اپنے وطن عزیز کو چھوڑ کر یہاں مقیم ہے، قطر کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر صدر انجمن عتیق انظر نے سوسائٹی کی رپورٹ پیش کی۔ سوسائٹی کے جنرل سکریٹری محمد شاہد خان نے مہمانوں، سامعین اور شعرا کا استقبال کیا۔ انھوں نے کہا کہ قطر میں رہ کر اردو کا کام کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، لیکن اردو کی بقا و ترقی کے لیے ہمیں کام کرتے رہنا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر وسیم بریلوی، ڈاکٹر راحت اندوری اور ڈاکٹر ماجد دیوبندی کا پھول اور شال پیش کر کے استقبال کیا گیا۔ شاعر خلیج اور انڈیا اردو سوسائٹی کے سرپرست جلیل نظامی نے نعت پاک سے مشاعرے کا آغاز کیا۔ جن اہم شعرا نے اپنا کلام پیش کیا، ان میں پاکستان سے عباس تابش، ہندوستان سے وسیم بریلوی، راحت اندوری، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، تابش مہدی، حسن کاظمی، سہیل عثمانی، مہتاب عالم، شاداب بے دھڑک، ابرار کاشف، تسنیم کہت اور ترنم ریاض کے علاوہ قطر میں مقیم شعرا عتیق انظر، جلیل نظامی، شاد آکولوی، افتخار راغب اور راشد عالم کے نام شامل ہیں۔ مشاعرہ دیر رات تک جاری رہا۔ مشاعرے کی کامیابی میں محمد کاشم علی حسین الخضیری، منہاج الدین، ابوصدر احمد، حبیب رحمٰن، محمد اسلم خان، سید رفیع الدین، راشد عالم، محمد شعیب اور نقاشہ صدیقی کا اہم رول رہا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، 20 دسمبر 2015

تہران میں 'حلقۂ احباب اردو' کا قیام

تہران: ایران کے دارالحکومت تہران میں 'حلقۂ احباب اردو تہران' نے اپنی پہلی نشست کا انعقاد کیا۔ اس نشست

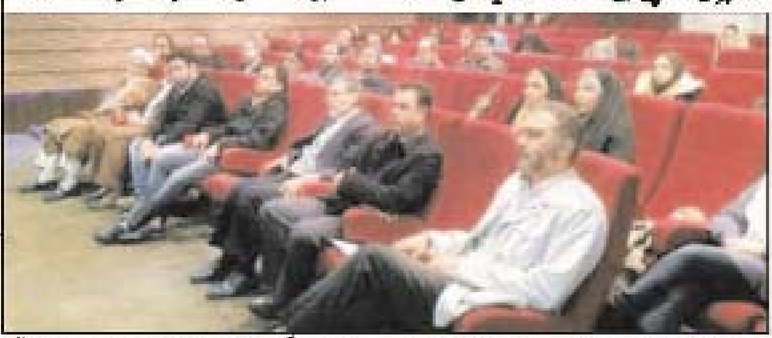

کا موضوع 'اردو ادب میں نعت کا مقام' تھا۔ نشست کا آغاز ڈاکٹر وصالی نے تلاوت قرآن مجید سے کیا اور اس کے بعد انور زہیب شاہین نے نعت رسول مقبول پڑھی۔ اس موقعے پر تہران یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر وفا یزدان منش نے منتخب موضوع پر ایک عمدہ مقالہ پڑھا۔ نشست میں پاکستان کے معروف شاعر اور ای سی او کے ثقافتی شعبے کے سربراہ پروفیسر افتخار حسین عارف اور تہران جلدیہ کے ایک اعلیٰ عہدے دار ڈاکٹر سید عبداللہ حسینی نے مذکورہ موضوع پر مفید اور معلوماتی تقاریر کیں۔ اس سے پہلے تہران یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر علی بیات نے 'حلقۂ احباب اردو تہران' کے قیام اور اس کی مجلس عاملہ کے اراکین کے ناموں کا اعلان کیا۔ اعلان کے مطابق پروفیسر افتخار حسین عارف 'حلقۂ احباب اردو تہران' کے سرپرست ہوں گے اور ڈاکٹر علی بیات صدر ہوں گے۔ اس انجمن کے تین نائب صدور ڈاکٹر محمد کیومرثی (تہران یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر)، ڈاکٹر محمد حسین تبکی اور سید مصطفیٰ زیدی ہوں گے، جبکہ ڈاکٹر راشد نقوی کو جنرل سکریٹری کے عہدے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وفا یزدان منش معاون جنرل سکریٹری، ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی سکریٹری نشر و اشاعت، ڈاکٹر معصومہ غلامی معاون سکریٹری نشر و اشاعت اور ڈاکٹر علی کاوسی نژاد کو آرڈی نیٹر چنا گیا ہے۔ اس نشست میں اعلان کیا گیا کہ حلقۂ احباب اردو تہران کی طرف سے اردو ادب سے متعلق موضوعات پر ماہانہ نشست کا اہتمام کیا جائے گا۔ آخر میں 'حلقۂ احباب اردو تہران' کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر راشد نقوی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس نشست میں تہران میں مقیم ہندوستانی اور پاکستانی خواتین و حضرات کے علاوہ اردو دوست ایرانیوں کی بھی ایک تعداد موجود تھی۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 13 جنوری 2016

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

ادبی کیلنڈر قومی اردو کونسل کا قابل ستائش کارنامہ: اسمرتی ایرانی

کونسل کے ادبی کیلنڈر کا اجرا

نئی دہلی: محترمہ اسمرتی ایرانی مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند نے قومی اردو کونسل کے ادبی کیلنڈر 2016 کا شاستری بھون میں اجرا کرتے ہوئے اس کی اشاعت پر اظہار مسرت کیا اور قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم اور دیگر اراکین کو مبارکباد دی۔ انھوں نے اس ادبی کیلنڈر کو کونسل کا ایک اہم کارنامہ قرار دیا اور کہا کہ ایسا کیلنڈر ہے جو یونیورسٹیز کے تمام اردو شعبہ جات اور حکومت کے ان محکموں تک بھی پہنچنا چاہیے جہاں اردو سے تعلق رکھنے والے افراد موجود ہیں۔ محترمہ اسمرتی ایرانی نے کیلنڈر کی خوبصورتی اور اس کی افادیت و معنویت کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ صرف کیلنڈر نہیں ایک ایسا نگارخانہ ہے، جس میں ہم اپنے ملک ہندستان کی تمام بڑی ادبی شخصیات کی نادر و نایاب تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ قومی اردو کونسل کا یہ ادبی کیلنڈر کئی صدیوں کا سنگم ہے، جس میں اٹھارہویں صدی سے بیسویں صدی تک کی نابغۂ عصر شخصیات کی تصویروں کے ساتھ ان کی پیدائش و وفات کی تاریخیں بھی درج ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل ہندستان کی ادبی و ثقافتی وراثت کے تحفظ اور اردو کے محسنوں اور معماروں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک با تصویر سوانحی البم بھی تیار کرنا چاہتی ہے۔ یہ کیلنڈر اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

کیلنڈر کے اجرا کی تقریب میں کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) کمل سنگھ کے علاوہ دیگر شخصیات بھی موجود تھیں۔

مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل محترمہ اسمرتی ایرانی کیلنڈر کا اجرا کرتے ہوئے

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 19 جنوری 2016

عربی زبان اردو کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے: پروفیسر ارتضیٰ کریم

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں عربی زبان و ادب کے پروفیسر نعمان خاں کی صدارت میں عربی زبان پینل کی میٹنگ منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ یہ افسوسناک بات ہے کہ اتنے طویل وقفے کے بعد میٹنگ بلائی گئی ہے۔ کونسل چاہتی ہے کہ اب ہر پینل کی میٹنگ 3 ماہ میں ایک بار کی جائے تاکہ اس میں فعالیت لائی جاسکے اور ہم اپنے ہدف کو پانے میں کامیاب ہو سکیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ قومی اردو کونسل کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ اردو زبان کے دائرے کو وسیع تر کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ زبانوں کو شامل کیا جائے۔ اردو اور عربی کا رشتہ ناگزیر ہے، ہم اسے نظر انداز نہیں کرسکتے۔ اردو زبان کے لیے عربی زبان کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ آج کی میٹنگ میں کمیٹی نے یہ طے کیا کہ اردو زبان میں عربی ادب کے حوالے سے ہندستان میں جو کام اب تک ہو چکا ہے اسے کتابی شکل میں منظر عام پر لایا جائے۔

آج کی اس میٹنگ میں جناب احتشام عابدی، پروفیسر نعمان خان، پروفیسر حسین اختر، ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی، ڈاکٹر مشیر حسین صدیقی، مولانا علاء الدین ندوی، مولانا صہیب قاسمی کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، جناب فیروز عالم، محترمہ آسیہ عارف کے علاوہ ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 جنوری 2016

عربی زبان پینل کی میٹنگ کا منظر

سائنسی موضوعات کی کتابوں کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی جائے گی

لائف سائنس اور ماحولیات پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: قومی اردو کونسل عصری سائنسی موضوعات کو ترجیحی طور پر اپنے اشاعتی منصوبے میں شامل کرے گی اور سائنسی کتابوں کے اردو ترجمے کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دے گی۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے لائف سائنس اور ماحولیات پینل کی میٹنگ میں کیا۔ انھوں نے مزید یہ کہا کہ قومی اردو کونسل حکومت ہند کا ایک چھوٹا ادارہ ہے لیکن اس کے ارادے بہت بڑے ہیں۔ کونسل صرف اردو ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں کے اہم علوم وفنون اور ادبیات کے حوالے سے بھی کام کرتی رہی ہے۔ کونسل سائنس سے متعلق 70 سے زائد کتابیں شائع کر چکی ہے۔ اس موقعے پر لائف سائنس اور ماحولیات پینل کے صدر پروفیسر اقتدار حسین نے سائنسی اور علمی موضوعات پر کونسل کی شائع کردہ کتابوں کی ستائش کی اور یہ کہا کہ آج کے تناظر میں سیل فون، اینٹی بایوٹک ڈرگس کے غلط استعمال، ماحولیات، ڈی این اے جیسے اہم موضوعات پر زیادہ توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔

کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے ممبران سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سائنس سے متعلق اہم موضوعات پر کتابوں کی اشاعت کی شدید ضرورت ہے تاکہ عام قاری بھی اس سے استفادہ کرسکے۔ پینل کے رکن رفیع الدین ناصر نے اس موقعے پر یہ تجویز پیش کی کہ ای ٹی وی اردو پر کونسل کے پروگرام میں سائنسی موضوعات کے لیے بھی کچھ وقت مختص کیا جائے۔

میٹنگ میں پروفیسر اقتدار حسین، ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی، ڈاکٹر رفیع الدین ناصر، ڈاکٹر تسنیم فاطمہ، جناب عبدالقادر، ملاباری، کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اکیڈمک اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب فیروز عالم، ذیشان فاطمہ، ڈاکٹر شاہد اختر انصاری اور محمد طاہر نے شرکت کی۔

لائف سائنس اور ماحولیات پینل کی میٹنگ کا منظر

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 7 جنوری 2016

عبدالرافع اردو صحافت کا روشن چراغ تھے: پروفیسر ارتضیٰ کریم

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو کے معروف صحافی سید عبدالرافع کے انتقال پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ان کی رحلت صرف بہار نہیں بلکہ پورے برصغیر کی معتبر اردو صحافت کا بڑا خسارہ ہے کیونکہ ان کی صحافتی تحریریں پورے ہندوستان میں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے تبصروں اور اداریوں کو پسند کرنے والوں کی اچھی خاصی تعداد پورے برصغیر میں تھی۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم نے بہار میں اردو صحافت کو ایک اعتبار اور وقار عطا کیا تھا اور اپنے طویل صحافتی تجربات کے ذریعے اردو اخبار کے معیار و مزاج کو بدلنے کی بھی کوشش کی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ بہار میں بہت کم ایسے صحافی ہیں جنھیں مختلف اہم اخبارات میں کام کرنے کا تجربہ رہا ہو۔ عبدالرافع ایسے صحافی تھے جنھیں کہنہ مشق اور تجربہ کار صحافیوں کی صحبت نصیب تھی۔ انھوں نے کلکتہ کے روزنامہ 'اخوت' سے اپنے صحافتی سفر کا آغاز کیا تھا۔ 'آزاد ہند' کلکتہ، 'صدائے عام' پٹنہ، روزنامہ 'قومی آواز' پٹنہ اور 'قومی تنظیم' پٹنہ سے ان کی ادارتی وابستگی رہی ہے اور امارت شرعیہ کے ترجمان ہفت روزہ 'نقیب' کی ادارت کے فرائض بھی انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ قومی اردو کونسل سید عبدالرافع مرحوم کی ادبی اور لسانی تحریروں کا ایک انتخاب شائع کرنے پر غور کر رہی ہے۔

کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ اس تعزیتی نشست میں معروف طنز و مزاح نگار اسد رضا، روزنامہ خبریں کے جوائنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر زین شمسی، پروجیکٹ اسسٹنٹ، ڈاکٹر عبدالرشید اور ڈاکٹر شاہد اختر انصاری کے علاوہ دیگر شخصیات بھی موجود تھیں۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 23 دسمبر 2015

اردو صحافت کے 200 سال کے موضوع پر سیمینار

پیغام: صحافت کو صرف لکھنے پڑھنے اور چھپنے تک محدود نہ کریں بلکہ اپنے ذہنوں میں وہ صحافت ڈالیں جس سے سماج میں مثبت تبدیلی رونما ہو سکے۔ سب سے اچھا اخبار نویس وہ ہے جو اپنی طاقت کا لوہا منوا سکے۔ صحافی کا کوئی مذہب، ذات اور قوم نہیں ہوتا۔ ان سب سے الگ ہو کر لکھیے بلکہ وہ زبان کی ترقی اور اس کے فروغ میں بھی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ زبان اور ادب کے گہرے رشتے پر زور دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر زبان نہیں ہوگی تو ادب کون پڑھے گا۔ انھوں نے اردو کی ترقی اور اس کے فروغ کے لیے اس بات پر زور دیا کہ ہر اردو داں ایک سیمینار کے دوسرے دن اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ اگر آپ روشن ہیں تو اردو کا مستقبل بھی روشن ہوگا اگر آپ کی تہذیب کا ہی مستقبل نہیں ہے تو آپ کی زبان کا مستقبل بھی تاریک ہوگا۔ اردو اخبارات کی تاریخ،

ایک اچھا صحافی اپنے اخبار میں اس طرح کے مواد کو شامل کرتا ہے جس سے سماج اور معاشرے کو فائدہ پہنچے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین چودھری منظر حسین نے پٹنہ میں اے این سنہا انسٹی ٹیوٹ میں قومی کونسل کے سیمینار کے افتتاحی اجلاس کے صدارتی خطبے میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ سب سے مشکل صحافت اردو کی ہے اور اس کا رسم الخط آج سب سے بڑا چیلنج ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو رسم الخط قدرتی ہے اس لیے اسے تبدیل کرنا مشکل ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک اردو صحافت میں کمپیوٹر اور جدید تکنیک کا استعمال نہیں کریں گے اس وقت تک اردو صحافت دیگر صحافت کے ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو اخبارات میں مختلف اصناف کی کمی ہے ان میں سے ایک کارٹون کا فن ہے جو بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ صحافی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ صرف سیاسی مفکر ہی نہیں غیر اردو داں کو اردو سکھائے۔ یہ کام اپنے گھر سے شروع کرنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اردو صرف ایک زبان نہیں یہ آپ کی ثقافت بھی ہے۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اپنے کلیدی خطبے میں اردو صحافت کی مختصر تاریخ اور اس کے اہم نکات پر گفتگو کی اور اپنا مقالہ 'بہار میں اردو صحافت کے خد و خال' بھی پیش کیا۔ صحافت کے اہم نکات کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ صحافت عبادت کے مرحلے سے گزر کر تجارت کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ سابق وزیر خالد رشید صبا نے اردو صحافت کے کئی اہم نکتوں کو سامنے رکھا۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت میں آج صحافی باہر نکلنے کی بجائے حکمران کی سوچ اور ان کے نظریات کا اثر اردو صحافت پر بھی ہوا۔ اس سے قبل کلکتہ اور سری نگر میں بھی قومی کونسل کے دو سیمینار ہو چکے ہیں۔ اس موقعے پر اردو رسالہ 'صدف' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ افتتاحی اجلاس میں شامل ہونے والوں میں اردو صحافیوں کے علاوہ عظیم آباد کے دانشور بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ تکنیک، اسلوب و لہجہ اور اس کے مختلف نکات پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر رضوان اللہ آروی نے کہا کہ اردو اخبارات کو اقربا پروری کے کوچے سے نکال کر اہل صحافت کے ہاتھوں میں سونپنے کی ضرورت ہے مگر افسوس کہ اردو اخبارات آج عوام کی ترجمانی کے بجائے صرف سرکاری اشتہارات کے حصول کا ذریعہ بن کر رہ گئے ہیں۔ انھوں نے اردو اخبارات کو بازار اور قارئین کی ضرورت بنانے پر زور دیا اور کہا کہ اس میں یونیورسٹی اور طلبا سے متعلق موضوعات کو بھی اہمیت سے شامل کیا جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو اردو اخبارات کے قارئین کی تعداد میں اضافہ کے بجائے کمی ہونے کا خطرہ ہے۔ ڈاکٹر صفدر امام قادری نے کہا کہ اردو اخبارات کی اشاعت ہندی اور انگریزی اخبارات کے مقابلے میں حد درجہ کم ہے۔ عہد حاضر کی اردو صحافت روایت اور جدت کے درمیان سے گزر رہی ہے۔ انھوں نے اردو اخبارات کی تکنیک، کالم، مضامین اور اس کے دیگر پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اس کے

معیار اور اس کے قارئین کا لحاظ ضرور رکھنا چاہیے۔ انقلاب کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر احمد جاوید نے اردو اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ دنیا کی بڑی ایجنسیاں اخباروں کے باہمی اشتراک و تعاون سے وجود میں آئی ہیں لیکن اردو صحافت میں اس طرح کے تعاون کی کوئی روایت آج بھی نہیں ہے۔ اس پر سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد نے علاقائی اردو صحافت پر اپنا مقالہ پیش کیا اور اردو صحافت کے لیے سنجیدہ کوشش کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اپنے مقالہ 'بہار کے گمنام صحافی' میں ڈاکٹر منظر اعجاز نے کہا کہ اردو اخبارات کے مضامین اور مواد کو یکجا کرنے اور اس کی فائل تیار کرنے کی اب تک کوئی منظم کوشش نہیں کی گئی۔ اگر اس کی فائل تیار کر دی جائے تو آنے والی نسلوں کو اس سے بہت ہی فائدہ ہوگا۔ مشتاق احمد نوری نے بہار میں اردو اخبارات کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کبھی اردو اخبارات اعداد و شمار کی بنیاد پر اپنی سرکولیشن درج کرانے میں مصروف ہیں۔ آر این آئی کے مطابق بہار سے 138 اردو اخبارات شائع کیے جا رہے ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اشرف استھانوی، ڈاکٹر سید احمد قادری اور ڈاکٹر عبدالحی نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر سہ ماہی 'تکمیل' انقلاب کے خصوصی شمارے 'حق گو صحافی اشرف استھانوی' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ سیمینار میں اردو ہندی کے معروف صحافیوں کے علاوہ عظیم آباد کے دانشوران بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 20 اور 21 دسمبر 2015

اردو آن وہیل

نئی دہلی: اردو کا فروغ اور ارتقا ہی کونسل کا مقصد ہے۔ اس لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان غیر اردو داں طبقے کو اردو سکھانے کے لیے اردو آن وہیل (چھوٹی گاڑی) کا پروجیکٹ شروع کر رہی ہے۔ اردو آن وہیل کا کانسپٹ ہوگا کہ کونسل کی ایک چھوٹی گاڑی ہوگی، اس میں ایک چھوٹا ساؤنڈ سسٹم اور کتابیں ہوں گی۔ یہ گاڑی مختلف علاقوں میں جائے گی اور وہاں اردو سکھانے کا کام شروع کرے گی۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے روزنامہ 'سیاسی تقدیر' کے چیف رپورٹر سے خصوصی بات چیت کے دوران کیا۔ انھوں نے نئے سال کے موقعے پر نئے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل کا مقصد اردو کا فروغ ہے، جس کے لیے ہم نئے سال کے موقعے پر نئے عزم کے ساتھ کمربستہ ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو والوں اور محبان اردو کو نئے سال کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہماری کوشش ہے کہ فروری کے آخر تک اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جائے تاکہ اردو کے فروغ کے لیے ایک نیا تجربہ کیا جا سکے۔ انھوں نے کہا کہ اس نئے تجربے کے ساتھ ہم اردو والوں کے درمیان بھی جائیں گے اور غیر اردو داں طبقے کو بھی اردو سکھانے کا بیڑا اٹھائیں گے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے مزید کہا کہ اس منصوبے کے تحت قومی اردو کونسل ہر علاقے کے ریذیڈنٹ ویلفیئر ایسوسی ایشن سے مدد لے رہی ہے۔ ہم اس کے ذریعے ان لوگوں کو اردو سکھانا چاہتے ہیں جو لوگ اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ اس سے ہم اردو کو فروغ دے سکتے ہیں۔ یہ قدم آنے والے دنوں میں اردو کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہم بہت جلد اس پروجیکٹ کو لے کر آئیں گے کیونکہ اب یہ آخری مرحلے میں ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اردو آن وہیل کے ذریعے ہم اساتذہ کی خدمات حاصل کریں گے، ہو سکتا ہے کہ وہ کونسل کی گاڑی کے ساتھ جائیں یا پھر کونسل کی گاڑی وہاں پہنچے گی جہاں اساتذہ اور طلبا موجود ہوں۔ کونسل کے ڈائرکٹر نے مزید کہا کہ کونسل کا مقصد اردو زبان کی ترقی اور ارتقا ہے، ہمارا بھی ارادہ ہے کہ ہم اردو کے ارتقا پر زیادہ کام کریں گے۔ اس لیے ہم نے صحافت کا دامن تھاما ہے۔ صحافت ایک طریقے سے بڑا ادارہ اور مشن ہے، جو زبان کے ارتقا میں بہت کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ پروفیسر کریم نے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو صحافت کی 200 سال کی جو سیریز شروع کی ہے، ہم نے پہلا سیمینار کلکتہ میں کیا۔ اس کے بعد کشمیر اور پٹنہ میں کر چکے ہیں جبکہ مختلف شہروں اور صوبوں میں صحافت کے 200 سال مکمل ہونے پر کرتے رہیں گے۔ انھوں نے کہا کہ قومی کونسل کا پہلا ہدف وہ علاقہ ہوگا جہاں اردو کے جاننے والے نہیں ہوں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارا تجربہ جامعہ نگر، بٹلہ ہاؤس، سیلم پور اور پرانی دہلی نہیں ہوں گے بلکہ ہم ایسے علاقوں میں جائیں گے جہاں اردو جاننے والوں کی آبادی کم ہو۔ اب ٹکنالوجی کا زمانہ ہے، اس لیے ہمیں اردو کو ٹکنالوجی سے جوڑ کر اردو کو دوسری زبانوں کے برابر لانا ہوگا۔ انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ کونسل نے اس سے قبل اردو کے فروغ کے لیے بہت سے کام کیے ہیں، مگر اب نئے تجربات کے ساتھ ہم یکجا کرنے کی کوشش کریں گے۔

روزنامہ سیاسی تقدیر، دہلی، 4 جنوری 2016

اکیسویں صدی میں اردو کی خواتین قلمکار

وشاکھاپٹنم: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے بزم اہتمام وشاکھاپٹنم کے زیر اہتمام ہوٹل بیچ پارک کے گلشن ہال میں 10 جنوری 2016 کو ایک سیمینار منعقد کیا گیا۔ سیمینار کا موضوع تھا 'اکیسویں صدی میں اردو کی خواتین قلمکار'۔ جس کی صدارت اردو زبان و ادب کے ممتاز و معروف شاعر و نقاد پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے کی اور این سی پی یو ایل نئی دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم مہمان خصوصی تھے۔ دیگر معزز مہمانوں میں جناب [illegible]، پروفیسر [illegible] اقبال احمد، سابق [illegible]،

جناب افتخار حسین، جناب ملک قاسم مہدی کے نام قابل ذکر ہیں۔ سیمینار میں اس موضوع پر ملک کی مختلف ریاستوں سے چھ قلمکاروں نے الگ الگ اصناف ادب کے حوالے سے اکیسویں صدی کی خواتین قلمکاروں کا تنقیدی اور تجزیاتی جائزہ لیا۔

مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، سید فضل حسین پرویز، عظیم سہا نوری، ڈاکٹر رفیق شعری، ڈاکٹر حسن نظامی، ڈاکٹر اقبال حسین، ادیب اعجاز اور احمد معراج نے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کے موضوع کے اعتبار سے اور غرض و غایت پر مفصل تقریر کرتے ہوئے این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سیر حاصل تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ ملک و قوم کی ترقی میں مردوں کے شانہ بہ شانہ خاتون قلمکاروں نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ آج ادب کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جہاں خاتون قلمکار موجود نہ ہوں۔ صدر سیمینار پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے پڑھے گئے ہر مقالے کی وسعت سمت اور اہمیت پر قابل قدر ریمارک سے سامعین کا دل جیت لیا۔ اس سیمینار کی نظامت خالق ادیب نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دی۔

عثمان انجم نے 116 صفحات پر مشتمل مذکورہ 14 مقالوں کو ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کیا جس کی رسم رونمائی مہمان خصوصی پروفیسر ارتضیٰ کریم کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب 'نسائی تخلیقی اسلوب' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اخیر میں مہمان خصوصی کے ہاتھوں مقالہ نگاروں کو مومنٹو اور توصیفی سند سے نوازا گیا اور بزم اہتمام کے صدر جناب عثمان انجم نے کلمات تشکر پیش کیا۔

رپورٹ: سعدیہ انجم، بزم اہتمام وشاکھاپٹنم، 15 جنوری 2016

کونسل کے تعاون سے

اکیسویں صدی میں اردو کو درپیش چیلنجز

علی گڑھ: دنیا کی کوئی زبان تنازعات میں الجھ کر ترقی نہیں کر سکتی۔ ہمیں اردو کی ترقی کے لیے اردو کو تنازعات سے پاک کرنا ہوگا اور اس حقیقت سے سب کو بہتر طور پر روشناس کرانا ہوگا کہ اردو مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوستان کی زبان ہے اور کسی بھی زبان کو مذہب، سرحد اور علاقائیت کے دائرے میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ ان خیالات کا اظہار اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (اگنو) کے وائس چانسلر پروفیسر محمد اسلم نے کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں ملت بیداری مہم کمیٹی (ایم بی ایم سی) علی گڑھ کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے 'اکیسویں صدی میں اردو کو درپیش چیلنجز' موضوع پر منعقدہ ایک روزہ قومی سیمینار سے بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ادب کو زبان پر ترجیح دیتے ہیں جبکہ ہمیں زبان کی ترویج و اشاعت پر خصوصی توجہ دینی چاہیے اور اپنے بچوں میں بنیادی سطح پر ہی اردو کے تعلق سے دلچسپی پیدا کرنی چاہیے تاکہ ہم آنے والی نسلوں تک اردو زبان کو محفوظ کر سکیں۔ انھوں نے کہا کہ اکیسویں صدی اردو کے لیے راحت بخش ہے جبکہ بیسویں صدی میں اردو کے لیے زیادہ چیلنجز تھے جن کا مقابلہ اس زبان نے بڑی جواں مردی کے ساتھ کیا اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔ پروفیسر اسلم نے کہا کہ اردو بولنے والوں کی تعداد 70 ملین کے قریب ہے جبکہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 5.01 فیصد لوگوں کی مادری زبان ہے۔ ہمیں اس کام پر بھی توجہ دینی ہوگی کہ سرکاری اعداد و شمار کے وقت ہم اپنی مادری زبان اردو درج کرائیں تاکہ حکومت اس زبان کی جانب سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہو۔ سیمینار کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ممتاز نقاد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں سینئر استاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ تقسیم ملک سے قبل اردو زبان کے لیے کوئی چیلنج نہیں تھا البتہ 150-100 سال قبل انگریزوں نے ضرور ریشہ دوانیاں کیں لیکن سرسید نے اس وقت جو

کارہائے نمایاں انجام دیے وہ ہماری لسانی تاریخ کا زریں باب ہیں۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ اردو زبان کا اپنا منفرد میدان ہے اور اس کا کوئی تعلق عربی یا فارسی سے نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ زبان اور رسم الخط کا رشتہ جسم اور روح کا رشتہ ہوتا ہے اور اردو زبان کا رسم الخط تبدیل کیے جانے سے اردو کا حسن ختم ہو جائے گا۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر رضاء اللہ خاں نے کہا کہ اردو ہندوستان کی اپنی زبان ہے اور اس زبان نے جہاں ایک جانب آزادی کی جدوجہد میں اہم رول ادا کیا وہیں دوسری جانب آزاد ہندوستان میں بھی سماجی اتحاد کے فروغ میں سرگرم رول ادا کیا لیکن افسوس کہ ملک میں یہ زبان سیاست کا شکار ہو گئی۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی زبان پر سیاست نہیں کی جانی چاہیے۔ ایم بی ایم سی کی جانب سے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایم اسلم نے پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی تدریسی، علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ایم بی ایم سی کی جانب سے 'بیسٹ ٹیچر ایوارڈ' سے سرفراز کیا۔ پروگرام میں بڑی تعداد میں اساتذہ، ماہرین لسانیات اور دانشور بھی موجود تھے۔

روزنامہ صحافت دہلی، 21 دسمبر 2015

مانی جائسی کی ادبی خدمات

نئی دہلی: مانی جائسی اپنے عہد کے اساتذۂ سخن میں شمار ہوتے تھے جن کے علاوہ جہاں بھی رہے انھیں بھی استادانہ حیثیت حاصل رہی ہے۔ مانی ہمیشہ جذبات کے تابع رہے ہیں، جذبے سے خالی شاید ہی ان کی کوئی تخلیق ہو۔ مانی نے جو کچھ کہا وہ خوب سے خوب تر ہے۔ اس میں شعریت بھی ہے اور سچی آفرینی بھی، حسن تغزل بھی ہے اور گیرائی فکر بھی۔ ان کا ہر شعر سوز و کیف سے لبریز ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ادیب و دانشور نے غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں 'مانی جائسی کی ادبی خدمات' پر منعقدہ ایک سیمینار میں کیا۔ اس سیمینار کا اہتمام سہوگ سیوا کمیٹی اور قومی کونسل کے اشتراک سے کیا گیا تھا۔ اس موقعے پر انتخاب کلام مانی جائسی 'کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ اس موقعے پر مانی جائسی کے جانشیں وقار مانوی نے مانی کے ساتھ اپنا قلبی تعلق بتاتے ہوئے ان کے شعری آفاق کو بیان کیا۔ تمہیدی کلمات میں سریش چندر شوق نے کمیٹی کی کارکردگی کو بیان کرتے ہوئے تمام لوگوں کا استقبال کیا۔ عزیز وارثی نے مانی جائسی کی غزل پیش کی اور حسین امروہوی نے مانی جائسی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ مانی جائسی کے صاحب زادے مکتب تقی عرف نوشہ نے مانی جائسی کی غزل پیش کی۔ پروگرام کی نظامت انس فیضی نے کی۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے ذاکر حسین کالج کے استاد ڈاکٹر خالد علوی نے مانی جائسی کے اشعار کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ شکیل رضوی نے اپنے مقالے میں کہا کہ مانی اپنے الفاظ سے وہ کام لیتے ہیں جو مصور رنگ و لکیر سے لیتا ہے اور کبھی کبھی یہ الفاظ مصوری کی لکیروں سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مانی شاعری ہمیشہ انسان کی مرہون منت رہے گی۔ اس موقعے پر کنول بھٹم، ڈاکٹر جی آر کنول، ڈاکٹر ظفر مرادآبادی اور ڈاکٹر تابش مہدی نے بھی مقالے پیش کیے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے سید سجاد رضوی نے کہا کہ مانی کی شاعری میں اتنی گہرائی ہے کہ اس کو سمجھنے کے لیے غالب، میر اور ذوق کی شاعری کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مانی اردو شعرا کی اس صف میں شمار کیے جاتے ہیں جنھیں اساتذہ کا درجہ حاصل ہے۔ آخر میں متین امروہوی نے ہدیہ تشکر پیش کرتے ہوئے اس بات کی اطلاع دی کہ جلد ہی کلیات مانی کی ترتیب اور اس کی اشاعت کا کام مکمل کر لیا جائے گا۔ اس موقعے پر مانی جائسی کے فرزند علی احمد عرف وامق، ڈاکٹر شکیل احمد، حاجی اشرف محمد عباس، جاوید قمر، آرین انقلاب، سلیم صدیقی، سلیم دہلوی کے علاوہ مانی جائسی کے خاندان کے لوگ بڑی تعداد میں شریک تھے۔

روزنامہ انقلاب دہلی، 26 دسمبر 2015

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی

اردو ہمارے ملک کی زبان ہے

نئی دہلی: وزیر خارجہ سشما سوراج نے اپنے حالیہ پاکستان دورے کے سلسلے میں لوک سبھا میں بحث کے دوران اٹھے سوالات کا جواب دیا۔ اپنے خطاب میں انھوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا کہ پاکستان میں سبز رنگ کی ساڑی پہننے اور

اردو بولنے پر کچھ لوگوں نے سوال اٹھائے۔ اس موقع پر وزیر خارجہ نے کہا کہ ہندوستان میں اکثر ہرے رنگ کی ساڑی پہنتی ہیں اور جہاں تک بات اردو بولنے کی ہے تو انھوں نے پورے حق کے ساتھ کہا کہ اردو ہمارے ملک کی زبان ہے۔ سشما نے کہا کہ میں بدھ کو سبز رنگ کی ساڑی ہی پہنتی ہوں اور اس دن (9 دسمبر کو) بدھ تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں نے پاکستانی میڈیا سے اردو میں اس لیے بات کی کیونکہ یہ پاکستان کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک کی بھی زبان ہے۔ اردو ہماری بھی زبان ہے، جیسے کہ سنسکرت۔ جب میں عالمی سنسکرت کانفرنس میں سنسکرت میں بیان دے سکتی ہوں تو پاکستان میں اردو کیوں نہیں بول سکتی۔ غور طلب ہے کہ وزیر خارجہ سشما سوراج 9 اور 10 دسمبر کو پاکستان کے دورے پر تھیں۔ وہ ہارٹ آف ایشیا کانفرنس میں شرکت کرنے اسلام آباد گئی تھیں۔ وزیر خارجہ نے وہاں پاکستان کے وزیر اعظم نواز شریف اور خارجہ امور میں ان کے مشیر سرتاج عزیز سے ملاقات کی اور دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کو لے کر گفتگو ہوئی۔ بحث میں شامل تمام اراکین نے ان کے پاکستان دورے اور پاکستانی وزیر اعظم سے بات چیت کا خیر مقدم کیا۔ سشما سوراج نے اس کے لیے تمام ممبران پارلیمنٹ کا شکریہ ادا کیا۔ روزنامہ صحافت دہلی، 15 دسمبر 2015

نئے چیف جسٹس آف انڈیا اردو کے عاشق

نئی دہلی: سپریم کورٹ کے نئے چیف جسٹس تیرتھ سنگھ ٹھاکر کو نہ صرف اردو سے عشق ہے بلکہ وہ بھگوت گیتا

بھی اردو میں ہی پڑھتے ہیں۔ اطلاع کے مطابق ان کی ابتدائی تعلیم بھی اردو میڈیم اسکول سے شروع ہوئی۔ انھوں نے بعد میں ہندی سیکھی۔ نئے چیف جسٹس نے اردو کے تعلق سے اپنے لگاؤ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ بھگوت گیتا بھی اردو میں پڑھتے ہیں کیونکہ انھیں سنسکرت سمجھ میں نہیں آتی۔ انھوں نے ملک کی مشترکہ تہذیبی وراثت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال کا یہ شعر بھی پڑھا "اے آب رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو۔ اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا"۔ عدالت میں مقدمہ کی سماعت کے دوران اکثر تناؤ والے ماحول کو چیف جسٹس تیرتھ سنگھ ٹھاکر شعر و شاعری کے ذریعہ خوشگوار بنانے کے لیے بھی مشہور ہیں۔ چیف جسٹس نے بتایا کہ اردو ان کی اولین زبان ہے۔ ان کی بہنیں ہندی پڑھتی تھیں اور انھوں نے ہندی انھیں کی کتابوں کو پڑھ کر سیکھی۔

ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ شاعر انور جلال پوری نے بھگوت گیتا کا عمدہ ترجمہ کیا ہے اور یہ ایک ایسی وراثت ہے جس کو سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہے۔ روزنامہ انقلاب دہلی، 10 دسمبر 2015

اردو اخبارات ورسائل کی اشاعت 4 کروڑ سے متجاوز

نئی دہلی: ہندوستان میں اردو کے اخبارات ورسائل کی چار کروڑ 12 لاکھ 79 ہزار 949 کاپیاں شائع ہوتی ہیں۔ یہ اطلاع آر این آئی کے ڈائرکٹر جنرل ایس ایم خان نے دی ہے۔ حکومت نے اپنی سالانہ رپورٹ آر این آئی کو نہ بھیجنے والے اخبارات ورسائل کو خبردار کیا ہے کہ اگر وہ تین سال تک اپنی سالانہ رپورٹ نہیں دیتے ہیں تو ان کا رجسٹریشن منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے اخبارات کے رجسٹرار آفس (آر این آئی) کے ڈائرکٹر جنرل ایس ایم خان نے پریس ان انڈیا کے اجرا کے پروگرام میں کہا کہ ملک میں ایک لاکھ پانچ ہزار 443 اخبار اور رسالے رجسٹرڈ ہیں لیکن ان میں سے صرف 23 ہزار 394 ہی اپنی سالانہ رپورٹ سونپتے ہیں۔ شاید وہ اسے سنجیدہ نہیں مانتے ہیں لیکن یہ فکر کی بات ہے۔ مسٹر خان نے کہا کہ اگر کوئی اخبار یا میگزین تین سال تک اپنی رپورٹ نہیں دیتا ہے تو اس کے رجسٹریشن منسوخ کرنے کا عمل شروع کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ساتھ ہی کہا کہ آر این آئی اپنے کام کاج کو آن لائن اور شفاف بنانے کے کام میں مصروف ہے اور اگلے ایک دو سال میں مکمل عمل کو پوری طرح آن لائن کر دیا جائے گا۔ آر این آئی کی 59ویں رپورٹ کے مطابق اس سال ملک میں اخبارات ورسائل کی تعداد میں 5.8 فیصد کے اضافے کے ساتھ ایک لاکھ پانچ ہزار 443 تک پہنچ گئی ہے جن میں 14 ہزار 984 اخبار اور 90 ہزار 459 رسالے ہیں۔ اس سال ملک میں 5817 نئے اخبارات اور رسالوں کا رجسٹریشن ہوا

جبکہ 34 کے رجسٹریشن ضبط کیے گئے ہیں۔ ملک میں سب سے زیادہ ہندی کے 42493 اخبارات اور رسائل رجسٹرڈ ہیں۔ دوسرا مقام انگریزی کا ہے جس کے 13661 اخبارات اور رجسٹرڈ ہیں۔ اتر پردیش میں سب سے زیادہ 16130 اخبارات اور رسائل ہیں جبکہ مہاراشٹر میں ان کی تعداد 14394 ہے۔ ملک میں اخبارات اور رسائل کا کل سرکولیشن 51 کروڑ پانچ لاکھ 21 ہزار 445 ہے۔ آر این آئی کا کہنا ہے کہ یہ ہر اخبار اور رسالے کے دعووں پر مبنی ہے اور اس کی آزادانہ تصدیق نہیں ہوئی ہے۔ ہندی اخبارات و رسائل کا سرکولیشن 25 کروڑ 77 لاکھ 61 ہزار 985 ہے۔ انگریزی کے اخبارات و رسالے کا سرکولیشن چھ کروڑ 26 لاکھ 62 ہزار 670 ہے جبکہ اردو کے لیے یہ تعداد چار کروڑ 12 لاکھ 73 ہزار 949 ہے۔ کسی بھی زبان میں سب سے زیادہ سرکولیشن والا اخبار کولکاتہ سے بنگلہ زبان میں شائع ہونے والا ’آنند بازار پتریکا‘ ہے۔ اس کا سرکولیشن 11 لاکھ 78 ہزار 779 ہے۔ دوسرا سب سے زیادہ سرکولیشن والا اخبار دہلی سے شائع ہونے والا ’ہندوستان ٹائمز‘ ہے جس کی دس لاکھ 18 ہزار 367 کاپیاں چھپتی ہیں۔ ہندی میں سب سے زیادہ سرکولیشن والا اخبار جالندھر سے شائع ’پنجاب کیسری‘ ہے۔ اس اخبار کا سرکولیشن سات لاکھ 42 ہزار 190 ہے۔ سب سے زیادہ سرکولیشن والا کثیر ایڈیشن والا اخبار ’ٹائمز آف انڈیا‘ ہے۔ اس کے 33 ایڈیشن کی سرکولیشن 46 لاکھ 30 ہزار 200 ہے۔ اس فہرست میں دوسرا مقام دینک بھاسکر کا ہے جس کے 34 ایڈیشن ہیں اور سرکولیشن 36 لاکھ 94 ہزار 385 ہے۔ سب سے زیادہ سرکولیٹیڈ ہفتہ وار اخبار ’دی سنڈے ٹائمز آف انڈیا‘ ہے جبکہ ہندی میں یہ مقام ممبئی سے شائع ہونے والے سنڈے ایڈیشن کا ماک ٹائمز کو حاصل ہے۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی، 30 دسمبر 2015

مانو کے چھ فاصلاتی کورسز کو یو جی سی کی منظوری

حیدر آباد: یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) نے اپنے ایک بڑے فیصلے میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے فاصلاتی نظام تعلیم مرکز کو چھ کورسز کے دوبارہ آغاز کی منظوری دی ہے۔ اس طرح اردو ذریعہ سے تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند ہزاروں طلبہ فاصلاتی طرز پر ان کورسز سے استفادہ کر سکیں گے۔ ان کورسز میں بی اے، بی ایس سی (طبیعیات، کیمیا اور ریاضی)، بی ایس سی (کیمیا، حیاتیات، نباتیات)، اور ایم اے تاریخ اور اسلامیات شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، وائس چانسلر کی مسلسل کاوشوں کے نتیجے میں یو جی سی نے ان کورسز کو دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ نیشنل کونسل فار ٹیچر ایجوکیشن (این سی ٹی ای) کی جانب سے منظور شدہ بی ایڈ کورس کو یو جی سی نے منظوری دے دی ہے۔ اردو یونیورسٹی کو یو جی سی سے موصول مکتوب میں کہا گیا ہے کہ یہ کورسز ان کے علاوہ ہیں جو فاصلاتی طرز پر یونیورسٹی میں پہلے سے جاری ہیں۔

روزنامہ جدید خبر، نئی دہلی، 30 دسمبر 2015

بین الاقوامی غالب سیمینار

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بین الاقوامی غالب سیمینار کی افتتاحی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے جسٹس آفتاب عالم نے اپنی گفتگو میں کہا کہ قرۃ العین حیدر کو ایک قاری کی حیثیت سے میں نے پڑھا اور سمجھا۔

نئی دہلی: غالب سیمینار میں ... جسٹس آفتاب عالم، ... پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر سید رضا حیدر

ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے قاری سے بے حد قریب تھیں ان کو پڑھنے سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کا المیہ پیش کرتی ہیں، تہذیبوں کا تصادم اور اقدار کی پامالی ان کی تحریر کا خاص پہلو تھا۔ ممتاز ادیب و دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ بیسویں صدی فکشن کے حوالے سے قرۃ العین حیدر کی صدی تھی۔ خصوصاً ان کا ناول ’آگ کا دریا‘ ہماری تاریخ اور ہماری مشترکہ تہذیب کی ایک خوبصورت دستاویز ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ قرۃ العین حیدر بیسویں صدی کی اہم فکشن نگار تھیں۔ انھوں نے جتنی بھی تخلیقات پیش کیں اس میں فلسفہ، تاریخ کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر سید رضا حیدر نے افتتاحی تقریب کی نظامت کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کی سالانہ کارکردگی و ادبی سرگرمیوں کی تفصیلات پیش کیں۔ اس اہم موقعے پر محترمہ محسنہ قدوائی (ایم پی راجیہ سبھا) کے دست مبارک سے غالب انسٹی ٹیوٹ کی جن چند مطبوعات کی رسم رونمائی ہوئی ان میں مرحوم پروفیسر حنیف نقوی کے مقالات کا مجموعہ ’غالب کے فارسی خطوط‘، ڈاکٹر شمس بدایونی کی کتاب ’تفہیم غالب کے مدارج‘، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی کتاب ’ترقی پسند شعری روایت اور علی سردار جعفری‘، غالب نامہ کے دونوں شمارے (جولائی 2015، جنوری 2016) کے علاوہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی 2016 کی ڈائری، کیلنڈر کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر انیس اشفاق کو فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے تحقیق و تنقید اور فارسی کے نامور اسکالر اور ذاکر حسین کالج دہلی یونیورسٹی کے فارسی کے استاد ڈاکٹر محمد مرتضیٰ کو فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تحقیق و تنقید، شیخ جاوید کو غالب ایوارڈ برائے اردو نثر، سلطان اختر کو غالب انعام برائے اردو شاعری، ایم سب غالب انعام برائے اردو ڈراما اسلم پرویز اور بین الاقوامی شہرت یافتہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کو مجموعی ادبی خدمات کے لیے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا اور غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے 75 ہزار روپے اور مومنٹو پیش کیے گئے۔ آخر میں ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے شکریہ ادا کیا۔

سیمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں پانچ مقالے پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر کشمیری لال ذاکر کا تھا۔ اس مقالہ کو ڈاکٹر کمال انور نے پڑھا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر مشتاق صدف نے پیش کیا۔ اس اجلاس کے تیسرے مقالہ نگار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ ہندی کے استاد ڈاکٹر رحمان مصور تھے۔ معروف فکشن نقاد ڈاکٹر خالد اشرف نے قرۃ العین حیدر کے ناول ’گردش رنگ چمن‘ کے تعلق سے مقالہ پیش کیا۔ اجلاس کے آخری مقالہ نگار ممتاز دانشور پروفیسر شفیق اللہ نے کہا کہ قرۃ العین حیدر اپنی تخلیقات میں کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں پیش کرتی تھیں۔ اس اجلاس میں مہمان خصوصی ڈاکٹر اطہر فاروقی تھے۔ اجلاس کے صدر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں جو تاریخی حقائق تھے اس پر گفتگو کی۔

سیمینار کا دوسرا اجلاس جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں پاکستان کے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے۔ دوسرے اجلاس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے اپنے مقالے میں قرۃ العین حیدر کے رپورتاژ اور دیگر تخلیقات پر اظہار خیال کیا۔ دوسرے مقالہ نگار پروفیسر صادق نے اپنی گفتگو میں قرۃ العین حیدر سے جوان کے علمی روابط تھے اس پر گفتگو کی۔ معروف افسانہ نگار رتن سنگھ نے بھی اپنے مقالے میں قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کے کرداروں پر بحث کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر مرزا حامد بیگ اور سید شاہد مہدی نے بھی قرۃ العین حیدر کے فن اوران کی زندگی پر روشنی ڈالی۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی افضال حسین نے کی اور اس اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جرمنی سے آئے مہمان ادیب وشاعر عارف نقوی موجود تھے اس اجلاس میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر غضنفر علی اور پروفیسر حسین الحق نے مقالات پیش کیے۔ سیمینار کے دوسرے دن کے آخری اجلاس میں ماریشس کی اسکالر نازیہ بیگم جافو، ڈاکٹر جمیل اختر اور پروفیسر ابن کنول نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی جمال حسین نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین موجود تھے۔

سیمینار کے تیسرے دن کے پہلے اجلاس میں پانچ مقالے پڑھے گئے جس میں ڈاکٹر ترنم ریاض، پروفیسر شافع قدوائی اور پروفیسر قاضی جمال حسین نے پر مغز مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کے صدر پروفیسر صغیر افراہیم تھے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے گفتگو کی۔ دوسرے اجلاس میں ڈاکٹر خالد جاوید، پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر مرزا حامد بیگ، پروفیسر عبدالصمد، پروفیسر قاضی افضال حسین نے مقالے پیش کیے۔

اس اجلاس میں پروفیسر شافع قدوائی مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے اور صدارتی کلمات پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے پیش کیے۔ اس بین الاقوامی سیمینار کا آخری اجلاس پروفیسر حامد بیگ کی صدارت میں ہوا اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر انور پاشا کو دعوت دی گئی تھی۔ اس اجلاس میں پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر معین الدین جینابڑے اور مشرف عالم ذوقی نے اپنے مقالے پیش کیے۔ تینوں اجلاس میں بالترتیب ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ، ڈاکٹر محمد کاظم اور ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی نے نظامت کی۔ سیمینار کے اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم موجود تھے۔ اس اجلاس میں پروفیسر مرزا حامد بیگ، پروفیسر عبدالصمد، پروفیسر حسین الحق اور ڈاکٹر جمیل اختر نے سیمینار کے تعلق سے مجموعی طور پر گفتگو کی۔ خصوصاً پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنی تقریر میں قرۃ العین حیدر کی تمام تخلیقات کا مختصر اجمالی تجزیہ پیش کیا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، 12 دسمبر 2015، روزنامہ انقلاب، دہلی 13، 14 دسمبر 2015

اردو کے فروغ میں غیر مسلم قلم کاروں کا کردار

نئی دہلی: اردو کے فروغ میں غیر مسلم قلم کاروں کے کردار کے موضوع پر نئی دہلی میں منعقد قومی سیمینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے آل انڈیا تنظیم علماء حق کے

قومی صدر مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی نے کہا کہ اردو ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی روشن علامت ہے۔ اردو ہماری متحدہ قومیت کی پاسدار اور ہند اسلامی تہذیب کی علم بردار ہے۔ سیمینار کے افتتاحی سیشن کے صدر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سیمینار میں پیش کردہ مقالات پر اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اردو کسی خاص قوم یا مذہب سے مربوط زبان نہیں ہے۔ اس زبان کی تشکیل وتکمیل میں ہندوستان کے تمام طبقات کا یکساں حصہ شامل ہے۔ انھوں نے اردو کی موجودہ زبوں حالی کا ذمہ دار اردو آبادی کو قرار دیتے ہوئے کہا کہ اردو کی ترقی میں حکومتوں نے اپنا جو کردار ادا کیا ہے اس پر نکتہ چینی کے بجائے ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنا اور اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ ہم خود اردو کی جڑوں کو کھود رہے ہیں اور اپنے بچوں کو نہ صرف یہ کہ اردو کے علاوہ دوسری زبانیں سیکھنے کی تحریک دیتے ہیں، بلکہ اردو کے اخبارات ورسائل بھی خرید کر پڑھنا گوارا نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے حکومتوں اور اداروں پر انحصار کرنے کے بجائے ہمیں خود عملا قدم اٹھانا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اردو کو اپنے گھر سے نکال دیا ہے۔ گھروں میں تمام چیزوں کا نام ہم انگریزی میں لیتے ہیں جس کی وجہ سے اردو الفاظ سے ہمارے بچے آشنا نہیں ہوتے۔ اس موقع پر موجود تہاڑ فقیہ ایمان مہدی پورے نے کہا کہ گرچہ میں اردو نہیں جانتا ہوں، لیکن اس زبان کی شیرینی اور اس کی لطافت اپنی فارسی اثرات کے تحت ہمیں حاضر کرتی ہے۔ پروگرام میں اپنی عدم حاضری پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے اپنے پیغام میں محترمہ نجمہ ہیبت اللہ نے کہا کہ بلاشبہ اردو ہندوستان کی ایک زبان ہے جس کی نشوونما اور ترویج وترقی میں ہر مذہب اور ہر فرقے کے اہل قلم نے قابل ذکر کردار ادا کیا ہے۔ سامعین سے بنگلور کے مشہور سماجی رہنما حاجی محمد ضیا احمد نے بھی خطاب کرتے ہوئے اسے کامیاب سیمینار کے انعقاد پر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اس موقع پر جن مقالہ نگاروں نے اردو اور غیر مسلم قلم کاروں پر اپنے گراں قدر مقالات پیش کیے ان میں حقانی القاسمی، سہیل انجم، اسعد فیصل، محمد رضوان خان، سعدیہ اقبال، ڈاکٹر طاہرہ پروین، فیاض احمد وجیہ، محسن علی حق، فاروق اعظم، محمد اظہر، عابد انور، تسنیم الدین قاسمی، عمران عاکف خان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سیمینار میں پیش کردہ تمام مقالات کو کتابی شکل میں مرتب کرکے سیمینار میں ہی اس کی رونمائی عمل میں آئی۔ اس سیمینار میں علماء اور دانش ور کے ہاتھوں فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہی پر فکر انقلاب کے ضخیم دستاویزی شمارہ کا بھی اجرا کیا گیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سید فاروق، ڈاکٹر محسن کمار، مولانا فرید الدین قاسمی، قاری ابوالحسن اعظمی، چوتھی دنیا کے مدیر سنتوش بھارتیہ نے بھی سیمینار کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس سیمینار میں ملک کی مقتدر اور معروف شخصیات کو ان کی علمی اور ادبی خدمت کے اعتراف میں ایوارڈ اور سند توصیف بھی

پیش کی گئی۔ ایوارڈ پانے والوں میں مجیب اللہ، پروفیسر فرقان قمر، محمد شکیل، جعفر احمد فاروقی، آغا سید حسن سید مہدی، ڈاکٹر بدر جہاں، مولانا محمد یوسف، جنید الدین، حاجی اکرام حسین، الطاف حسین احمد، عقیل احمد، حاجی مجیب، ذکی، مولانا الیاس، شاہد اسلام اور مولانا شفیق عالم اوبی قابل ذکر ہیں۔ نظامت کے فرائض پروفیسر ارشاد احمد اجمیری نے انجام دیے۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس، دہلی، 22 دسمبر 2015

'بیٹی پڑھاؤ، بیٹی بچاؤ' اسکیم

نئی دہلی: اردو ایجوکیشن بورڈ نے وزیر اعظم نریندر مودی کی اردو ایجوکیشن بورڈ اور بیٹی پڑھاؤ، بیٹی بچاؤ اسکیم کو اپنے یہاں نافذ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ اسکیم وزارت برائے بہبود خواتین و اطفال کے زیر اہتمام جاری ہے۔ وزیر اعظم نے اس اسکیم کے تحت بیٹیوں کے تحفظ اور ان کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے بڑے پیمانے پر کام کرنے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ اردو ایجوکیشن بورڈ میں اس اسکیم کے نفاذ کی تفصیلات بتاتے ہوئے بورڈ کی چیئرمین پروفیسر سیما حسن نے بتایا کہ اس کے تحت ہم اپنے یہاں غریب (بی پی ایل کارڈ ہولڈر) لڑکیوں کا داخلہ مفت کریں گے اور جو لڑکیاں مالی طور سے بہت زیادہ پسماندگی کی شکار ہیں، انھیں اسکالرشپ بھی دی گے تاکہ جب وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد یہاں سے فارغ ہوں تو ان کے پاس ایک اچھی خاصی رقم ہو جس سے وہ اپنی اعلیٰ تعلیم جاری رکھ سکیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ اسکیم اردو ایجوکیشن بورڈ صرف دہلی میں شروع کر رہا ہے، یہاں کامیاب تجربے کے بعد ملک بھر میں بورڈ کے تمام سینٹروں پر شروع کی جائے گی۔ واضح رہے کہ اردو ایجوکیشن بورڈ جو کہ منظور شدہ اقلیتی تعلیمی ادارہ ہے اور سی بی ایس ای، این سی ای آر ٹی کے نصاب کے مطابق آٹھویں، سکنڈری اور سینئر سکنڈری کا کورس فراہم کرتا ہے۔ بورڈ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کی شرائط کو پورا کرتا ہے کئی ریاستی بورڈوں سے اس کو منظوری بھی مل چکی ہے اور میڈیکل کمیشن فار ماناریٹیز ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشن سے اس کو اقلیتی کردار کا درجہ بھی مل چکا ہے۔ بورڈ کے نصابی مواد اردو، ہندی اور انگلش تینوں زبانوں میں دستیاب ہیں۔

اردو ایجوکیشن بورڈ نے ایک نئے پورٹل کی شروعات کی ہے جس میں اردو ایجوکیشن بورڈ کے حوالے تمام طرح کی سرگرمیوں کو مسلسل اپ ڈیٹ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں مقامی اور قومی خبروں کے علاوہ ثقافتی، صحافت و سائنس، انٹرٹینمنٹ، تجارت، اسپورٹس اور ثقافتی خبروں کے لیے خصوصی کالم بنائے گئے ہیں جس میں خاص طور سے دہلی کی تمام طرح کی سرگرمیوں کو پیش کیا جاتا ہے۔

بیٹی پڑھاؤ، بیٹی بچاؤ اسکیم کے سلسلے میں پروفیسر سیما حسن نے بتایا کہ بورڈ کے بنیادی مقاصد میں لڑکیوں کی تعلیم کو بڑھاوا دینا، مدارس کے طلبہ کو مین اسٹریم سے جوڑنا اور پسماندہ طبقات سے آنے والے طلبہ و طالبات کو تحریکی طور پر تعلیم کے میدان میں آگے بڑھانا ہے۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 30 دسمبر 2015 و 5 جنوری 2016

جشن مشاعرہ کوی سمیلن کا منظر

دہلی:

عہد مغلیہ کی اردو کتابوں کا ڈیجیٹائزیشن

نئی دہلی: چاندنی چوک واقع لالہ ہردیال میونسپل لائبریری میں اردو کلیکشن میں رکھی کتابوں کو نئی زندگی ملنے والی ہے۔

ریختہ فاؤنڈیشن نے ان کتابوں کا ڈیجیٹائزیشن کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہردیال لائبریری انتظامیہ نے بھی منظوری دے دی ہے اور ادارہ کے ساتھ معاہدہ بھی کرلیا گیا ہے۔ لائبریری انتظامیہ کے اس اقدام سے لوگ گھر بیٹھے ہی بہت سی اردو کی کتابیں پڑھ سکیں گے۔ انتظامیہ کو امید ہے کہ اس اقدام سے کم از کم اردو کی کتابوں کی حفاظت ہو سکے گی اور عوام تک پہنچ پائے گی۔ غور طلب ہے کہ ہردیال لائبریری میں تقریباً ایک لاکھ 70 ہزار کتابیں ہیں، جس میں تقریباً 35 ہزار کتابیں اردو کی ہیں۔ ہردیال لائبریری کی دہلی میں 23 شاخیں ہیں۔ ان تمام شاخوں میں رکھی اردو کتابوں کو بھی اس اقدام میں شامل کیا جا رہا ہے۔ اس لائبریری میں مغل دور کی کتابیں بھی ہیں لیکن انھیں عام لوگوں کو پڑھنے کے لیے نہیں دیا جاتا اور نہ ہی انھیں دکھایا جاتا ہے۔ ایسے میں ان قیمتی کتابوں کے بارے میں جاننے اور پڑھنے سے لوگ محروم رہ جاتے ہیں۔ انتظامیہ کا کہنا ہے کہ قیمتی کتابیں ہونے کی وجہ سے انھیں منظر عام پر نہیں لایا جاتا۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 30 دسمبر 2015

جشن چراغاں

نئی دہلی: اردو، ہندی شاعری ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی عکاس اور امن و رواداری کی مظہر ہے۔ جشن چراغاں کے نام سے محفل شعر و سخن کے ذریعے ہندوستانی تہواروں کو منانے کی روایت نہایت خوش آئند ہے۔ ان خیالات کا اظہار نیتا کمار، پرنسپل کمشنر آف انکم ٹیکس نے روشنی اور خوشی کے ہندوستانی تہواروں عید، دیوالی، گرو پرب اور کرسمس کو معنون جشن چراغاں مشاعرہ و کوی سمیلن سے بحیثیت مہمان خصوصی اپنے خطاب میں کیا۔ مس نیتا کمار نے اس موقعے پر اپنا کلام سنا کر سامعین کو خوب محظوظ کیا۔ معروف سماجی و ثقافتی تنظیم آئیڈیا کمیونیکیشنز کے زیر اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقد اس تقریب کی صدارت ایم ڈی اے کے سپرنٹنڈنگ انجینئر شبیہ حیدر نے کی، جبکہ مہمان اعزازی کی حیثیت سے پروفیسر لی کے تقاضا شریک ہوئے۔

استقبالیہ کلمات آئیڈیا کمیونیکیشنز کے ڈاکٹر آصف اعظمی

نے پیش کیے جبکہ معین شاداب نے نظامت کی۔ انجینئر شبیہ حیدر نے اپنے صدارتی کلمات میں مشاعروں اور اس کے ثقافتی پہلوؤں پر بصیرت افروز گفتگو کی انھوں نے کہا کہ مشاعرہ اور شعری محفلیں زبان کے ارتقا میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ آصف اعظمی نے اپنے تعارفی کلمات میں بتایا کہ جشن چراغاں ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی جڑوں کو مضبوط کرنے کی سمت ایک مضبوط قدم ہے جو گذشتہ چار سال سے جاری ہے۔ حکومت دہلی کی اردو و ہندی اکادمی کے تعاون سے منعقد اس مشاعرہ و کوی سمّیلن میں جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ان میں عالم کوٹلی والا، پاٹھک، کھیم چند پرساد، برقی اعظمی، سید راشد حامدی، جیا لند نگار، سریندر سنگھل، ورشا گورچھیا، اعظم عباس، ریحان مسعود، خالد مبشر، سلیم صدیقی، شرف نانپاروی، نشتر امروہوی، کنور رنجیت چوہان، پرکھر مالویہ کانہا، اقبال فردوسی، سرفراز دہلوی، بھارت بھوشن آریہ، تالیف حیدر، وشال باغ، ویملیندو ساگر وغیرہ شامل تھے۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 30 دسمبر 2015

غالب کا 218واں یوم ولادت

نئی دہلی: مرزا اسد اللہ خان غالب کے 218ویں

یوم ولادت کے موقعے پر غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں مختلف تقریبات کا انعقاد عمل میں آیا۔ تقریب کا آغاز مزار غالب پر گل پوشی سے ہوا اور فاتحہ خوانی کی گئی۔ اس کے بعد غالب اکیڈمی آڈیٹوریم میں جشن غالب کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جی آر کنول نے 'غالب اور انسان دوستی' کے عنوان سے خصوصی خطبہ پیش کیا۔ متین امروہوی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ افتتاحی تقریر پیش کرتے ہوئے غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ غالب کے حوالے سے تو پوری دنیا میں پروگرام ہوتے ہیں، لیکن مزار غالب کے عقب میں واقع اس آڈیٹوریم میں ہر سال منعقد ہونے والی اس تقریب کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ یہ تقریب غالب کے حوالے سے لوگوں میں بیداری پیدا کرنے اور ان کی فکری و فنی جہات سے واقف کرانے کے لیے ہر سال یہاں منعقد ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے کہا کہ مرزا غالب کے خطوط میں انسانی رشتوں کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ غالب کی انسان دوستی کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ فرسودہ روایات کے خلاف تھے، وہ پرانے عہد کے خاتم ہی نہیں، بلکہ عوامی بہبود کے لیے ایک عہد کے نقیب بھی ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ کچھ چیزیں بار بار دہرانے سے کشش کھو دیتی ہیں لیکن غالب کا کلام جتنی بار پڑھا جاتا ہے اس کے معانی میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ شمالی ہند کا غالب سے ثقافتی رشتہ ہے لیکن جنوبی ہند کی زبانوں میں غالب کے تراجم ہو رہے ہیں اور بنگالی زبان میں بھی غالب پر بہت کام ہوا ہے۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے فارسی کے پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ غالب دراصل فارسی کے شاعر تھے اس پر بھی توجہ نہیں دی گئی۔ شکریے کی رسم ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر ترنم ریاض نے کہا کہ غالب نے یکجہتی کا پیغام عام کیا ہے۔ اس موقعے پر گیتانجلی کالا، فاطمہ کرمانی اور مدھو جا ہوں نے غالب کی غزلیں پیش کیں۔ اس موقعے پر ریحانہ قدوائی، نسیم عباسی، انجم عثمانی، نگار عظیم، وقار مانوی، ڈاکٹر ظفر مراد آبادی، مظہر محمود، منیر انجم، سلیم دہلوی، پایو رام، راشد شنکر گپتا، سکندر عاقل اور محسن ضیاء کے علاوہ بڑی تعداد میں غالب کے پرستار موجود تھے۔

روزنامہ انقلاب، 28 دسمبر 2015

اتر پردیش

دیارِ ہند کا باکمال شاعر اقبال سہیل

لکھنؤ: سروج ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے مالی تعاون سے بارہ بنکی میں 'دیارِ ہند کا باکمال شاعر اقبال سہیل' کے موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت الحاج ڈاکٹر جلیل احمد نے کی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے گاؤں کے پردھان شامل ہوئے۔ سیمینار میں نظامت کے فرائض غفران نسیم نے انجام دیے۔ صدارتی خطاب میں الحاج ڈاکٹر جلیل احمد نے کہا کہ اقبال سہیل کی اردو کے علاوہ دیگر لسانی حلقوں میں بھی اپنی ایک پہچان ہے۔ فارسی زبان و ادب میں کم و بیش ان کی خدمات غالب کے مساوی ہیں۔ ان کی شناخت صرف اردو شاعری تک ہی محدود نہیں بلکہ تنقیدی ادبی حلقوں میں انھوں نے اپنا اعتبار قائم کیا ہے۔ ان کی شاعری میں جتنی ساحری ہوتی ہے نثر میں اسی قدر رعنائی بھی نظر آتی ہے۔ مہمان خصوصی گاؤں کے پردھان نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو زبان اپنی چاشنی اور دلکشی کی وجہ سے ہر زمانے اور ادوار میں عوام و خواص کی نورِ نظر بنی رہی ہے۔ اس لیے کہ اردو زبان و ادب کو اپنے لوح و قلم اور لہو سے سینچنے والوں میں اقبال سہیل جیسے ادیب و شاعر موجود تھے، جنھوں نے نظم و نثر دونوں میں طبع آزمائی کی۔ چونکہ وہ بیک وقت کئی زبانوں اور ان کی ادبی و تہذیبی روایت سے گہری واقفیت رکھتے تھے، اس لیے ان کی شاعری صرف الفاظ کا مجموعہ ہو کر تہذیبوں اور مختلف میلانات کی آئینہ دار بن گئی تھی۔ سیمینار میں مہمان ذی وقار ڈاکٹر عزیز اللہ عدوی نے اردو کے حق میں بولتے ہوئے کہا کہ اردو ماضی میں بھی کامیاب تھی، حال میں بھی روشن ہے اور انشاء اللہ اس کا مستقبل بھی تابناک ہوگا۔ سیمینار کے ناظم سینئر صحافی غفران نسیم نے اپنا پرمغز مقالہ پیش کیا۔ دوسرے مقالہ نگار صحافی ضیاء اللہ صدیقی ندوی نے بھی اپنے مقالے میں اردو ادب میں اقبال سہیل کی خدمات کو نہایت خوبصورت انداز سے پیش کیا۔

روزنامہ جدید خبر دہلی، 30 دسمبر 2015

عصمت چغتائی کے افسانوں میں خواتین کے مسائل

سنبھل: سنبھل کے ایم جی ایم کالج کے شعبۂ اردو میں 'عصمت چغتائی کے افسانوں میں خواتین کے مسائل' موضوع کے تحت ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے استاد اسلم جمشید پوری نے خصوصی خطبہ دیا۔ پروگرام کی افتتاحی تقریب میں ایم جی ایم کالج کے شعبۂ اردو سے وابستہ ڈاکٹر رضا الرحمن عاکف نے پروگرام کی غرض و غایت اور موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ سیمینار کی نظامت کے فرائض شعبۂ اردو سے وابستہ ڈاکٹر عادلہ فاطمہ نے بخوبی انجام دیے۔ مہمان محترم

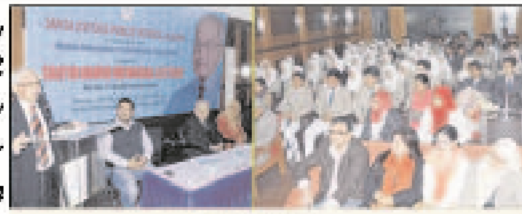
سید حامد یادگاری خطبہ کا منظر

اسلم جمشید پوری نے اپنے خصوصی لیکچر میں عصمت چغتائی کے فکروفن پر سیر حاصل بحث کی اور ان کے افسانوں، کہانیوں اور مکتوبات میں خواتین کے مسائل پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو ادب میں خواتین کے مسائل اور ان کی پریشانیوں کے لیے آواز بلند کرنے والی اگر کوئی خاتون تھی تو وہ عصمت چغتائی تھی۔ انھوں نے خواتین کی پریشانیوں اور ان کے مختلف مسائل کو جس بے باکی سے سماج میں پیش کیا وہ ہندوستانی مصنفین میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ایم جی ایم کالج کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عابد حیدری نے اسلم جمشید پوری کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اسلم جمشید پوری موجودہ دور میں اردو فکشن نگاری کی ایک اہم آواز ہیں۔ تقریب میں کالج مینجمنٹ کمیٹی کے جوائنٹ سکریٹری ببیتے اگروال نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کی لڑکیوں کو عصمت چغتائی کی کہانیاں حوصلہ دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ارون کمار گپتا نے خطبہ صدارت پیش کیا جس میں اس طرح کے پروگرام منعقد کرنے پر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

روزنامہ [illegible] 16 دسمبر 2015

سید حامد یادگاری خطبہ

جامعہ اسکالرس پبلک اسکول کے زیر اہتمام نوبل ایجوکیشن فاؤنڈیشن نئی دہلی کے اشتراک سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر، جامعہ ہمدرد کے سابق چانسلر، عظیم ماہر تعلیم اور سماجی جہد کار سید حامد کی پہلی برسی کے موقعے پر اسکول کیمپس میں منعقدہ سید حامد یادگاری خطبۂ پیش کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے افسر رابطہ عامہ ڈاکٹر راحت ابرار نے کہا کہ سرسید کے بعد سید حامد شمالی ہند کی عظیم ترین شخصیت تھے جنھوں نے سرسید کے مشن کو فروغ دینا ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ سید حامد نے قوم میں تعلیمی بیداری کی غرض سے تعلیمی کارواں شروع کیا اور انھیں یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے اس تعلیمی کارواں میں سید حامد کے ساتھ زندگی کا سب سے بڑا سفر طے کیا۔ ڈاکٹر راحت ابرار نے کہا کہ مسلمانوں میں تعلیمی فروغ کی بات کی جائے تو سرسید کے بعد حامد کا نام آتا ہے۔ سید حامد کا سب سے بڑا کارنامہ ہمدرد اسٹڈی سرکل ہے جو ملک میں سب سے زیادہ آئی اے ایس پیدا کرتا ہے۔

پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے ممتاز ماہر تعلیم اور پروفیسر ایمریٹس فرحت اللہ خاں نے کہا کہ سید حامد جیسی عظیم شخصیت کے لیے ایک یوم کافی نہیں ہے۔ انھوں نے اسکول کے طلبا و طالبات کو مشورہ دیا کہ وہ عظیم شخصیات کی سوانح کا مطالعہ کریں اور انھیں اپنا آئیڈیل بنائیں۔ انھوں نے کہا کہ شخصیت سازی اور ادارہ سازی ہی سید حامد کو سب سے بڑا خراج عقیدت ہوگا۔ اس سے قبل اسکول کے سرپرست ڈاکٹر نسیم احمد نے کہا کہ سید حامد جیسی شخصیات صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سید حامد کی کوششوں سے ہی اے ایم یو ایکٹ میں دسمبر 1980 میں ترمیم کی گئی جس کے تحت اے ایم یو ایکٹ میں سیکشن 5 (2) (سی) کو جوڑا گیا جس کی رو سے اے ایم یو کو ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی اور ثقافتی فروغ کی ذمہ داری تفویض کی گئی

روزنامہ سیاسی تقدیر دہلی، 30دسمبر 2015

عشرت علی صدیقی اور قومی آواز

[illegible]: عشرت علی صدیقی مرحوم اردو صحافت کی بہادر و نڈر زبان کے ایک بہادر سپاہی تھے اور انھوں نے اپنی اس شجاعت کا مظاہرہ ایمرجنسی کے نفاذ کی مخالفت اس

ادارے سے کرکے دکھائی تھی۔ ان تاثرات کا اظہار واضح ذی علم میں سماجی تنظیم پرینا ایکشن سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک سیمینار بعنوان 'عشرت علی صدیقی اور قومی آواز' کے موقعے پر معروف صحافی و تقریب کے مہمان خصوصی عبیداللہ ناصر نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ملک کی آزادی سے قبل ایک جماعت کی زبان تھی اور اس کے تیور جارحانہ تھے لیکن آزادی کے بعد وہ بدقسمتی سے نا انصافی کی مخالفت کی زبان بن گئی۔ عشرت علی صدیقی اسی اردو زبان کے ایک ماہر صحافی تھے۔ انھوں نے نہایت سلیقہ اور زبان کی شائستگی کے ساتھ قوم کے جملہ مسائل اور ملکی معاملات پر اپنی بات رکھی۔ انھوں نے دور حاضر خاص طور پر اگلی پیڑھی کے صحافیوں کو ان کی صحافتی ذمہ داریوں کو پیشہ ورانہ طریقہ سے نبھانے کی ترغیب دی۔ انھوں نے قومی آواز کی رہنمائی کے علاوہ قوم کی بھی رہنمائی کی۔ کانگریس کا اخبار ہونے کے باوجود قومی آواز کو انھوں نے کبھی کانگریس کا ترجمان نہیں بننے دیا بلکہ ایک توازن قائم رکھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (نیوز) محمد معراج الدین خاں نے اپنے خطاب میں عشرت علی کو ایک بے باک ایماندار اور قوم پرست صحافی بتایا۔ انھوں نے کہا کہ ایک اعلیٰ درجے کے صحافی کی ساری صفات ان کے اندر موجود تھیں۔ اس موقعے پر مرکزی محکمہ اطلاعات کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اشاعت) عارف رضوی نے کہا کہ قومی آواز اور عشرت علی صدیقی ایک دوسرے کے مظہر تھے۔ دور حاضر کی اردو صحافت پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آج کی اردو صحافت اپنے ماضی کا معیار کھو چکی ہے۔ کٹ پیسٹ کے چلن نے اردو صحافت کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر خیرالحسن عظمی کی زیر نظامت منعقدہ سیمینار کا آغاز حافظ محمد حسان کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ سیمینار کی صدارت سیکنڈری پرنسپل ڈاکٹر احسن بیگ نے کی۔ تقریب کے اختتام پر کنوینر محمد سلیم نے آئے ہوئے سبھی مہمانوں و سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، [illegible] جنوری 2016

کل ہند انجمن استادان فارسی کی 34ویں سالانہ کانفرنس

کل ہند انجمن استادان فارسی کی 34ویں سالانہ کانفرنس شعبہ فارسی پٹنہ یونیورسٹی کے اشتراک سے پٹنہ میں منعقد ہوئی جس کے افتتاحی جلسے میں انجمن کی صدر پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے صدارتی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر صفوی گزشتہ 20 سالوں سے اس انجمن کی صدر ہیں اور اس فریضے کو وہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہیں۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں ہندوستان میں فارسی زبان کی اہمیت اور خصوصاً بہار کے علما، شعرا، فضلا اور خانقاہوں کی فارسی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ فارسی زبان ہماری قدیم میراث ہے اور اسے خارجی زبان کہہ کر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ اس موقعے پر پروفیسر صفوی نے انجمن کے دیگر اراکین اور فارسی اساتذہ

کے ساتھ حکومت بہار کے وزیر تعلیم جناب اشوک چودھری سے ملاقات کی اور انھیں بہار میں اردو کی صورت حال سے آگاہ کراتے ہوئے میمورنڈم بھی دیا۔ وزیر تعلیم نے ان کی میمورنڈم کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ پڑھا اور اس تعلق سے ہر ممکن تعاون کا بھروسہ دلایا۔ انھوں نے ڈائرکٹر ہائر ایجوکیشن کو اس سلسلے میں جلد سے جلد اقدام کرنے کی ہدایت کی ہے۔

روزنامہ صحافت دہلی، 4 جنوری 2016

اردو مضمون میں زیادہ نمبر لانے والی طالبہ کو انعام

سنبھل: شہر کے معروف تعلیمی ادارہ آزاد گرلس کالج میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں حکومتی پالیسی کے مطابق 300 طلبا و طالبات کو ڈریس تقسیم کیے گئے۔ اس موقعے پر سنبھل کے سابق ایم پی شفیق الرحمن برق، شہر کے سینئر اردو ٹیچر حاجی عطاء اللہ اور ضیاء الرحمن برق موجود رہے۔ اس موقعے پر 12ویں کلاس کی طالبہ عما اقبال کو اردو مضمون میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر اسے فخر سنبھل سرٹیفکیٹ اور 5001 روپے کا چیک دیا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت حاجی عطاء اللہ نے کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر شفیق الرحمن برق صاحب نے اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں تعلیم کی اہمیت کو سمجھیں اور زیادہ سے زیادہ تعلیم کی طرف توجہ دیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر کشور جہاں زیدی نے بھی خطاب کیا۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا نئی دہلی، 20 دسمبر 2015

اڑیسہ

اڑیسہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام کل ہند مشاعرہ

اڑیسہ: اڑیسہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام کل ہند مشاعرے کا اہتمام کٹک کے چار روزہ ”لوک مہوتسو“ کے آخری دن سوموار 21 دسمبر 2015 کو کٹک بارہ باٹی ریلوے کے دکشن میدان میں کیا گیا۔ اس موقع پر اربن ہاؤسنگ کے وزیر جناب پشپیندر سنگھ دیو، سکریٹری اڑیسہ اردو اکادمی، جناب داؤد الرحمن صاحب، حاجی جناب ایوب خان ایم ایل اے، کٹک بارہ باٹی، حبیب الرحمن بخش کے علاوہ اکادمی ملازمین اور سیاسی پارٹی کے کئی لیڈران نے اپنی شرکت سے مشاعرہ کو رونق بخشا۔ اس موقعے پر سکریٹری داؤد الرحمن نے کہا کہ اردو زبان ہماری تہذیب و ثقافت کا ایک مضبوط ترین حصہ ہے۔ مشاعرے کا انعقاد ”لوک مہوتسو“ میں ان معنوں میں اہمیت رکھتا ہے کہ تمام فنون لطیفہ کے ساتھ اردو زبان کو بھی فروغ ملے۔ ہزاروں افراد کی بھیڑ اس بات کی ضمانت ہے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ جناب داؤد الرحمن نے پشپیندر سنگھ دیو اور حاجی جناب ایوب خان صاحب کی قومی و ملی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔

وزیر موصوف جناب پشپیندر سنگھ دیو نے کہا کہ داؤد الرحمن صاحب اڑیسہ اردو اکادمی کے سکریٹری بننے کے بعد اڑیسہ کا نام بیرون صوبہ اور ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا ہے۔ ایم ایل اے حاجی جناب ایوب خاں نے بھی اپنے ہدیۂ تشکر میں کہا کہ داؤد الرحمن نے اڑیسہ کے مختلف علاقوں میں اردو کے پروگرام کا انعقاد کرکے ملک میں قومی یکجہتی کی راہ میں سازگار ماحول بنانے کا اہم کام انجام دے رہے ہیں۔

عمران ساحل نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ داؤد الرحمن نے مشاعرے کے ذریعہ اردو کا جو معیار پیش کیا ہے جسے ہم لوگ کم ہی مشاعرے میں دیکھ پا رہے ہیں۔ آج کا مشاعرہ بے حد کامیاب رہا اور کئی بار محسوس ہوا کہ خالص اردو کا مشاعرہ وقار کے ساتھ وجود میں آیا۔

مشاعرہ کا افتتاح پشپیندر سنگھ دیو، داؤد الرحمن، حاجی ایوب خان صاحبان نے شمع روشن کرکے کیا۔ مشاعرے میں جن شعرا کرام کی شرکت ہوئی ان میں سریندر سنگھ شجر، الطاف ضیا، عزم شاکری، عمران راقم، صداق اعظمی، کاوش رودولوی، محترمہ مسعود تبسم، اقبال بھوپالی، ڈاکٹر کمار پاشی، اقبال اعظمی، سمیع الحق شاکر، سنیل کمار تنگ، حبیب الرحمن بخش، حنا ایوب اور حکیم الشہمی وغیرہ رونق محفل رہے جنھوں نے اپنے کلام سے شعرا اور سامعین کو محظوظ کیا۔

رپورٹ: جناب حبیب الرحمن بخش، کوآرڈینیٹر مشاعرہ، اڑیسہ اردو اکادمی، اڑیسہ، 29 دسمبر 2015

بہار

بہار اردو اکادمی کی جانب سے تعاون کا اعلان

پٹنہ: بہار اردو اکادمی نے مالی سال 2015-16 میں بہار کے اردو شاعروں، مصنفوں اور صحافیوں کو علاج و معالجہ کے لیے تین لاکھ تیس ہزار روپے دینے کا اعلان کیا ہے۔ اکادمی نے بیمار و معذور ادبا و شعرا اور صحافیوں سے درخواستیں طلب کی تھیں۔ وقت مقررہ کے اندر دو درجن درخواستیں موصول ہوئیں اور ان سے منسلک سارے کاغذات کی جانچ کرتے ہوئے کمیٹی نے ہر ایک درخواست پر توجہ دی اور ان حضرات کے لیے رقم مختص کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ بہار اردو اکادمی کی ذیلی مالیاتی کمیٹی نے اردو انجمنوں اور سوسائٹیوں سے موصول درخواستوں پر بھی غور و خوض کے بعد ستر انجمنوں اور سوسائٹیوں کو چھ لاکھ پچاس ہزار روپے کی اعانت کا فیصلہ کیا۔ کمیٹی کے ممبران نے اس بات پر زور دیا کہ جس سوسائٹی یا انجمن کو بھی رقم دی جائے اسے اس بات کی ہدایت ضرور کی جائے کہ وہ اکادمی کے ذریعہ دی گئی رقم سے جب بھی کوئی فنکشن کریں تو اس کی اطلاع اکادمی کو ضرور دیں اور پروگرام کے بعد اس کی تفصیلات کے ساتھ واضح فوٹو کاپی بھی اکادمی کو ضرور بھیجیں۔ اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے بتایا کہ اردو اکادمی چاہتی ہے کہ پورے بہار میں مختلف انجمنیں، سوسائٹیاں اور صدر شعبہ اردو کے ذریعہ اردو کے تعلق سے مختلف پروگرام ہوں جس سے اردو کا فروغ ہو۔ اکادمی کی ذیلی، مالیات کمیٹی کی نشست نائب صدر اکادمی جناب سلطان اختر کی صدارت میں ہوئی جس میں پروفیسر اعجاز علی ارشد، منصور احمد اعجازی، شمیم ہاشمی، جناب حسن اور مشتاق احمد نوری نے ممبر سکریٹری کی حیثیت سے شرکت کی۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 31 دسمبر 2015

اردو ہماری زبان ہی نہیں وراثت بھی ہے: شفیع مشہدی

پٹنہ: اردو صرف ہماری زبان ہی نہیں ہماری وراثت بھی ہے جسے بغیر کسی خیانت کے اگلی نسل تک منتقل کرنا ہمارا فرض ہے۔ یہ بات صحافیوں سے بات چیت کے دوران محکمہ راج بھاشا کی اردو مشاورتی کمیٹی کے چیئرمین شفیع مشہدی نے کہی۔ ان دنوں وہ بہار کی دوسری سرکاری زبان اردو کے تحفظ اور فروغ کے موضوع پر دانشوروں کے مختلف طبقات سے صلاح و مشورہ کر رہے ہیں تاکہ مشاورتی کمیٹی کی آئندہ میٹنگ کے ایجنڈے طے کر سکیں۔ اس موقعے پر انھوں نے بتایا کہ اردو مشاورتی کمیٹی اردو ملازمین کو ایک سوالنامہ بھیج رہی ہے جس میں ان سے دریافت کیا جائے گا کہ اب تک اردو قانون پر کتنا عمل درآمد ہوا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز کریمی نے بتایا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ میں عملوں کی بے حد کمی ہے لیکن اب اردو ڈائرکٹر کو صدر شعبہ کا درجہ حاصل ہو گیا ہے اور امید ہے کہ یہ کمی بھی عنقریب دور کر دی جائے گی نیز مالی سال 2016-17 کے لیے 70 کروڑ کا علاحدہ بجٹ بنا کر بھیج دیا گیا ہے۔ نشست میں تمام شرکا نے اردو اخباروں کو کم اشتہار دیے جانے پر تشویش کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر انوار الہدیٰ، احمد جاوید اور سید شہباز عالم نے اردو مشاورتی کمیٹی کو آئینی اختیارات دیے جانے اور دیگر سہولیات دیے جانے پر زور دیا۔ اس کے بغیر کمیٹی کی افادیت اور معنویت نامکمل ہے۔ احمد جاوید نے مستعد اور کارکرد ہونے کے

کے لیے دفتری اصطلاحی لغت کی تدوین پر بھی زور دیا جبکہ جناب شہودی نے شرکا کو مطلع کیا کہ اس سلسلے میں انھوں نے اچھی پہل کی ہے اور سکریٹریٹ مینوئل میں شامل ہندی اصطلاحو ں کے مقابل اردو اصطلاحی فرہنگ کی ترتیب کا کام انھوں نے مکمل کروالیا ہے۔ جس پر ماہرین کی رائے لینے کے بعد جنوری 2016 میں اس کو حتمی شکل دے دی جائے گی۔ شرکائے نشست میں اشرف فرید، ڈاکٹر ریحان غنی، راشد احمد، انوار اللہ اور سرور حسین بھی شامل تھے۔

روزنامہ انقلاب پٹنہ/دہلی، 30 دسمبر 2015

لائبریریوں کی معاونت کا اعلان

پٹنہ: بہار اردو اکادمی بہار کی اردو لائبریریوں کی معاونت کرے گی۔ یہ اطلاع بہار اردو اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے دی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بہار اردو اکادمی کی لائبریری ذیلی کمیٹی کی میٹنگ میں بہار کی لائبریریوں کے لیے اعانت اور کتابوں کے دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک اشتہار جاری کرکے سبھی لائبریریوں سے مقررہ تاریخ تک اکادمی کے فارم میں درخواست دینے کا اعلان اردو اخباروں میں شائع کیا گیا تھا جس کے پیش نظر کل 20 لائبریریوں سے درخواستیں موصول ہوئی ہیں۔ سبھی کاغذات اور کتابوں کی تعداد کے ساتھ کارگزاریوں کی روشنی میں ذیلی کمیٹی کے ممبران نے اتفاق رائے سے ان کے لیے رقم منظور کرنے کا فیصلہ کیا۔ سبھی لائبریریوں کو ملا کر 6 لاکھ 50 ہزار کی رقم اعانت کی شکل میں منظوری گئی اور انھیں اکادمی کی جانب سے کتابیں دینے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ ساتھ ہی ان سبھی لائبریریوں کے نام 'زبان و ادب' بھی جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

روزنامہ انقلاب پٹنہ/دہلی، 29 دسمبر 2015

تلنگانہ:

مانو کے بیرونی یونیورسٹیوں سے معاہدے کی تجویز

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی بیرونی ممالک کی ممتاز یونیورسٹیوں کے ساتھ معاہدہ کرنے کی تجویز رکھتی ہے۔ اس بات کا انکشاف یونیورسٹی کے چانسلر ظفر سریش والا نے ایک انٹرویو میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ ترکی کی 2 اور ملیشیا کی ایک یونیورسٹی کے ساتھ معاہدہ کرنے کی تجاویز ان کے پاس آئی ہے۔ وہ یونیورسٹی میں ترکی زبان کی تعلیم بھی متعارف کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے یونیورسٹی کی ترقی کے منصوبوں کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ چانسلر نے کہا کہ یونیورسٹی کے فاصلاتی کورسز کو ڈیجیٹائز کرنے پر بھی ان کی توجہ ہوگی اور ان کا مقصد اس یونیورسٹی کے تعلیم کے معیار کو آکسفورڈ کی سطح کا بنانا ہے۔ ظفر سریش والا نے کہا کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اسلم پرویز بھی ان کے ہم خیال ہیں۔

روزنامہ تعمیری دہلی، 4 جنوری 2016

کرناٹک:

غالب کے خطوط

بنگلورو: غالب کے 218 ویں یوم پیدائش کی مناسبت سے غالب کے خطوط پر مشتمل انیس اعظمی کا مشہور زمانہ پروگرام 'غالب کے خطوط' کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے بنگلورو میں پہلی مرتبہ بروز ہفتہ 26 دسمبر 2015 نیشنل گیلری آف ماڈرن آرٹس، پیالس روڈ، بنگلورو کے آڈی ٹوریم میں پیش کیا گیا۔ اس پروگرام کی افتتاحی تقریب کی صدارت ڈاکٹر فوزیہ چودھری،

چیئرپرسن، کرناٹک اردو اکادمی نے کی اور سامعین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہماری ہر کوشش ہی اس لیے ہوتی ہے کہ ہم اردو کو اس مقام پر دیکھنے کے خواہش مند ہیں جہاں اصل میں اسے ہونا چاہیے۔ اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ہماری شان ہے۔ محترمہ بی ٹی للیتا نائک، کنڑ ادیب و سابق وزیر اور رؤف خان، صدر، مہاراشٹر اردو اکادمی، ممبئی نے مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ محترمہ بی ٹی للیتا نائک نے کہا کہ ہر زبان ریاست کی ملکیت ہوتی ہے اور اردو ملک کی عظیم زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ رؤف خان، صدر، مہاراشٹر اردو اکادمی نے اپنے بیان میں کہا کہ پورے ہندوستان میں اردو زبان اگر کشمیر کے بعد سب سے زیادہ کہیں بولی جاتی ہے تو وہ یاستہ مہاراشٹر ہے۔

روزنامہ جدید خبر دہلی، 31 دسمبر 2015

اعزاز و اکرام:

رگھوویر چودھری کو 2015 کا گیان پیٹھ ایوارڈ

نئی دہلی: معروف گجراتی ادیب رگھوویر چودھری کو اس سال کا گیان پیٹھ ایوارڈ تفویض کیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ اس ایوارڈ کو دینے کے لیے منتخب کی جانے والی کمیٹی نے کیا ہے۔ اس کمیٹی کی صدارت سینئر نقاد نامور سنگھ نے کی۔ گجرات کے معروف مصنف اور گاندھی وادی کہلانے والے رگھوویر کو اس سے قبل ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ ان کی 80 سے زائد تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں ان میں نظموں کے مجموعے اور ناول شامل ہیں۔ ان کی مشہور تخلیقات کا نام امرت، اپرواس، سہواس اور انتر واس ہے۔ واضح رہے کہ گیان پیٹھ کا یہ باوقار ایوارڈ چودھری سے قبل 3 گجراتی مصنفین کو مل چکا ہے۔ روزنامہ انقلاب دہلی، 30 دسمبر 2015

شہنشاہ جذبات دلیپ کمار کو پدم وبھوشن

ممبئی: شہنشاہ جذبات دلیپ کمار کو ایک مختصری تقریب میں ملک کے سب سے بڑے دوسرے شہری ایوارڈ پدم وبھوشن سے سرفراز کیا گیا۔ اداکار دلیپ کمار کو یہ ایوارڈ ان کی باندرہ کی رہائش گاہ پر وزیر داخلہ راجناتھ سنگھ کے ہاتھوں دیا گیا۔ اس موقعے پر مہاراشٹر کے گورنر ودیا ساگر راؤ، وزیر اعلیٰ دیویندر فرنویس اور ابھینیتری شیلا ر بھی موجود تھے۔ 93 سالہ دلیپ کمار کو یہ ایوارڈ ان کی

سالگرہ کے 2 روز بعد پیش کیا گیا۔ اطلاعات کے مطابق دلیپ کمار کو ایوارڈ دیتے وقت کرسی پر بیٹھایا گیا تھا۔ سیاہ رنگ کے سوٹ میں ملبوس دلیپ کمار نے ایوارڈ حاصل

کرتے وقت صرف تھوڑی سی آنکھیں کھولیں اور اشاروں سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اس موقعے پر ان کی اہلیہ قلم اداکارہ سائرہ بانو جذباتی ہو گئیں اور ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 14 دسمبر 2015

محمد علی جوہر اکادمی کی 27 ویں تقسیم ایوارڈ تقریب

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم میں مولانا محمد علی جوہر اکادمی کے زیر اہتمام منعقد 27 ویں سالانہ جلسہ تقسیم ایوارڈ میں دانشوروں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر نے تحریک آزادی کے دوران جس جذبۂ حریت کا مظاہرہ کیا تھا۔ آج ملک کو ایک بار پھر اسی جذبے کی ضرورت ہے۔ ان کی والدہ بی اماں نے اپنے بیٹوں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کے اندر آزادی کی جو روح پھونکی تھی آج وہ روح

کہیں کھو گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم آج نہ صرف یہ کہ ان مجاہدین آزادی کو یاد کریں بلکہ ان کے نقش قدم پر چل کر ملک کو ایک نئی روشنی کی طرف لے جائیں۔ صدارتی خطبہ میں جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے مولانا محمد علی جوہر کی قربانیوں کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ ان کی مسلسل جدوجہد اور قوم پرستی کی لازوال نشانی ہے۔ ان کی یاد میں ہونے والے پروگرام کا جامعہ میں منعقد ہونا ایک خوش آئند قدم ہے۔ اکادمی کے صدر پروفیسر خواجہ ایم شاہد نے مولانا محمد علی جوہر کی قربانیوں کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ وہ جنگ آزادی کی ایک قدآور شخصیت تھی۔ ان کی والدہ بی اماں نے جس طرح مولانا محمد علی جوہر کے والد کے انتقال کے بعد اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور ان کے اندر جوش آزادی پیدا کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہالی ڈے گریس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایس فاروق نے برطانوی تسلط سے آزادی پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر کی قربانیاں آزادی کے متوالوں کے اندر نیا جوش پیدا کرتی تھیں۔ ہمارے بزرگوں نے ملک کے لیے جب قربانی پیش کی تھی تو انھوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ملک دو ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ دوارکا حلقے سے عام آدمی پارٹی کے رکن اسمبلی آدرش شاستری نے کہا کہ آج وقت بہت نازک آ گیا ہے۔ ملک کو آزاد ہوئے تقریباً 70 سال ہو رہے ہیں لیکن ملک کا جو ماحول ہے وہ باعث تشویش ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مجاہدین آزادی نے جو خواب دیکھا تھا ملک اس سے کہیں بھٹک گیا ہے۔ مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کالی کٹ کے صدر ڈاکٹر پی اے فضل غفور نے بھی مولانا محمد علی جوہر اور دیگر مجاہدین آزادی کی قربانیوں کو یاد کرتے ہوئے ملک کے موجودہ ماحول پر اظہار خیال کیا۔ صحافی سہیل انجم نے پروگرام کی نظامت کی۔ اس موقعے پر آدرش شاستری، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر فیضان مصطفیٰ، ڈاکٹر پی اے فضل غفور، انجم عثمانی، محمد عارف، پروفیسر زویا حسن اور سلیم صدیقی کو مختلف میدانوں میں ان کی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ دیے گئے۔ پروفیسر زویا حسن کو بی اماں ایوارڈ اور سلیم صدیقی کو ایم سلیم میموریل ایوارڈ دیا گیا۔ مولانا محمد علی جوہر اکادمی کے بانی ایم سلیم کو بھی خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ آخر میں ندیم احمد، جنرل سکریٹری اکادمی نے شرکا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 13 دسمبر 2015

محمد حسین پرکار کو جھلا رتن ایوارڈ

وودلی: بارہویں انٹرنیشنل سیمتیلی سمیلن 2015 مورخہ 22، 23 دسمبر 2015 کو بمقام وروار کمینی مہاراشٹر میں منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر جہاں سیمتیلی زبان کی نمایاں خدمات کے لیے اس زبان کے ادبا و شعرا کو اعزازات سے نوازا گیا وہیں ملک کی دیگر زبانوں میں زبان و ادب کی خدمت کرنے والے قلم کاروں کو بھی ایوارڈ عطا کیے گئے۔ اردو زبان کی بے لوث و بے مثل خدمات کے لیے محمد حسین پرکار کو جھلا رتن ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ ان کی بحیثیت مصنف، مترجم اور غیر اردو داں طلبہ کو مسلسل دو دہائی سے زائد عرصے سے اردو کی تعلیم دیتے رہنے کا اعتراف ہے۔

رپورٹ: شریکات چودھری حسن سمان، پھیلو شمیں، 29 دسمبر 2015

مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کی تیسری تقریب تقسیم اسناد کے مناظر

مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کی تیسری تقریب تقسیم اسناد

پٹنہ: مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کا قیام مختلف زبانوں کے فروغ کے لیے ہوا ہے۔ یہ یونیورسٹی مولانا مظہر الحق کے خوابوں کی تعبیر اور ان کی یادگار ہے۔ اس لیے اس یونیورسٹی کی ترقی صرف ہماری ذمے داری ہی نہیں جواب دہی بھی ہے۔ وزیر تعلیم اشوک چودھری نے یہ باتیں کہیں۔ مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کی تیسری تقریب تقسیم اسناد سے وہ خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس یونیورسٹی کا قیام مختلف زبانوں کے فروغ کے لیے کیا گیا ہے اس لیے یونیورسٹی کی تقریب میں انگریزی کے بجائے اردو زبان کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے یہ کہہ کر یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر شرف الدین چودھری کی تقریر پر کیا جو انگریزی زبان میں خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں خود اتنی چاشنی ہے کہ وہ دوسری زبانوں کی شیرینی بڑھا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی اداروں میں اردو کی تعلیم کے بہتر انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ حکومت اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کر رہی ہے۔ چودھری نے کہا کہ بہار میں معیاری تعلیم ان کا اہم مقصد ہے۔ اس موقعے پر وائس چانسلر پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ طلبا اپنا ایک ہدف طے کریں اور اسے حاصل کرنے کے لیے باضابطہ کوشش کریں۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر شرف الدین چودھری نے یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ پیش کی اور اس موقعے پر یونیورسٹی کے مجلہ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ مختلف کورسز بشمول عالم، فاضل، ایم اے، بی اے اور ووکیشنل کورسز کے ٹاپروں کو اسناد اور

چیک تقسیم کیے گئے۔ تقریب میں یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ اور اکیڈمک کونسل کے ممبران سمیت اساتذہ اور ملازمین بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 23 دسمبر 2015

جمیل نظام آبادی کو اردو اکادمی تلنگانہ کا ایوارڈ

نظام آباد: اردو کے ممتاز شاعر، ادیب، صحافی و ادارہ گونج کے سربراہ جمیل نظام آبادی کو اردو اکادمی تلنگانہ اسٹیٹ کی جانب سے شاعری کے زمرہ میں کارنامۂ حیات

کا ایوارڈ دیا گیا جو ان کی چالیس سالہ شعری، ادبی و صحافتی خدمات کا اعتراف ہے۔ یہ ایوارڈ اہل اردو اور اہلیان نظام آباد کے لیے خوشی و مسرت کا موقع فراہم کرتا ہے۔ جمیل نظام آبادی کا شعری و ادبی سفر ایک جہد مسلسل اور صبر و استقامت کی اعلیٰ مثال ہے۔ انھوں نے نامساعد حالات میں ضلع نظام آباد سے اردو کی شمع کو جلائے رکھا اور اپنی شعری خدمات، گونج کے ذریعے صحافتی خدمات اور نو مشق شاعروں کی اصلاح اور دیگر تنظیمی و سماجی خدمات سے نظام آباد کا نام ساری دنیا میں روشن کیا۔ ان خیالات کا اظہار شہر نظام آباد کے مختلف شعرا، ادیبوں، اساتذہ اور دانشوروں نے تہنیتی تقریب سے خطاب کے دوران کیا۔ تقریب کی صدارت سید مجیب علی نے کی۔ مہمان خصوصی ریاض تنہا تھے۔ دیگر مہمانوں میں محمد عبدالعلیم، ڈاکٹر محمد ناظم علی، ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے بھی شرکت کی۔ محمد عبدالبصیر نے جلسے کی نظامت کی اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ جدید خبر، دہلی، 31 دسمبر 2015

معروف شاعرہ ڈاکٹر افروز کا استقبالیہ

نئی دہلی: کویت کے معروف ادیب و شاعرہ ڈاکٹر افروز کی کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی آمد پر کالج کے شعبۂ اردو نے ان کے اعزاز میں ادبی نشست کا اہتمام کیا۔ پرنسپل ڈاکٹر دنیش کھنہ نے ان کا پرجوش خیرمقدم کیا۔ کالج کی دیرینہ ادبی روایات کے مطابق پروگرام کے صدر ڈاکٹر یحییٰ صبا نے مہمان شاعرہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر افروز بیک وقت شاعرہ، صحافی، نقاد اور نثر نگار ہیں۔ ڈاکٹر موصوفہ اس توانا روایت کا حصہ ہیں جنھیں اردو زبان و ادب سے عشق ہے۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے عربی کے ماحول میں اردو کا چراغ روشن کر رکھا ہے۔ موصوف کے کئی شعری مجموعے ہیں۔ ساتھ ہی اردو کی صورت حال پر موصوف نے 'کویت میں ادبی پیش رفت' نامی کتاب بھی تحریر کی ہے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر عارف اشتیاق نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر افروز نے کویت میں اردو کی موجودہ صورت حال اور سرگرمیوں سے بھی سامعین کو واقف کرایا کہ کویت میں 14 لاکھ آبادی کویت نسل کی ہے۔ 8 لاکھ ہندوستانی ہیں، ایک سوا لاکھ پاکستانی ہیں۔ عربی کے بعد اردو کویت کی سب سے بڑی زبان ہے۔ وہاں تین بڑی جامعات گلف یونیورسٹی، آسٹریلین یونیورسٹی اور کویت یونیورسٹی تعلیمی میدان میں کام کر رہی ہیں۔ پاکستان کے سات اسکول ہیں، جن میں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ ہندوستانی اسکولوں میں صورت حال مختلف ہے۔ یہاں چند اسکولوں میں ہی اردو پڑھائی جاتی ہے۔ تقریب میں ڈاکٹر خالد اشرف کے علاوہ ڈاکٹر حبیب احمد خان، ڈاکٹر شروان کمار، ڈاکٹر ہردی ریتا، ڈاکٹر کپل اروڑا، ڈاکٹر ہیرا لنگل نے بھی شرکت کی۔ ڈاکٹر دنیش کھنہ نے پروگرام کے کامیاب انعقاد پر خوشی کا اظہار کیا۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 17 دسمبر 2015

ایک شام ناشاد اورنگ آبادی کے نام

نئی دہلی: تعمیر ملت فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام مالویہ نگر، نئی دہلی میں بزرگ شاعر ناشاد اورنگ آبادی کے اعزاز میں ایک پروگرام 'ایک شام: ناشاد اورنگ آبادی کے نام' کا اہتمام کیا گیا۔ تعمیر ملت فاؤنڈیشن کے صدر مرزا ذکی احمد بیگ نے خیر مقدمی و تعارفی کلمات پیش کیے۔ اس کے بعد فاؤنڈیشن کے صدر نے پروگرام کے مہمان خصوصی ناشاد اورنگ آبادی کا پھولوں کا ہار پہنا کر اور شال پیش کر کے استقبال کیا۔ اس موقع پر فاؤنڈیشن کے مقامی سرپرست عبیدالرحمن سابق ڈائرکٹر وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند کا بھی مرزا ذکی نے پھولوں کا ہار پیش کر کے استقبال کیا۔ پروگرام کے شرکا کو مہمان خصوصی ناشاد اورنگ آبادی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے مرزا ذکی احمد بیگ کی ترتیب دی کتابچہ پر مشتمل دو صفحاتی رپورٹ بھی پیش کی گئی۔ پروگرام کی صدارت مشہور شاعر و ادیب ڈاکٹر ظفر کمالی نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر واحد نظیر نے کی۔ اخیر میں فاؤنڈیشن کے سرپرست عبیدالرحمن کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام کا اختتام ہوا۔

روزنامہ خبریں، دہلی، 15 دسمبر 2015

پروفیسر نوشابہ صدیقی کا استقبالیہ

علی گڑھ: اردو ادب میں شاعری کی قدر و قیمت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن انسان کی فطرت کے قریب کہانی کے سوا کوئی دوسری صنف نظر نہیں آتی۔ کہانی کے ذریعہ زندگی کی تہذیب کا سفر شروع ہوتا ہے۔ داستان، ناول، افسانہ اور افسانچہ کہانی کے ہی مختلف روپ ہیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف نقاد پروفیسر علی احمد فاطمی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پاکستان سے آئی ہوئی پروفیسر نوشابہ صدیقی کے اعزاز میں منعقد استقبالیہ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ زمانے کی تبدیلی اور ترقی کے ساتھ فکشن میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ تحریک، روایت اور فن کے لحاظ سے فکشن روز بروز ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ فکشن صرف خیالی بات بیان کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے لیے فلسفۂ حیات اور فلسفۂ عمل بھی ضروری ہے۔ رسالہ 'سب رس' کے مدیر پروفیسر بیگ احساس نے اپنی گفتگو جدیدیت کے رجحان سے متاثر ہو کر لکھے گئے افسانوں کے حوالے سے کرتے ہوئے کہا کہ اس دور میں افسانوں کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا۔ حالانکہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر بھی کئی افسانہ نگار اپنی تخلیقات پیش کر رہے تھے۔ پاکستان کی معروف فکشن نگار پروفیسر نوشابہ صدیقی نے پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے درسگاہ سرسید احمد خان سے اپنے آبا و اجداد کے تعلقات کا ذکر کیا۔ اس موقع پر انھوں نے شعبہ کی لائبریری کو اپنی کتابیں بھی ہدیہ کیں۔ انھوں نے 2014 میں ہندوستان کے سفر پر مشتمل سفرنامہ 'چشم نم' میں شامل علی گڑھ سے متعلق اقتباسات بھی پڑھ کر سنائے۔ شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر سید محمد ہاشم نے شعبہ کی تخلیقی اور تحقیقی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ فی الوقت شعبہ کے سو سے زائد ریسرچ اسکالر ہیں جن میں 30 سے زائد تخلیق کار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ریسرچ اسکالرس نے نہ صرف یہ کہ شاعری، ناول اور افسانے تخلیق کیے ہیں بلکہ سیمیناروں اور معیاری ادبی رسائل میں بھی ان کی سرگرمیاں قابل ستائش رہی ہیں۔

پروفیسر طارق چھتاری نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک اور 1960 کے بعد کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ پروفیسر سید محمد ہاشم نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی، پروفیسر مولا بخش،

زبیر احمد چودھری کی کتاب 'پائمان' کا اجرا

ڈاکٹر تنویر گوہر مظفر نگری کے شعری مجموعہ 'عکس تحریر' کا اجرا

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب، ڈاکٹر جناب حیدر تقوی، ڈاکٹر سراج اجملی، ڈاکٹر محمد علی جوہر وغیرہ و اساتذہ سمیت بڑی تعداد میں شعبہ کے ریسرچ اسکالر موجود تھے۔

روزنامہ اودھ نامہ علی گڑھ، 30 دسمبر 2015

رسم اجرا

'پائمان'

لکھنؤ: مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام بلوسٹ روز پبلک اسکول میں طنز و مزاح کے شاعر زبیر احمد چودھری کی کتاب 'پائمان' کے اجرا و شعری محفل کا انعقاد ہوا۔ تعارفی کلمات سوسائٹی کے روح رواں ڈاکٹر منصور حسن خاں نے پیش کیے اور مہمانان گرامی کا استقبال شیعہ پی جی کالج کے لکچرر ڈاکٹر ثروت تقی نے کیا۔ اس شعری و ادبی تقریب کی صدارت مزاحیہ گو شیام مصرا نے کی جبکہ نظامت کے فرائض شکیل گیاوی نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے سہیل احمد ایڈوکیٹ شریک ہوئے جبکہ بحیثیت مہمان اعزازی اسلامیہ کالج کے لکچرر عبدالباسط خاں اور عوام ویلفیئر سوسائٹی کے روح رواں عبداللہ صدیقی شریک ہوئے۔ 'پائمان' کا اجرا صدر محفل اور دیگر مہمانان گرامی کے ذریعے کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمود کاکوروی نے قطعات تاریخ پیش کیے۔ ڈاکٹر منصور حسن خاں نے چودھری کی شعری و ادبی خدمات پر مشتمل مسرور شاہجہاں پوری کا مقالہ پیش کیا۔ چودھری تخلص نے اپنے مجموعۂ کلام 'پائمان' میں ان مضامین کو لیا ہے جو ہماری زندگی سے وابستہ ہیں اور روزمرہ کی زندگی میں ہم ان سے دوچار ہوتے ہیں۔ 'پائمان' حمد و نعت، غزل، نظموں اور قطعات کا مجموعہ ہے۔

روزنامہ اودھ نامہ علی گڑھ، 29 دسمبر 2015

عکس تحریر

نئی دہلی: معروف شاعر ڈاکٹر تنویر گوہر مظفر نگری کے تیسرے شعری مجموعے 'عکس تحریر' کا اجرا عالمی شہرت یافتہ شاعر و اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ دہلی کے بزرگ شاعر ساز دہلوی کی صدارت اور نوجوان شاعر سید شیبان قادری کی نظامت میں منعقد اس تقریب میں دہلی کے علاوہ دوسرے شہروں کے معروف ادبا و شعرا نے شرکت کی اور تنویر گوہر کے نئے شعری مجموعے 'عکس تحریر' پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا، نیز انھیں مبارکباد پیش کی۔ اس کے بعد کل ہند مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ عکس تحریر کے خالق ڈاکٹر تنویر گوہر نے عکس تحریر کی شکل میں اردو ادب کو ایک خوبصورت تحفہ دیا ہے۔ معروف شاعر و نثر نگار شمس رمزی نے عکس تحریر پر ایک تحریری مقالہ پیش کیا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 26 دسمبر 2015

شکاری عورتیں

علی گڑھ: اترپردیش ملک کی سب سے بڑی ریاست ہے اور یہاں ہندی کے بعد اردو سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ ان خیالات کا اظہار مہمان خصوصی چیئرمین کنٹرول بورڈ برائے خواتین و اطفال حکومت

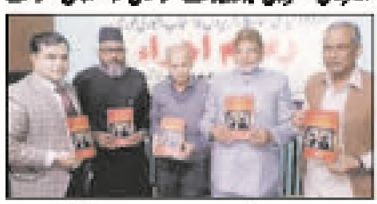

اترپردیش محمد قمر عالم نے کیا وہ البلاغ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقد معروف ادیب و صحافی ایس آر چودھری کی مرتب کردہ مطبوعہ تحریروں کا انتخاب 'شکاری عورتیں' کی رسم اجرا تقریب میں خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ زبان اور تہذیب کا مسئلہ کسی ایک قوم سے وابستہ نہیں بلکہ تمام قوموں سے ہے۔ وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو اپنی تہذیب اور ادب کے تحفظ کا بندوبست کرتی ہیں۔ انھوں نے ایس آر چودھری کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اردو ادب کی قابل قدر تحریروں کا دلچسپ انتخاب کیا ہے جس سے نئی نسل کو مطالعہ کا شوق پیدا ہوگا۔ صدر جلسہ معروف مصنف کار جاوید قادری نے کہا کہ اردو ایک زبان ہی نہیں ایک تہذیب ہے جو ہندوستانی تمدن کی وراثت کی امین ہے۔ جلسے کی نقابت کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد انس نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ایس آر چودھری کے اس انتخاب میں عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، جوش ملیح آبادی، سجاد ظہیر، مشتاق یوسفی اور کنہیا لال کپور، پرکاش پنڈت جیسے بڑے ادیبوں کی 40 تخلیقات شامل ہیں۔ مہمانان ذی وقار اور مرتب ایس آر چودھری نے البلاغ ایجوکیشنل سوسائٹی کے ذمے داران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے جس میں ہماری تہذیب پوشیدہ ہے۔ حالیہ انتخاب اردو ادب کے شاہکار مضامین کا مجموعہ ہے جو یقیناً قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اس موقعے پر شہر اور یونیورسٹی کے معززین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ سوسائٹی کے سکریٹری محمد کامران نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 14 دسمبر 2015

فصل خیال

نئی دہلی: انڈیا انٹرنیشنل سینٹر لودھی روڈ میں فیاض رفعت کے شعری مجموعہ 'فصل خیال' کی رسم رونمائی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کا باضابطہ آغاز فیاض رفعت کے صاحب زادے اظہر ہاشمی نے والد کی شان میں کلام پیش کرکے کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر آصف مستقیم نے کی۔ اس موقعے پر معروف فکشن رائٹر اور شاعرہ ڈاکٹر ترنم ریاض بھی موجود تھیں۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک خوبصورت زبان ہے۔ پنڈت نہرو کشمیری تھے لیکن اردو میں تقریر کرتے تھے اور کہا تھا کہ میں اردو میں سوچتا ہوں۔ اردو کو ہندوستان کی تہذیب و ثقافت سے علاحدہ نہیں کرسکتے ہیں۔ بہار میں اردو پر بڑا کام ہورہا ہے اسی بہار کا ایک حصہ مونگیر ہے جہاں کی ادبی نشستوں نے اردو کو فروغ دیا ہے۔ معروف ادیب انوار الحق اعظمی نے کہا کہ یہ شعری مجموعہ فیاض رفعت کی زندگی کا پورا عکس پیش کرتا ہے اور نئی نسل کی آبیاری۔ آخر میں فیاض رفعت نے اپنے مجموعہ کلام سے حمد کے بعد کچھ غزلیں پیش کیں۔ پروگرام کے اختتام پر فیاض رفعت کے داماد امتیاز عالم نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ صحافت دہلی، 25 دسمبر 2015

'مسلم سائنس دانوں کی سائنسی خدمات' کا اجرا

محمد اویس سنبھلی کی مرتب کردہ کتاب 'قلم کا سپاہی' کا اجرا

نقش برآب

نئی دہلی: خاکہ نگاری ایک ایسی صنف ادب ہے جس سے کئی اصناف کی سرحدیں ملتی ہیں۔ ان سے بہ سلامت گزر جانا اصلی خاکہ نگاری کی پہچان ہے۔ سہیل انجم نے خاکہ نگاری کے اصولوں کو نہ صرف برتا ہے بلکہ حقیقت کی آمیزش کر کے خاکہ نگاری کو ایک نئی جہت دی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ان کی کتاب 'نقش برآب' کے اجرا کے موقعے پر مقررین نے کیا۔ غالب اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ اس پروگرام میں این سی پی یو ایل کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ پانی پر نقشہ بنانا ناممکن ہے، لیکن سہیل انجم نے مذکورہ کتاب کے توسط سے ایک بڑا کام کیا ہے جو پانی پر نقش بنانے سے کم نہیں۔ خاکہ نگاری میں حقیقت کو حاوی نہیں ہونا چاہیے، لیکن انھوں نے حقیقت کے ساتھ خاکے لکھ کر خاکہ نگاری کو ایک نیا رنگ دیا ہے۔ انجم عثمانی نے کہا کہ سہیل انجم کی یہ کتاب ان کی اب تک کی کتابوں سے بالکل الگ ہے اور ان کی شناخت ایک ادیب اور خاکہ نگار کی بنتی ہے۔ فاروق ارگلی نے بھی تمام خاکوں کی ستائش کی اور کہا کہ سہیل انجم نے یوں تو صحافت پر متعدد کتابیں لکھی ہیں لیکن اس کتاب سے انھوں نے اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ خاکہ نگار کی حیثیت سے ان کی شناخت قائم ہوگئی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ریسرچ اسکالر شاہنواز فیاض نے اپنے مقالے میں 'نقش برآب' کا تجزیہ کیا اور کہا کہ اس کتاب کے خاکوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو خاکہ نگاری پر کافی عبور حاصل ہے۔ پروگرام کا آغاز غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد کے ابتدائی کلمات سے ہوا۔ نظامت ثاقب عمران نے کی۔ جبکہ متین امروہوی اور احمد علی برقی نے منظوم تاثرات پیش کیے۔

روزنامہ انقلاب دہلی، 21 دسمبر 2015

مسلم سائنس دانوں کی سائنسی خدمات

شولاپور: 'مسلم سائنسدانوں کی سائنسی خدمات' اہم موضوع پر لکھی گئی کتاب ہے۔ یہ کتاب فراموش کردہ ہمارے ماضی کو یاد دلاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ روشن مستقبل کے لیے تحریک دیتی ہے۔ "میں شیخ جنید عبدالقیوم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ مستقبل میں وہ اسی طرح اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔" ان خیالات کا اظہار شولاپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر این این مالدار نے 12 دسمبر بروز سنیچر ساج کلیان ہال شولاپور میں منعقدہ سائنسی و تحقیقی کتاب 'مسلم سائنسدانوں کی سائنسی خدمات' کی رسم رونمائی کرتے ہوئے کہا۔ جلسے کی صدارت و شیخ جنید توصیفی کمیٹی کے صدر پرنسپل شیخ عبدالجبار نے کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی سائنٹسٹ ڈاکٹر عظیمی باگی نے کہا کہ مصنف نے اس کتاب میں جانفشانی سے مسلم سائنسدانوں کی سائنسی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ بطور مہمان خصوصی آرکیڈ انجینئرنگ کالج کے پرنسپل جمیل منصور نے کہا کہ شیخ جنید مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے طلبا میں عملی طور پر سائنسی رجحان کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ سید ظہیر الدین نے کہا کہ مصنف کا مقصد یہی ہے کہ ہمارے طلبہ بھی آگے چل کر ایسے ہی عظیم سائنس داں بنیں اور قوم و ملت کا نام روشن کریں۔ شیخ جنید عبدالقیوم نے کہا کہ یہ کتاب مسلم نوجوانوں کے لیے لکھی گئی ہے جو علم و تحقیق اور سائنس کے میدان میں کچھ کرنے کا عزم و حوصلہ رکھتے ہیں۔

پریس ریلیز: سلطان اختر، شولاپور، 13 دسمبر 2015

قلم کا سپاہی

لکھنؤ: "حفیظ نعمانی نے اپنے قلم سے اردو کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ تحریک سے کیا۔ تحریک وہ اخبار ہے جس کی زندگی اگرچہ بہت مختصر رہی مگر کم عرصے میں بھی اس نے اپنا ایک حلقہ بنالیا۔ معروف صحافی حیات اللہ انصاری نے اپنے اسٹاف کے سامنے اس بات کا اعتراف کیا کہ روزنامہ تحریک نے قومی آواز کی تعداد اشاعت پر اثر ڈالا ہے۔" ان خیالات کا اظہار معروف نقاد و ادیب شارب ردولوی نے کیا۔ وہ یہ فخر پرساد ہال، قیصر باغ میں بزرگ صحافی حفیظ نعمانی کی شخصیت پر مذاکرہ و نوجوان قلم کار محمد اویس سنبھلی کی مرتب کردہ 'قلم کا سپاہی' کی تقریب رسم اجرا سے خطاب کر رہے تھے۔ 'قلم کا سپاہی' سینئر صحافی حفیظ نعمانی کے مضامین اور ان کے بارے میں ان کے احباب و ہم عصر ادبا کے تاثرات پر مبنی کتاب ہے۔ اپنے افتتاحی کلمات میں شارب ردولوی نے کہا کہ یہ ابتدا تھی۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کبھی بھی حالات سے سمجھوتا نہیں کیا، جو سچ ہے وہ لکھا اور لکھ رہے ہیں، انھوں نے جذباتی صحافت کو سنجیدگی کا جامہ پہنایا۔ پروفیسر شارب ردولوی سے قبل نوجوان ادیب اویس سنبھلی نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ صدر تقریب عارف نقوی (جرمنی) نے حفیظ نعمانی کے ساتھ گزرے اپنے پرانے دنوں کو یاد کیا۔ افسانہ نگار صبیحہ انور نے اظہار تاثرات کرتے ہوئے کہا کہ حفیظ بھائی کی تحریریں انھیں خوشی بھی دیتی ہیں اور کبھی کبھی روزمرہ ہونے والے واقعات کے تناظر میں ان کی بے باکی دل میں خوف و اندیشہ بھی پیدا کرتی ہے۔ اتنی بے باکی و بے خوفی سے لکھنا اپنے آپ میں بہت بڑی بات ہے۔ دہلی سے آئے معروف صحافی و تقریب کے مہمان ذی وقار سہیل انجم نے کہا کہ حفیظ نعمانی وہ صحافی ہیں جنھوں نے تاریکیوں سے کبھی ہار نہیں مانی۔ تحریک، روداد قفس، بجھے دیوں کی قطار سے لے کر قلم کا سپاہی تک ان کی ہر تحریر اس بات کی گواہ ہے۔

روزنامہ جدید خبر دہلی، 28 دسمبر 2016

ڈبل رول

ناگپور: شہر ناگپور کی ایک فعال ادبی تنظیم ودربھ گورو پرتشٹھان کی جانب سے ایک سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا جس میں نامور نقاد اور جدید شاعر ڈاکٹر سید صفدر نے صدارت کے فرائض انجام دیے اور مشہور محقق ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اسی تقریب میں معروف انشائیہ نگار محمد اسداللہ کی تصنیف 'ڈبل رول' کا اجرا ڈاکٹر گریش گاندھی کے ہاتھوں ہوا۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ "ہمارے ملک میں ادیبوں اور شاعروں نے ہمیشہ سماج کے اتحاد کے لیے کوششیں کی ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں ان کی ذمے داری بڑھ گئی ہے۔ مختلف زبانوں کے فنکاروں کا آپس میں رابطہ ضروری ہے اور انھیں ملک کی سالمیت اور سماجی ہم آہنگی کے لیے اپنا قلم استعمال کرنا چاہیے۔"

کتاب، ڈبل رول پر تبصرہ کرتے ہوئے صحافی نثار احمد انصاری نے کہا کہ "ڈاکٹر محمد اسداللہ نے اس سال 'انشائیہ کی روایت، مشرق اور مغرب کے تناظر میں' شائع کر کے اس صنف کی تاریخ بیان کی اور اس کے ارتقا کا تنقیدی جائزہ لیا اور اب 'ڈبل رول' میں اپنے طبع زاد انشائیے اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین ایک ساتھ جمع کر کے دونوں اصناف کے درمیان پائے جانے والے فرق کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مالی اعانت سے منظر عام پر آئی ہے۔"

روزنامہ اردو [illegible]، دسمبر 2015

'اردو میڈیا کل آج کل'

حیدرآباد: تلنگانہ کے نائب وزیر اعلیٰ محمد محمود علی نے اردو زبان کی ترقی اور بہتر تدریس کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو حکومت کی جانب سے ممکنہ تعاون کی پیشکش کی ہے۔ انھوں نے اردو زبان کی ترویج کے ساتھ ساتھ تعلیمی نصاب میں اخلاقیات کو شامل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ وہ حیدرآباد میں ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز ایڈیٹر ہفتہ وار گواہ کی تصنیف 'اردو میڈیا کل آج کل' کے دوسرے ایڈیشن کی رسم اجرا انجام دے رہے تھے۔ اس موقعے پر مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد اسلم پرویز نے اردو کی ترقی میں شہر حیدرآباد کے عظیم کردار کا اعتراف کیا۔ انھوں نے کہا کہ حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی نے مادری زبان میں سائنس اور ٹکنالوجی کا جو تجربہ کیا تھا وہ ایک مشعل راہ ہے۔ اردو میڈیم سے انجینئرس اور ڈاکٹرس اس یونیورسٹی نے پیدا کیے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اردو طلبہ بالخصوص مدارس کے طلبہ کو سائنس و ٹکنالوجی کے شعبوں سے جوڑنے کے اختراعی برج کورس شروع کرنے کی تجویز رکھتے ہیں۔ انھوں نے کتاب کے مصنف سید فاضل حسین پرویز کی کوششوں کی ستائش کی۔ پروفیسر فاطمہ بیگم پروین نے صدارت کی اور کتاب کے مصنف جو ان کے شاگرد ہیں، کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ کنوینر ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب میں محبان اردو، معززین شہر کی کثیر تعداد شریک تھی۔

روزنامہ جدید خبر، دہلی، دسمبر 2015

یہ کائنات

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے شائع ہونے والی کتاب 'یہ کائنات' کا رسم اجرا دانشوران اور علمائے کرام کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ جس کو بچوں کے شاعر و ادیب جناب انصار احمد معروفی نے لکھا ہے، جس کا موضوع سائنس اور اس کے انکشافات ہیں۔

مشہور قلم کار اور ماہر تعلیم ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب، ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی ڈائرکٹر اسکالرز پبلک اسکول، مئو اور مولانا محمد ارشاد اعظمی صاحب شیخ الحدیث جامعہ مظہر العلوم بنارس کے ہاتھوں 'یہ کائنات' کا اجرا ہوا، جو بچوں کے لیے سائنسی موضوع پر نظموں کا مجموعہ ہے، جس میں سورج، چاند، زمین، پہاڑ، دریا، شبنم، کہرا اور دریا وغیرہ جیسے عنوانات پر مشتمل بچوں کے آسان زبان میں لکھی گئی نظمیں ہیں۔ ڈاکٹر شکیل اعظمی صاحب نے کہا کہ ہمیں بچوں کے لیے لکھی جانے والی تحریروں کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دور افتادہ علاقے کے بہت سے قلم کار حضرات نے ماضی اور حال میں اہم اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب نے کہا کہ اس شعری مجموعہ کی زبان بہت آسان اور اس میں سلاست کے ساتھ بے حد معلوماتی مضامین سموئے گئے ہیں۔ مولانا ارشد صاحب نے اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ ادب اطفال کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ شعری مجموعہ اس اعتبار سے بھی بہت بامعنی ہو جاتا ہے کہ اس کا موضوع سائنس ہے۔ قرآن کریم میں سائنس کا جا بجا ذکر ہے۔ اس تقریب میں اساس ارشاد کی نئی کتاب 'گلدستۂ مضامین' کا بھی اجرا عمل میں آیا۔ اس پروگرام کی نظامت مولانا نوشاد معروفی نے کی، اور رسالہ سہ ماہی 'اشارق' اعظم گڈھ کے نائب مدیر نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ پروگرام میں مولانا ارشاد شکیل، خلیل الرحمٰن، مطیع اللہ مسعود قاسمی، عبدالسمیع قاسمی اور دیگر حضرات شریک تھے۔

پریس ریلیز: انصار احمد معروفی، مدرسہ [illegible] فیض، [illegible]، ضلع مئو، یوپی، 16 دسمبر 2015

وفیات:

معروف صحافی سید عبدالرافع

پٹنہ: اردو کے معروف صحافی سید عبدالرافع کا 21 دسمبر 2015 کی صبح پٹنہ میں انتقال ہو گیا۔ وہ 75 برس کے تھے اور تقریباً ایک سال سے علیل تھے۔ ان کی نماز جنازہ سلطان گنج گھیرا مسجد کے قریب بعد نماز عشا ادا کی گئی اور شاہ گنج قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ جس میں اہل خاندان کے علاوہ صحافت، علم و ادب اور دیگر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والی شہر کی ممتاز ہستیوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

5 دہائیوں سے زیادہ عرصے تک اردو صحافت کی بے پناہ خدمت کرنے والے سید عبدالرافع نے اپنے صحافتی سفر کا باقاعدہ آغاز روزنامہ آزاد ہند کولکاتا سے کیا اور روزنامہ قومی آواز پٹنہ، قومی تنظیم، صدائے عام، انقلاب جدید اور نقیب جیسے اخبار و رسائل کو طویل عرصے تک اپنے خون جگر سے سینچا۔ روزنامہ 'قومی آواز' کے ایڈیٹر انچارج اور امارت شرعیہ کے ترجمان 'نقیب' کے تاحیات ایڈیٹر بھی رہے۔ سید عبدالرافع کے انتقال پر اظہار تعزیت کرنے والوں میں امیر شریعت مولانا سید ولی رحمانی، ناظم امارت شرعیہ مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، مولانا سہراب ندوی، مولانا رضوان احمد ندوی، صحافی ریاض عظیم آبادی، ریحان غنی، مسعود الرب، مسعود الرحمٰن، سید احمد قادری، خورشید ہاشمی، اشرف استھانوی، انوار الہدیٰ، فاروق اعظمی، ثناء اللہ، توقیر عالم، شکیل استھانوی اور شفیق الرحمٰن شامل ہیں۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 22 دسمبر 2015

معروف شاعر انجم عرفانی

لکھنؤ: اردو کے معروف شاعر بزم عرفان و آگہی کے بانی انجم عرفانی کا حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا وہ 78 برس کے تھے۔ انجم عرفانی نے 10 دسمبر 1937 کو محلہ بسیر ساگر گورکھپور میں حافظ علاء الدین احمد خاں کے مکان پر نور جہاں بیگم کی گود میں آنکھیں کھولیں۔

چھ بیٹوں اور چھ بیٹیوں میں سب سے بڑے انجم عرفانی تھے۔ میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹر میڈیٹ کالج گورکھپور میں داخلہ لیا، جہاں سے 1953 میں انٹر کرنے کے بعد مہارانا پرتاپ ڈگری کالج گورکھپور سے 1957 میں گریجویشن کیا۔ فوراً مارکیٹنگ انسپکٹر کی ملازمت مل گئی۔ بلیا ٹرانسفر ہونے کی وجہ سے ملازمت چھوڑ کر این ای ریلوے گورکھپور کے اکاؤنٹس آفس میں ملازمت اختیار کر لی۔ بعد میں وہ بلرام پور ڈگری کالج میں اردو کے لیکچرر ہوئے۔ دوران ملازمت محکمے سے اجازت لے کر گورکھپور یونیورسٹی میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا جہاں سے 1967 میں فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن میں ایم اے پاس کیا۔

اس کے بعد پروفیسر محمود الٰہی کی زیر نگرانی پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرالیا۔ لیکن شاعری کے جنون نے انجم عرفانی کو ڈاکٹر انجم عرفانی نہیں بننے دیا۔ بچپن سے ہی کتابیں پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا جو تادم آخر قائم رہا۔ اسلامی تاریخ اور فلسفہ پر ان کی گہری نظر تھی۔ شاعری کی ابتدا طالب علمی کے زمانے سے ہوگئی تھی۔ ان کی شعری تخلیقات ملک کے معتبر جرائد و رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ چند افسانے بھی لکھے جو اردو اور ہندی کے رسائل میں شائع ہوئے۔ 1984 میں پہلا شعری مجموعہ 'لباس زخم' شائع ہوا۔ 1990 میں دوسرا شعری مجموعہ 'زبان زخم' شائع ہوا۔ 2008 میں تیسرا شعری مجموعہ 'جوئے ساعت' شائع ہوا اور اب چوتھا شعری مجموعہ 'سر مژگان سحر' زیر طبع ہے۔ انجم عرفانی مہارانی لال کنور ڈگری کالج، بلرام پور میں لکچرر کے عہدے سے جنوری 2010 میں سبکدوش ہوئے۔ انجم عرفانی کی نماز جنازہ ان کی رہائش گاہ فرینڈس کالونی جاگی پورم میں واقع مسجد کے باہر بعد نماز عصر ادا کی گئی اور قریبی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ اس موقعے پر اعزا و اقربا کے علاوہ شعرا و ادبا میں انور جلال پوری، قمر گونڈوی، حیدر علوی، احسن اعظمی، پرویز ملک زادہ، تشنہ اعظمی، ڈاکٹر محمود کاکوروی، منظر الحق، منظر لکھنوی، رضوان فاروقی، بیخبے مصرا شوق، عارف فاروقی، ڈاکٹر فخر عالم اعظمی، ساحل عارفی، واصف فاروقی، وددو انصار وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ اودھ نامہ علی گڑھ، 11 دسمبر 2015

معروف صحافی ظفر زاہدی

اعظم گڑھ: کہنہ مشق صحافی و عالمی شہرت یافتہ مفسر قرآن عالم دین علامہ حمید الدین فراہی کے پوتے سعد اللہ فراہی المعروف ظفر زاہدی نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ قائد لکھنؤ سے کیا تھا۔

صحافت میں ان کی رہنمائی نامور صحافی محفوظ الرحمٰن نے کی اور اس سے قبل وہ ہندوستان کے تمام معیاری اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ظفر زاہدی کی ابتدائی تعلیم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں ہوئی اور کچھ دنوں تک وہ ندوۃ العلما لکھنؤ میں بھی رہے۔ دہلی میں مختلف اخبارات میں صحافتی خدمات انجام دینے کے بعد وہ قومی آواز و انقلاب سے منسلک ہوئے۔ 2006 میں ظفر زاہدی روزنامہ راشٹریہ سہارا سے منسلک ہوئے۔ 10 سال تک روزنامہ راشٹریہ سہارا میں صحافتی خدمات انجام دی۔ چند ماہ قبل تک وہ کانپور ایڈیشن کے انچارج تھے اور وہیں سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی خدمات کے تحت انھیں ملک کی اہم ادبی تنظیموں، انجمنوں کی جانب سے ممبئی، دہلی، لکھنؤ، کانپور، متو اور اعظم گڑھ سمیت گورکھپور میں صحافتی ایوارڈ ملے ہیں۔ مرحوم کو اعظم گڑھ سے خاص دلچسپی تھی۔ مرحوم کے پسماندگان میں 3 بیٹے اور 3 بیٹیاں و اہلیہ ہیں۔ ان کی تدفین بروز منگل موضع فریہا میں کی گئی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 5 جنوری 2016

صحافی حبیب الرحمٰن خان

نئی دہلی: بھوپال کے معروف صحافی حبیب الرحمٰن خان کا بھوپال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 78 برس تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ اور 3 بیٹے ہیں۔ ان میں سے ایک دہلی میں ہندوستان ٹائمز میں اسپورٹس صحافی ہیں۔ مرحوم حبیب الرحمٰن کے برادر نسبتی اطہر مسلم نے بتایا کہ حبیب الرحمٰن جماعت اسلامی کے اہم رہنماؤں میں سے ایک اور حلقہ مدھیہ پردیش کے سابق امیر مولانا انعام الرحمٰن خان کے صاحب زادے تھے۔ وہ گذشتہ کچھ عرصے سے علیل تھے۔ ان کی تدفین بھوپال میں کی گئی۔ انھوں نے بتایا کہ حبیب الرحمٰن نے دہلی میں دعوت اخبار کے علاوہ بھوپال کے کئی اخبارات میں کام کیا۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 11 دسمبر 2015

خراج عقیدت:

معروف گیت کار بھارت بھوشن کو خراج عقیدت

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ اور یونائٹیڈ پروگریسیو تھیٹر ایسوسی ایشن (UPTA) کے مشترکہ اہتمام میں معروف گیت کار آنجہانی بھارت بھوشن کی برسی کے موقعے پر شعبے کے پریم چند سیمینار ہال میں ایک شاندار پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت کے فرائض صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر بھارت بھوشن کے داماد وی کے سکسینہ نے شرکت کی اور مہمان ذی وقار کے طور پر معروف ادیب پروفیسر وید پرکاش بٹوک شریک ہوئے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی نے انجام دیے۔ استقبال ڈاکٹر شاداب علیم اور شکریے کی رسم یونائٹیڈ پروگریسیو تھیٹر ایسوسی ایشن کے صدر بھارت بھوشن شرما

نے ادا کیا۔ بعدازاں مہمانوں کا پھولوں کے ذریعے استقبال کیا گیا۔ پروگرام تین حصوں پر منقسم تھا۔ پہلے حصے میں عظیم گیت کار بھارت بھوشن پر بنی ڈاکیومنٹری فلم دکھائی گئی۔ دوسرے حصے میں بھارت بھوشن کی زندگی اور کارناموں اور گیتوں کے تعلق سے مقررین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کا تیسرا اور آخری حصہ گیتوں، غزلوں پر مبنی تھا۔

روزنامہ اودھ نامہ علی گڑھ، 19 دسمبر 2015

صفدر ہاشمی کو خراج عقیدت

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پریم چند سیمینار ہال میں یونائٹیڈ پروگریسیو تھیٹر ایسوسی ایشن نے سال نو کے موقعے پر ایک شاندار پروگرام کا انعقاد کیا جس میں مشہور ناٹک کار صفدر ہاشمی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ پروگرام کی نظامت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کی اور مہمان خصوصی کے طور پر معروف ایڈوکیٹ اور انجمن ترقی پسند مصنفین (میرٹھ) کے سکریٹری محترم منیش تیاگی نے شرکت کی۔ جبکہ مہمانان ذی وقار کے بطور پروفیسر سدھیر شرما، محترم کیلاش کپور، (منیجر، الٰہ آباد بینک) محترم انل شرما اور UPTA کے صدر محترم بھارت بھوشن شرما شریک ہوئے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی نے اور شکریے کی رسم سریندر شرما نے ادا کی۔ یونائٹیڈ پروگریسیو تھیٹر ایسوسی ایشن کے صدر بھارت بھوشن شرما نے یونائٹیڈ پروگریسیو تھیٹر ایسوسی ایشن، میرٹھ کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ اپنا نے اپنے سات سالہ کامیاب سفر کے دوران شہر کے متعدد مقامات پر سماجی مسائل پر بنی مختلف ڈرامے پیش کرکے تہذیب و ثقافت اور اخلاقی قدروں کو فروغ دینے کا کارنامہ انجام دیا ہے جسے شہر کے غیور عوام نے خوب سراہا ہے۔ اب ہمیں اور محنت کرکے اور دیگر تنظیموں کو بھی اس میں شامل کرکے بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی شناخت قائم کرنی ہوگی۔ اس موقعے پر ایڈوکیٹ منیش تیاگی نے صفدر ہاشمی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد سماج میں پھیلی برائیوں کو دور کرنے کے لیے وقف کردیا تھا۔

روزنامہ سیاسی تقدیر دہلی، 4 جنوری 2016

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ **بچوں کی دنیا** دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

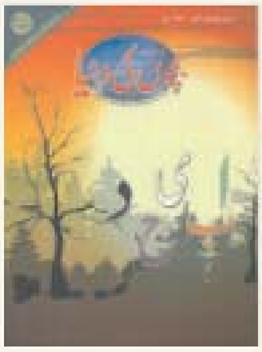

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ♦ کامکس کہانی ♦ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

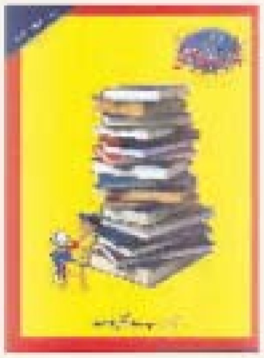

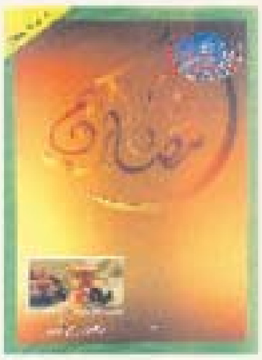

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/01/2016
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, February-2016, Vol.18, Issue:02
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025